14

شفیق الرّحمٰن

میری لائبریری

# مزید حماقتیں

میری لائبریری میں

قیمت 3.75

پہلی قیمت چھ روپے

☆ ''شفیق الرحمان صاحب کو کون نہیں جانتا۔ شاید وہ نہ جانتے ہوں جو مسکرانا نہیں جانتے۔'' —اردو ڈائی جسٹ

☆ ''شفیق الرحمان موجودہ دور میں شگفتہ اور صحت مند ادب کا بانی ہے'' — ادب لطیف

☆ ''شفیق الرحمان اپنے کرداروں کی نفسیات میں اُلجھنے اور اُن کے ذہنی تجزیے میں سر کھپانے کی بجائے اُن کے عمومی طرزِ عمل کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی کہانیوں میں بے ساختگی اور برجستگی ہوتی ہے۔ انہوں نے درمیانے طبقے کی زندگی کو موضوعِ سخن بنایا ہے اور بڑے لطیف مرقعے پیش کئے ہیں۔ — روزنامہ امروز

☆ سارے نئے ادب میں بس لے دے کے ایک شفیق الرحمان صاحب ہیں جنہوں نے تفریحی ادب کی طرف توجہ کی ہے۔ یہ شگفتگی، یہ لاابالی پن، یہ مچلتی ہوئی جگمگاہٹ بس انہی کا حصہ ہے۔'' — محمد حسن عسکری

☆ ''شفیق الرحمان کے افسانے پڑھ کر شوخ رنگوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے — سرخا سرخ، نارنجی، یاقوتی، زعفرانی''
— کرشن چندر

☆ مزید حماقتیں، شفیق الرحمان کے شوخ و شنگ قلم سے نکلے ہوئے ہنستے مسکراتے بلکہ قہقہے لگاتے ہوئے افسانوں اور خاکوں کا مجموعہ ہے۔

# مزید حماقتیں



اردو میں سستی اور معیاری کتابوں کا پہلا مقبول اور کامیاب ترین سلسلہ

میری لائبریری

(۱۴)

## میری لائبریری کے سلسلۂ طنز و مزاح کی دوسری کتابیں

| | |
|---|---|
| شفیق الرحمٰن | لہریں |
| | پرواز |
| | حماقتیں |
| کنہیا لال کپور | گرد کارواں |
| | نرم گرم |
| | شیشہ و تیشہ |
| | چنگ و رباب |
| | سنگ و خشت |
| اشفاق احمد | گرما گرم |
| شوکت محمود | ڈھول کا پول |
| ڈاکٹر وحید قریشی | اردو کا بہترین انشائی ادب |
| | اردو کا بہترین مزاحیہ ادب |
| | اردو میں بہترین سوانحی ادب |
| اے۔ ڈی اظہر | لذت آوارگی |
| مشتاق احمد یوسفی | چراغ تلے |

# مزید حماقتیں

شفیق الرحمٰن

میری لائبریری، ناشران و تاجران لاہور

میری لائبریری میں پہلی مرتبہ ۱۹۶۰ء

دوسری بار، اکتوبر ۱۹۶۲ء

پبلشر :۔ بشیر احمد چودھری

پرنٹر :۔ پاکستان ٹائمز پریس لاہور

۲۰ مئی ۱۹۶۴

مکرمی چوھدری صاحب

السلام علیکم ۔۔۔ گرامی نامہ مورخہ ۲۰ مئی ۱۹۶۴ء
وصول ہوا۔

آپ نے "میری لائبریری" کے قیام و استحکام سے اُردو
کی قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اچھی کتابیں ارزاں
قیمت پر مہیا کر کے یہ خدمت بدستور بجا لاتے رہیں گے۔

فقط والسّلام
حمید احمد خاں
وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی

جناب بشیر احمد چوھدری صاحب
ڈائرکٹر "میری لائبریری"
چوک مینار۔ انارکلی لاہور

# فہرس

# دیباچہ

یہ دستور ہے کہ کتاب خواہ کہیں بھی لکھی گئی ہو مصنف اگر ایک مرتبہ بھی ولایت گیا ہے تو دیباچہ ضرور لندن کا لکھا ہوا ہوگا۔ ان دنوں میں لندن میں ہوں اس لئے مجبور ہوں کہ اس روایت کو قائم رکھوں ۔

ویسے میں کوئی خاص بات نہیں کہنا چاہتا سو لئے اس کے کہ یہ دیباچہ ہے جسے میں نے لندن میں لکھا ہے ۔

اگست ۵۳ء

شفیق الرحمٰن

۱۶۔ ہال روڈ، سینٹ جانز ووڈ

لندن، این، ڈبلیو ۸

# تزکِ نادری عرف سیاحت نامۂ ہند

رقمزدہ :- اعلیٰ حضرت جناب نادر شاہ سابق شہنشاہ، سابق ابنِ شمشیر ابنِ شمشیر، سابق مرحوم و مغفور وغیرہ وغیرہ

## پیش لفظ ـ عرف کرنا مرتّب اس تزک کا ہمارا

آج جو اتفاق سے پرانی پوستین کو جھاڑا تو متعدد اشیاء کے ساتھ ہمارے خود نوشتہ اوراق کرم خوردہ بھی زمین پر گر پڑے، جنھیں ہم نے وقتاً فوقتاً لکھا تھا۔ پڑھا تو حیران رہ گئے۔ سوچا کہ سیاحتِ ہند کے بعد معترضین نے ہم پر جو طرح طرح کی افترا پردازی کی ہے کیوں نہ اس کے جواب میں یہ اوراق پیش کئے جائیں۔ اگرچہ ہم مقامی مؤرخین کی لگام بندی فرما چکے تھے تاہم غیر ملکی پریس نے واویلا مچا کر جو غلط فہمی پیدا کر دی ہے اس کا ازالہ بہت ضروری ہے تصویر کا یہ رُخ دکھا کر کیوں نہ معترضین کو ہمیشہ کے لئے خاموش کرا دیں ہم ہمیشہ سے

لوگوں کو گلہ بھی رہا ہے کہ تاریخ غلط پیش کی گئی ہے، تبھی تاریخ کی غیر جانب دار اور مستند کتابوں کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔

خدا گواہ ہے کہ ہم ہندوستان محض حملے کی غرض سے ہرگز نہیں گئے، دراصل ہمیں اپنی دور افتادہ پھوپھی محترمہ سے ملاقات مقصود تھی، حملے کا خیال ہمیں راستے میں آیا۔ تختِ طاؤس اور کوہِ نور ہیرا ہم نے زبردستی ہرگز نہیں ہتھیایا۔ عزیزی محمد شاہ عرف رنگیلے میاں نے بصد منت و سماجت ہمارے سامان میں یہ چیزیں بندھوا دیں۔ اور قتلِ عام؟ قتلِ عام کسی مسخرے نے کرایا تھا۔ وہ تو ایک معمولی سا لاٹھی چارج تھا، یہ اور بات تھی کہ اہلِ ہند نحیف و نزار ہونے کی وجہ سے اس کی تاب نہ لا سکے۔ سنا ہے ہمارے متعلق لوگوں نے طرح طرح کی کہاوتیں گھڑ لی ہیں۔ مثلاً شامتِ اعمالِ ما با صورتِ نادر گرفت۔ ہمارے دل کو خصوصاً اس مثل سے سخت صدمہ پہنچا ہے، یعنی اگر اس نادر سے مراد ہم ہیں تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ یہ نادر کوئی اور شخص تھا، اگر ہمیں علم ہوتا کہ ہماری سیاحت کے بعد اس قدر غل غپاڑہ مچے گا تو واللہ کبھی ہند کا رُخ نہ کرتے، اور اگر دِلّی میں پتہ چل جاتا تو وہاں سے کبھی نہ لوٹتے۔

## والئی کابل سے ناچاقی

مدت سے ارادہ تھا کہ والئی کابل کی گوشمالی کریں، وہ لگاتار بلا کسی وجہ ہمارے خلاف زہر اُگل رہا تھا۔ جب ہم نے خط لکھ کر اس خواہ مخواہ پراپیگنڈے کی وجہ پوچھی تو اور

بھی زیادہ زہرا گلنے لگا۔ چنانچہ موسم کو مناسب پاکر حملہ آور ہوئے۔ غالباً ان لوگوں کو ہماری قوت کا غلط اندازہ تھا، ہم نے دریائے ہلمند کو جگہ جگہ سے کاٹ کر ان کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے۔

دریائے ہلمند نہایت خوشنما دریا ہے۔ فرمانبردار خاں معروض ہُوا کہ شاہانِ سلف کا رواج رہا ہے کہ حملہ کرتے وقت جو دریا راستے میں آئے تیر کر عبور کرتے ہیں۔ اس کے کہنے پر غلطی سے ہم نے بھی چھلانگ لگا دی اور شاہانِ سلف میں شامل ہوتے ہوتے بال بال بچے۔ کنارے کی طرف آنے کی کوشش کی ہم پوستین کو چھوڑتے تھے لیکن پوستین ہمیں نہ چھوڑتی تھی۔ بمشکل ہمیں باہر نکالا گیا بڑے پشیمان ہوئے، تہیّہ کیا کہ جب تک تیراکی کے ماہر نہ ہو جائیں پانی میں قدم نہ رکھیں گے۔

## شہباز خاں کو خطاب کا عطیہ

مقامی باغ میں چند اُلّو دکھائی دیئے یہاں کا اُلّو ایرانی اُلّو سے بڑا اور بہتر ہوتا ہے، اُلّوؤں کا ایک جوڑا ہمارے ساتھ ہو لیا، شام کو ہماری قیام گاہ کے پاس بسیرا لیتا اور رات بھر ہاؤ ہُو مچاتا۔ ہم نے فرمانبردار خاں سے پوچھا کہ یہ جوڑا کیا چاہتا ہے، وہ بولا گستاخی کرتا ہے اور ہمیں واپس جانے کو کہتا ہے ہم بے حد خفا ہوئے اور فرمانبردار خاں کو پاپوش مبارک سے زدو کوب کر کے سرفراز فرمایا۔ ساتھ ہی شہباز خاں کی رائے دریافت کی، وہ جاں نثار معروض ہُوا

کہ فالِ نیک ہے۔ اُلّو جیسا منحوس پرندہ بھی ہم سے بلند طالع شہنشاہ کی آمد پر خوش آمدید کہتا ہے، ہم اس جواب پر خوش ہوئے اور نمک حلالی کی قدر کرتے ہوئے اس کو اُلّو شناس کے لقب سے نوازا، اور اس کے ہم جنسوں میں اس کی عزت افزائی فرمائی۔

## سیاحتِ ہند کا ارادہ

کابلی افواج کے ساتھ ہماری جنگ خاصی رہی یہ ان تمام خصوصیات کی حامل تھی جس نے نادر شاہی جنگوں کو اس قلیل عرصے میں اس قدر حیرت انگیز شہرت بخشی۔ اب ماشاءاللہ نادر شاہی حکم، نادری قہر، نادر موقعے اور نادری حکومت بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ والئ کابل اپنے کیے پر نادم تھا۔ اس نے وفاداری کا حلف اتنی مرتبہ اٹھایا کہ ہم نے تنگ آکر منع کر دیا۔

شہباز خاں اُلّو شناس ہر روز ملکِ ہندوستان کی خبریں سناتا کہ کابل سے میوہ جات کثیر مقدار میں ہند بھیجے جاتے ہیں اور اس کے بدلے تجار ہینگ، بھنگ، چرس و دیگر تفریحات لاتے ہیں۔ ہم نے اس ذکر میں دلچسپی لی تو اُلّو شناس بھی چست ہوگیا، اس نے ہمیں پھوپھی محترمہ کی یاد دلا دی، جو غالباً ہند میں مقیم تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ ہم نے اپنی پھوپھی کا محض ذکر ہی سنا تھا، نہ کبھی انھیں دیکھا تھا نہ شرفِ ملاقات بخشا تھا، گستاخ فرمانبردار خاں کا خیال تھا کہ ہماری کوئی پھوپھی تھیں ہی نہیں۔ خیر، چونکہ کابل کی مہم اندازے کے خلاف بہت جلد ختم ہوگئی۔ سوچا یہ بیکار وقت کیوں نہ سیاحتِ ہند میں صرف کیا جائے۔

ہمیں بتایا گیا کہ حملہ آوروں کی سہولت کے لئے اہلِ ہند نے دو راستے صاف کروا رکھے ہیں :-

براہِ افغانستان : خیبر ایجنسی ۔ پشاور ۔۔ لاہور ۔ پانی پت

براہِ بلوچستان : سمہ سٹہ ۔۔ بھٹنڈہ ۔ دِلّی

ہم نے پہلا راستہ پسند فرمایا کیونکہ بلوچستان کے راستے میں جیکب آباد پڑتا ہے جو دُنیا کے گرم ترین مقاموں میں سے ہے ۔

## کابل سے کوُچ

چار گھڑی گزرنے پر کابل سے کوچ کیا۔ عمائدین شہر فصیل تک بلکہ درۂ خیبر تک چھوڑنے آئے۔ جانے نہ دیتے تھے ۔ والیٔ کابل مفارقت کا سوچ کر رونا تھا اور ہمارے ہمراہ سیاحتِ ہند میں شریک ہونے کی اجازت طلب کرتا تھا لیکن ہم جانتے تھے کہ یہ رونا پیٹنا دکھاوے کا ہے یہ لوگ بڑے کائیاں ہیں۔ ہمارے رخصت ہوتے ہی پراپیگنڈہ دوبارہ شروع کر دیں گے ۔ اور پھر ہم اہلِ ہند پر مہمان نوازی کا زیادہ بوجھ ڈالنا قرینِ مصلحت نہ سمجھتے تھے۔ چُنانچہ اسے سمجھایا کہ جب ہم سیاحتِ ہند سے واپس لوٹ آئیں تب اس کا جانا زیادہ موزوں ہوگا وہ پھر بھی روتا تھا۔ اسے ازراہِ غریب پروری ایک ریشمی رومال آنسو پونچھنے کے لئے مرحمت فرمایا اور بڑی مشکل سے پیچھا چھڑایا۔

اِس منزل سے کوچ کر کے درۂ خیبر میں پہنچے۔ نہایت پُرفضا مقام ہے

سکندر یونانی، محمود غزنوی اور دوسرے نامی سیاح بھی اسی راستے سے گذرے تھے۔ ہم نے بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے میں بہتری سمجھی۔ اس درّے میں پرند چرند درند، انسان، بلکہ نباتات و جمادات تک نظر نہیں آتی۔ خداوندِ باری تعالےٰ کی کیا قدرت بیان کی جائے۔

مغل فوجدار نے پشاور سے کچھ دور سے آکر سعادت آستاں بوسی حاصل کی اور مشورہ دیا کہ ہمارا واپس چلا جانا بہتر ہو گا کیونکہ اس موسم میں سیاحت لطف نہیں دیتی، اس نے دو سو مُہر طلائی نذر اور ایک مرصّع گھوڑا البطورِ پیش کش گذرانا۔ ہم نے بھی از راہِ مروّت ایک دُنبہ عنایت کر کے ٹالا۔ پشاور سے آگے شیر ملا۔ پہلی دفعہ دیکھا تھا طبیعت بڑی خوش ہُوئی۔ بندگانِ درگاہ تو بھاگ گئے ہم وہیں کھڑے رہے۔ ہم کو کھڑا دیکھتا رہا۔ یہ ایک گُربہ کی مثال ہوتا ہے، نہایت نفاست پسند اور بورژوا قسم کا چوپایہ ہے، کچھ دیر ہمیں دیکھنے کے بعد اس درجہ مرعوب ہُوا کہ بھاگ نکلا۔ اگلے روز ہمیں کسی نے بتایا کہ وہ شیر نہیں تھا کچھ اور چیز تھی۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب

**سفر کا حال** دریائے سندھ عبور کرنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ معلوم ہُوا کہ سیّد بایزید ابنِ یزید یزدانی آستاں بوسی کی سعادت کے متلاشی ہیں، جب بلایا تو دیکھا کہ فقط ایک آدمی تھا۔ ہم نے از راہِ تلطف اسے گلے سے لگا لیا اور پیار سے بھینچا۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اسے فوراً اٹھا کر باہر

ے گئے، لخلخہ سنگھایا گیا، مالش کی گئی۔ دیر کے بعد اسے ہوش آیا تو وہ نذریں جو پیش کرنے لایا تھا لے کر رفوچکر ہوا۔ ہم نے اہلکاروں کو اس کے پیچھے دوڑایا کہ اگر خود نہیں آتا تو نذریں تو بھجوا دے، مگر اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔

قلعے کا فوجدار ہماری سواری کے لئے ایک عجیب و غریب چوپایہ لایا جسے ہاتھی کہتے ہیں۔ نہایت پُرشوکت فیل جسم جانور ہے۔ دو دانت ہوتے ہیں جو صرف دکھانے کے لئے ہیں۔ ناک جس کو سُونڈ کہا جاتا ہے زمین کو چھوتی ہے۔ ہاتھی پر چڑھ کر آدمی دوسروں کے گھروں کے اندر سب کچھ دیکھ سکتا ہے۔ ہم نے سواری کا قصد کیا اور باگ ہاتھ میں لینی چاہی، وہ بولا اس کی لگام نہیں ہوتی ڈرائیور علیحدہ بیٹھتا ہے۔ ہم نے ایسے بے لگام جانور پر سواری سے انکار کر دیا۔

**لطیفہ** سندھ کے علاقے سے وفد آیا کہ وہاں کے عمائدین بے تاب ہیں کہ ہم ان کو سرفراز فرمائیں۔ ساتھ ہی ایک مشہور خانقاہ کی گدی کی پیشکش بھی تھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس ملک میں عجیب دستور ہے۔ کوئی گھاگ چند ہتھکنڈے دکھا کر بھولے بھالے انسانوں کو رام کر لیتا ہے۔ یہ شخص پیر کہلاتا ہے۔ اور معتقدین مرید کہلاتے ہیں۔ مرید اپنی آمدنی کا ایک حصہ پیر کو باقاعدگی کے ساتھ نذر کرتے ہیں، پیر کوئی خاص کام نہیں کرتا سوائے اس کے کہ کبھی کبھی کاغذ کے پرزوں پر کچھ لکھ دیتا ہے جنہیں تعویذ کہتے ہیں۔ ان تعویذوں سے بوڑھوں کے

ہاں اولاد ہو سکتی ہے اور اولاد کے سرپرستوں کا انتقال ہو سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ لطیفہ سن کر ہم بہت ہنسے کہ کسی نے کیا بے پر کی اڑائی ہے۔

لیکن جب الوشناس تین چار پیروں کو ہماری ملاقات کے لئے لایا تو ہمیں محسوس ہوا کہ لطیفہ دوسروں پر نہیں ہم پر ہوا ہے۔ پیروں کی زندگی کی طرح طرح کی دلچسپیاں اور ان گنت مشغلے۔ ہمارے منہ میں پانی بھر آیا۔ اپنی گذشتہ زندگی پر بڑا افسوس ہوا کہ ناحق خراب ہوتے پھرے۔ اگر پہلے سے پتہ ہوتا تو سب دھے ہند آکر پیر بن جاتے اور مزے لوٹتے۔

ایسا سنہری موقعہ ملنے پر ہم نے خداوند تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور وفد کے ہمراہ چلنے کا قصد ظاہر کیا۔ لیکن الوشناس نے رائے دی کہ سندھ کے سیاسی حالات ہمیشہ کچھ ایسے ویسے ہی رہتے ہیں، چنانچہ اس تجویز کو التوا میں رکھا۔ اگر خدانخواستہ شہنشاہی کامیاب نہ رہی تو ضرور بضرور پیر بن جائیں گے، اور دل کی ساری امنگیں پوری کریں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

**اختر شماری** کل رات اختر شماری کی، دو سو پچاسی تارے گنے ہونگے کہ نیند آ گئی، باقی بشرطِ زندگی کل گنیں گے۔

**شتر غمزے** مقامی قلعہ دار کی دعوت پر اس کے ساتھ گئے اور شتر غمزے ملاحظہ فرمائے، محظوظ ہوئے کیونکہ ایران میں یہ چیز تھی۔ اور اس ملک میں عام ہے +

## ایک مفید رسم

جہلم کے قریب ایک قلعدار نے ہم پر دھاوا بول دیا اور پھرتی سے قلعے میں محصور ہو گیا، ارادہ ہؤا کہ اس کو اسی طرح محصور چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں لیکن اُلو شناس ملتمس ہؤا کہ نیا ملک ہے یہاں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیئے۔ ہم نے فرمایا کہ اس طرح قدم رکھے تو دلی پہنچنے میں دیر لگے گی، اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ لوگ عقب سے آ کر تنگ نہ کریں۔ اس روز ہمیں نزلہ سا تھا اور قصد لڑائی بھڑائی کا ہرگز نہ تھا۔ اُلو شناس کے اصرار پر دو دن تک قیام کیا۔ لیکن کچھ نہ ہؤا۔ تنگ آ کر ہم نے پوچھا کہ کوئی ایسی تجویز نہیں ہو سکتی کہ یہ معاملہ یونہی رفع دفع ہو جائے۔ اُلو شناس چلا گیا۔ شام کو لوٹا تو اس کے ساتھ ایک ہندی سپاہی تھا۔ اُلو شناس کے کہنے پر ہم نے سپاہی کو پانچسو طلائی مہریں دیں، ابھی گھنٹہ نہ گذرا ہو گا کہ قلعے کے دروازے کھل گئے۔ ہم بڑے حیران ہوئے۔

ہند میں یہ ایک نہایت مفید رسم ہے۔ جب کٹھن وقت آن پڑے یا مشکل آسان نہ ہو تو متعلّقہ لوگوں کو ایک رقم یا نعم البدل پیش کیا جاتا ہے، تحفے کی مقدار اور پیش کرنے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں لیکن مقصد ایک ہے — اسے یہاں رشوت کہتے ہیں کس قدر زود اثر اور کارآمد نسخہ ہے۔ اگر لاکھوں کے اٹکے ہوئے کام ہزار پانچ سو سے سنور جائیں تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ رشوت دینے والے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس عمل سے کرنسی حرکت میں رہتی ہے، ہم واپس

ایران جا کر اس رسم کو ضرور رائج کرائیں گے۔

ہمیں بتایا گیا کہ کچھ مہریں سپاہی نے اپنے استعمال کے لئے خود رکھ لی تھیں باقی کوتوال کو دیں، جس نے اپنا حصّہ رکھ کر بقیہ رقم قلعدار کے حوالے کی۔ قلعدار نے سنتریوں کو خوش کر کے دروازے کھلوا دیئے۔ واقعی یہ ملک عجوبۂ روزگار ہے!

## گوجرانوالے میں قیام

شیخ بوٹا شجرپوری ایک ایرانی النسل درویش ہیں، جو بڑے فاضل ریاضت کار، مبارک نفس، متوکل اور گوشہ نشین ہیں، گوجرانوالے میں ان سے مل کر معرفت اور وجدان کی باتیں ہوتی رہیں۔ فیصلہ کیا کہ سب کچھ چھوڑ کر تارک الدنیا بنا جائے۔ پھر شبہ ہوا کہ کہیں یہ بھی پیر نہ ہوں۔ تحقیقات کرنے پر شبہ درست نکلا، آپ بڑے رنگیلے پیر ہیں، پنجاب سے وادیٔ کانگڑہ کی طرف ہجرت کر رہے ہیں کیونکہ وہ علاقہ زیادہ رنگین ہے ......... دیر تک ان سے خفیہ باتیں ہوتی رہیں جنھیں سینہ بسینہ رکھنے کا ارادہ ہے۔ یہ ملاقات کیا تھی گویا تجدیدِ عہدِ شباب تھی۔

## ہمارا سنجیدہ ہو جانا

گلستانِ بیکانیر سے ایلچی درِ دولت پر حاضر ہوا، ملتجی ہوا کہ چلئے مشتاقانِ دید راہ دیکھ رہے ہیں۔ تربوزوں کا موسم بھی ہے۔ ارادہ ہوا کہ کچھ دنوں کے لئے چلے چلیں

مگر اُلّو شناس کو حسبِ معمول شبہ ہُوا کہ یہ کوئی چال ہے، بیکانیر لق و دق صحرا ہے۔ جس میں نہ پانی ہے نہ روئیدگی۔ یہ لوگ ہمیں صحرا میں چھوڑ کر بھوک پیاس سے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔

آنکھوں میں خون اتر آیا اور ہر چیز سرخ نظر آنے لگی، فوراً ایلچی کو بلوا کر الٹا لٹکوایا، جب بکا کہ واقعی یہ چال تھی تو کھلوا کر سیدھا کیا۔ اس حادثے نے ہمارا مُوڈ خراب کر دیا۔ سوچا کہ اہلِ ہند سے اچھے سلوک کی توقع کرنا حماقت ہے کیوں نہ کسی بہانے اس ملک پر حملہ کر کے ان کی گوشمالی کریں۔ فرمانبردار خاں کو حکم دیا کہ حملے کی چند وجوہات سوچے، اس نے یہ فہرست پیش کی۔

۱۔ ہم عوام کے مفاد کے لئے جنگی چالوں کی ایک کتاب "رہنمائے حملہ آورانِ ہند" لکھنا چاہتے ہیں۔

۲۔ ہندی گویّے ترانوں کو "نادر نا دھیم" سے شروع کر کے ہماری توہین کرتے ہیں۔

۳۔ تاریخ میں اس سے پہلے ایران نے ہند پر باقاعدہ حملہ نہیں کیا۔

۴۔ ہند پر حملہ ہوئے کافی عرصہ گذر چکا ہے۔

۵۔ یوں بھی ان دنوں ہند پہ حملے کا رواج عام ہے۔

ایسی بے معنی وجوہات معروض ہونے پر ہمیں غصّہ آیا، ایک بھی بات خدا لگتی نہ تھی، قصد ہُوا کہ فرمانبردار خاں سے وہی پرانا سلوک کریں، دیکھا تو وہ

کبھی کا غائب ہو چکا تھا۔ ہم نے خود ان سے بہتر وجوہات سوچنے کی دیر تک کوشش کی، جب کامیابی نہ ہوئی تو خوش ہو کر فرمانبردار خاں کو بحال فرمایا۔

**شاہدرے میں آمد آمد**

شاہدرہ کے قریب ایک لڑکی نظر آئی، اس کی ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ چال ڈھال سب لڑکوں کی سی تھی، نام بھی عبداللطیف گویا مردانہ تھا۔ ہم نے پیش کاروں کو حکم دیا کہ اس کے باپ سے مل کر تحقیق کریں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عبداللطیف لڑکا ہی تھا اور کسی مقامی کالج میں پڑھتا تھا۔ خدا جانے ہم کو یہ کیسے خیال آیا کہ وہ لڑکی ہے۔

لاہور پہنچے ہی تھے کہ صوبیدارِ لاہور کے گوریلا دستوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ ہمارے سپاہی جدید جنگی طریقوں سے ناواقف تھے اور صوبیدارِ موصوف نہ صرف ہفت ہزاری تھا بلکہ گوریلا لڑائی کا ماہر تھا، ہم نے بھی فوراً چڑیا گھر سے سارے گوریلے نکال کر سدھائے، گھمسان کا رن پڑا، گوریلا گوریلے پر ٹوٹ پڑا اور سپاہی تماشہ دیکھتے رہے۔ دشمن نے لڑائی کا رُخ بدلا، صوبیدار ہمیں گھیرے میں لینے کی کوشش کرنے لگا اور ہم اسے۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے قریب سے کنّی کتراتی گذر جائیں، گرمجوشی کا یہ عالم تھا کہ گھیرے میں لینے کی کوشش میں صوبیدار فوج سمیت جہلم جا پہنچا اور ہم فیروزپور۔ غلطی کا احساس ہوا تو لوٹے۔ اُلو شناس کے مشورے پر صوبیدار پر ہند کا مروّجہ کارآمد نسخہ رشوت آزمایا اور

شکست فاش دی۔ شکست کے بعد ہم نے اس سے ہفت ہزار بصد وقت وصول کیا۔ شام کو اُلّو شناس کچھ اور منصب داروں کو لایا جو بالترتیب پنج ہزاری، سہ ہزاری دو ہزاری تھے، کئی روز گرفتار رکھا تب کہیں دس ہزار روپیہ وصول ہوا۔ دیکھتے دیکھتے عہدیداروں کی قیمتیں گرنے لگیں، لوگ پنج صدی، پونے دو صدی، ایک سینکڑی اور پچاسوی تک پہنچ گئے۔ یہ لوگ بڑے لالچی ہیں۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ کوئی ہزاری بہت چلّایا کیا کہ وہ ہزارہ کا رہنے والا ہے۔ لیکن ہم نے اپنا اصول ترک نہیں کیا۔

## لاہور سے روانگی

چاہیئے تو یہ تھا کہ ان علاقوں میں چند روز رہ کر دادِ عیش و کامرانی دیتے۔ مگر یہاں کی پرانی رسم ہے کہ وہ سیاح جو درۂ خیبر سے آتے ہیں انھیں سیدھے دلّی جانا پڑتا ہے۔ راستے میں کہیں نہیں ٹھہر سکتے۔

جہلم، چناب، راوی عبور کر چکے تھے، ستلج کو عبور کیا اور پنجاب کے پانچویں دریا کو بہت ڈھونڈا۔ خبر ملی کہ بیاس تو پہلے ہی ستلج سے مل چکا ہے سخت مایوسی ہوئی۔ مصاحبین نے دست بستہ عرض کی کہ ملک کا دستور ہے حملہ آوروں سے اس علاقے میں ضرور لڑتے ہیں۔ اس کے لئے پانی پت، تراوڑی وغیرہ کے میدان مخصوص ہو چکے ہیں۔ ہم نے فرمایا کہ لڑیں تو تب اگر مقابلے میں کوئی فوج آئی ہو، معلوم ہوُا کہ حملہ آوروں کو انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اگر اہلِ ہند اس

علاقے میں نہ لڑیں تو پھر کہیں نہیں لڑتے۔

محمد شاہ کو ہماری تشریف آوری کا علم ہو چکا تھا، ایک مرتبہ تو اس نے ایلچی کو لفافے سمیت شراب کے مٹکے میں دھکیل دیا اور بولا۔ این ایلچیؑ بے معنی غرق مے ناب اولیٰ۔ کسی طبلچی نے حافظ رح کا یہ مصرع صحیح کرنا چاہا تو محمد شاہ نے اسے بھی مٹکے میں دھکیل دیا۔ آدمی با مذاق معلوم ہوتا ہے۔

## ہمیں تحفہ دینے کا نتیجہ

دلّی سے ایک درباری قدمبوسی کے لیے حاضر ہوا۔ تحفے تحائف سے لدا ہوا تھا اس لیے ہم نے بلا لیا۔ بولا، یا شہنشاہ سنا ہے کہ آپ تبدیلیٔ آب و ہوا کی غرض سے اس طرف تشریف لائے ہیں، جہاں تک آب و ہوا کا تعلق ہے اس ملک کو یہاں ختم سمجھئے اس سے آگے سخت گرمی پڑتی ہے۔ رعایا کی التجا ہے کہ آپ دو کروڑ کی حقیر رقم بطور سفر خرچ قبول فرما کر یہاں سے مراجعت فرما جائیں۔ ہمیں رضامند پا کر وہ نابکار بغلیں بجانے لگا ڈانٹا تو معلوم ہوا کہ یہاں کا رواج ہے، ایک تو یہاں کے رسم و رواج نے ہمیں عاجز کر دیا ہے۔ واپسی کے لئے سامان بندھوا رہے تھے کہ الوشناس نے شبہ کرا دیا کہ اہلِ ہند ہم پر اپنا محبوب نسخہ استعمال کر رہے ہیں، یہ رقم ہمیں تحفتہً پیش کی جا رہی ہے۔ شام کو وہی درباری بغلیں جھانکتا ہوا پھر حاضر ہوا اور دلّی چلنے کی ترغیب دینے لگا۔ عجب ڈھل مل یقین لوگ ہیں۔ اُلوشناس نے اصل وجہ بتائی جب درباریٔ مذکور دلّی دربار

میں پہنچ کر انعام کا خواہاں ہوُا تو کسی نے پوچھا تک نہیں بلکہ خان بہادر کا خطاب کسی حریف کو مل گیا۔ اس نے جل بھُن کر دھمکی دی کہ ٹھہرو، ابھی لاتا ہوں نادر شاہ کو ــــ۔

ہم نے سوچا کہ اب اتنی دور آ گئے ہیں تو دلّی دیکھ کر جائیں گے، کرنال کے مقام پر محمد شاہی فوج دکھائی دی جو ہمیں دیکھتے ہی اِدھر اُدھر ہو گئی۔ ہم نے کہلوا کر بھیجا کہ ہماری خواہش ہے کہ اس جنگ کو تاریخ میں پانی پت کی تیسری لڑائی یا کرنال کی پہلی لڑائی کا رتبہ ملے۔ اس پیغام پر باقیماندہ فوج بھی بھاگ نکلی۔

## قطب صاحب کی لاٹھ

نزولِ اقبال دلّی کے باہر ہوُا۔ قطب صاحب کی لاٹھ کے پاس نادر شاہی جھنڈے گاڑے گئے۔ یہ لاٹھ قطب صاحب کی تعمیر کردہ ہے لیکن اس کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا۔ پتہ نہیں قطب صاحب کا ارادہ کیا تھا۔ فرمانبردار خاں نے عرض کیا کہ غالباً قطب صاحب آسمان تک پہنچنا چاہتے تھے۔ لیکن تجویز کو تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ بصد دقّت اُوپر تشریف لے گئے، واقعی بہت اُونچا مینار ہے، آسمان یہاں سے کافی قریب ہے۔ سستانے کے بعد نیچے تشریف لائے۔

## حملہ آوری اور برادرم محمد شاہ کی ہماری ذات سے عقیدت

صبح سے محمد شاہ اپنا

لشکر لے کر سامنے آیا ہوا تھا مگر ابھی تک سعادتِ زیارت سے مشرف نہ ہوا تھا، دوپہر کو ایک ایلچی رنگین جھنڈا لہراتا آیا اور معروض ہوا کہ محمد شاہ صاحب نے دریافت کیا ہے کہ حملہ کرنے کا کس وقت ارادہ ہے۔ ہم نے پوچھا۔ "ابے حملہ کیسا؟" ایلچی نے عرض کیا ___ "خداوندِ نعمت وہ تو عرصے سے آپ کے حملے کے منتظر ہیں، اتنے دنوں سے تیاریاں ہوتی رہی ہیں۔ اگر حملہ نہ ہوا تو سب کو سخت مایوسی ہوگی۔ کل بارش کی وجہ سے لشکر اکٹھا نہ ہوسکا۔ اور پھر یہ رسم چلی آتی ہے کہ درّہ خیبر سے آنے والے ___" "بس بس! آگے ہمیں پتہ ہے ___" ہم نے اسے ڈانٹا۔

مجبوراً ہم نے حملے کا حکم دے دیا۔ لیکن لڑائی کا لطف نہ آیا، وہ لوگ فوراً تتر بتر ہو گئے۔ ہم شہر کے دروازے میں داخل ہوئے تو عزیزی محمد شاہ نے پھولوں کا ہار پہنایا، گھوڑے سے اتر کر بغلگیر ہوئے، اس کے بعد دو دن تک محمد شاہ کا کوئی پتہ نہ چلا۔

دلّی میں نازل ہو کر ہم نے اور بندگانِ درگاہ نے خوب دادِ عیش دی کہ شیوۂ سپاہیاں ہے۔ حمام گئے، الحمد للہ کہ آج پورے ایک سال کے بعد غسل فرمایا۔ صبح سے شام تک تختِ طاؤس پر بیٹھ کر شغلِ خورد و نوش و خوش فعلیوں اور خوش گپیوں سے اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کرتے اور رعایا کو اپنے دیدار سے فیضیاب کرتے۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ ہمارے جیسا صاف باطن

اور نیک دل بادشاہ تاریخ میں کوئی نہ ہوا ہوگا۔ سکندر نے پورس سے جو سلوک کیا اس سے کہیں بہتر سلوک ہم نے عزیزی محمد شاہ سے کیا۔ ہر چند کہ اس کی رنگین مزاجی ہمیں نہ بھاتی تھی اس کو مانند اپنے عزیز کے سمجھا۔ حق تو یہ ہے کہ اس نے ہماری اتنی خدمت کی کہ کیا کوئی اپنے بزرگ کی کرتا ہوگا۔

ہمیں شاہی مہمان خانے کے بہترین حصے میں ٹھہرایا گیا جو مرہٹوں کے لئے مخصوص تھا۔ عزیزی محمد شاہ نے شام کو ہمارے لئے مسواکیں، لباس شب خوابی، سلیپر بھیجے، چادریں اور غلاف بدلوائے۔ یہ اور بات تھی کہ ہم راستہ بھول گئے اور نہ جانے کہاں پوستین سمیت سیڑھیوں پر سو گئے۔ لال قلعہ باہر سے تو سیدھا سادا سا قلعہ معلوم ہوتا تھا لیکن اندر نفیس و نازک عمارتوں اور خوشنما باغوں کی بھول بھلیاں میں ہمیں گائیڈ کی ضرورت محسوس ہوا کرتی۔ ہماری آمد کی خبر پاکر (غالباً ہمیں متاثر کرنے کی غرض سے) حکومتِ ہند نے امتناعِ شراب کے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ لیکن عزیزی کی وساطت سے ہمارے سپاہیوں کے لئے پینے پلانے کا انتظام ہو ہی جاتا تھا۔

## تختِ طاؤس

ایک دفعہ جب ہم متواتر دس گھنٹے تختِ طاؤس پر بیٹھے رہے تو عزیزی بولا ”معلوم ہوتا ہے کہ تختِ طاؤس سے آپ کو از حد انس ہو گیا ہے۔ اگر آپ کا اس درجہ طویل قیام تختِ طاؤس کی وجہ سے ہے، تو چشمِ ما روشن دلِ ما شاد۔ آپ اسے

بخوشی لے جا سکتے ہیں۔"

ایسے خلوص و محبّت سے کس کا دل نہ پسیج جاتا۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ ہم جب یہاں سے عازمِ ایران ہوئے تو تختِ طاؤس ہمراہ لے جائیں گے۔ ہم انکار کر کے اس کا دل نہیں دُکھانا چاہتے تھے۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے پوچھا — "دلّی کو اپنی ذاتِ بے مثال سے محروم کرنے کی تاریخ سے مطلع فرما دیا جائے تاکہ اہلِ دلّی کو مطلع کر دیا جائے، وہ اس دن کے لئے گھڑیاں گن رہے ہیں —"

"کیوں گھڑیاں کیوں گن رہے ہیں، کیا وہ ہم جیسے مشفق بزرگ کو بن بلایا مہمان سمجھتے ہیں؟" ہم نے غیض و غضب میں فرمایا۔

"جی نہیں، آپ نے غلط سمجھا۔ وہ الوداعی پارٹیوں کا انتظام کرنا چاہتے ہیں —" وہ بولا۔

"ہمیں ان گلیوں کو چھوڑنے کی کوئی ایسی جلدی نہیں، جن کے متعلق کوئی استادِ ذوق شعر کہیں گے۔" ہم نے فرمایا۔

"یوں ٹھہرنے کو آپ چھ ماہ، سال، دس سال ٹھہریے، بلکہ ایران کا دار الخلافہ دلّی کو بنوا لیجئے۔" عزیزی بڑی محبّت سے ملتمس ہوا۔

"دیکھا جائے گا —" ہم نے بھی محبّت سے فرمایا۔

**وہ گلقند والا قصّہ** بات کچھ بھی نہ تھی۔ مغلئی دسترخوان کی مرچیں ہمیں تیز معلوم ہوئیں تو حلوے کے مرتبان کی طرف متوجہ ہوئے بمشکل کوئی پاؤ بھر حلوہ کھا سکے ہوں گے کہ فرمانبردار خاں نے بڑی بدتمیزی سے مرتبان ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا۔ اس معمولی سے واقعہ پر لوگوں نے اتنا لمبا چوڑا افسانہ تراش لیا۔ ہمیں ہرگز علم نہ تھا کہ مرتبان میں حلوے کی جگہ گلقند ہے اور اگر علم ہوتا بھی تو کیا فرق پڑ جاتا۔

**ہنوز دلّی دور است** اس فقرے کو ہم نے اہلِ دلّی کا تکیہ کلام پایا جب ہم خیبر میں تھے تو سنا تھا کہ ہمارے لئے ہنوز دلّی دُور تھی، جب لاہور پہنچے تب بھی دُور رہی۔ لال قلعے میں پہنچ کر بھی لوگوں کا یہی خیال ہے کہ ہنوز دلّی دور است۔ اچھا بھئی چلو دلّی دور است بس!

**محمد شاہ کا دربار** مسز محمد شاہ لال قلعے میں اس دھوم دھڑتے سے رہتی ہیں کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی سیاسی دنگے فساد میں ہمیشہ ان کا ہاتھ ہوتا ہے، ملک کی خارجی اور اندرونی پالیسی (جب اتفاق سے ہوتی ہے) وہ خود ترتیب دیتی ہیں، یہاں تک کہ اعلیٰ حکّاموں کی پوسٹنگ وغیرہ بھی وہ خود ہی کرتی ہیں۔ وہ فارسی، عربی، سنسکرت اور مدراسی بول سکتی ہیں۔ لیکن دیگر بیگمات کا خیال ہے کہ وہ سمجھ ایک زبان بھی نہیں سکتیں

(ویسے دیگر بیگمات کا ہمیشہ کچھ اور ہی خیال ہوا کرتا ہے) درباری بیگمات بے حد ذہین ہیں، ایک برجیس جہاں بیگم نے برجس کو دیکھ کر چوڑی دار پاجامہ ایجاد کیا، دوسری نے شلوار کو ساری میں ضرب دے کر دو پر تقسیم کر دیا اور غرارہ دریافت کیا، تعجب ہے کہ یہ خیال اسے علی الصبح غرارے کرتے وقت آیا۔

صبح شام شہر کی چیدہ چیدہ خواتین حاضر ہو کر آداب بجا لاتی ہیں اور شہر کی دوسری چیدہ چیدہ خواتین کے بارے میں تازہ ترین افواہیں سناتی ہیں۔

عزیزی محمد شاہ بھی لال قلعے ہی میں وہیں کہیں رہتا ہے۔

اس کا خیال ہے کہ وہ ہندوستان کا بادشاہ ہے لہذا اپنے تئیں شہنشاہِ ہند کہلاتا ہے۔ رنگین خواب دیکھتا ہے، رنگین لباس پہنتا ہے، رجعت پسند ادب اور تنزل پسند شاعری کا گرویدہ ہے۔ لیکن حرکتیں سب ترقی پسند کرتا ہے۔

کل وزیرِ جنگ نے بتایا کہ ملک کے کچھ حصّوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے۔ عزیزی محمد شاہ خوش ہو کر بولا — اب ملک کا بیشتر حصّہ خود مختار ہو چکا ہے۔ جتنے صوبے اور ریاستیں خود مختار ہوں گے اتنا ہی ہمارا کام کم ہو جائے گا۔ ملک کے ریاستوں میں بٹتے ہی ان کی ریاستہائے متحدہ بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

عزیزی کے تعلقات مرہٹوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ خوشگوار ہیں۔

جب مرہٹے بیکار ہوتے ہیں تو سیدھے دلّی آدھمکتے ہیں، پچھلے ماہ آئے تھے تو نربدا، چنبل اور مالوہ کے علاقے لے کر ٹلے۔ خیر، ہمیں کیا عزیزی جانے اور اُس کا کام۔

ہندی فوج کو دیکھ کر ہمیں بڑی حیرت ہوئی، لڑنے جاتے ہیں تو پالکیوں میں بیٹھ کر، میدانِ جنگ میں ڈھال ملازم اُٹھاتا ہے، ہر وقت صلح کے خواہاں ہیں۔ ہر سپاہی کی وردی مختلف ہے، کرنال میں ہم سے لڑنے آئے تو جیسے عید کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ہمیں زیادہ نکتہ چینی نہیں کرنی چاہیئے۔ انسان خاک کا پُتلا ہے۔

**مینا بازار اور ہم** محمد شاہ کے بزرگوں کے وقت سے رسم چلی آتی ہے کہ موسمِ بہار میں لال قلعے میں مینا بازار لگتا ہے جس میں طرح طرح کی دکانیں سجائی جاتی ہیں، دکانوں سے زیادہ بیگمات سجتی ہیں اور مختلف اشیا بازار سے چوگنے نرخ پر خرید تی ہیں۔ ان دنوں تو ذرا سے بہانے پر مینا بازار لگ جاتا ہے۔ ہماری طبیعت حاضر تھی محمد شاہ سے مینا بازار دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے ٹالنا چاہا۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم بزرگ بھی ہیں۔ وہ بولا کہ اگر آپ کو اتنا ہی شوق ہے تو دو دن سمندِ شوق کو لگام دیجیئے اس مینا بازار کے ختم ہوتے ہی ایک مردوں کے مینا بازار کا انتظام کرائے دیتا ہوں جس میں سب مرد ہی مرد ہوں گے۔ پوچھا کہ ہم زنانہ شو میں کیوں نہیں

جاسکتے۔ بولا اس میں سوائے بادشاہِ ہند کے کسی کا گذر نہیں ہو سکتا۔ ہم نے فرمایا کہ کچھ دیر کے لئے ہمیں بادشاہِ ہند ہی سمجھ لیا جائے۔ آدمی عقلمند تھا، مان گیا۔

ہمارا فرزند علی قلی خاں بائیس سال کا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو نابالغ سمجھتا ہے، اپنے ہم جنسوں کی صحبت کی بجائے عورتوں میں اُٹھنے بیٹھنے کو ترجیح دیتا ہے۔ ہمارے ساتھ مینا بازار جانے پر مصر ہوا۔ دیکھا کہ ہر طرف نازنینانِ گل بدن رنگ برنگے ملبوس پہنے چُہلیں کر رہی ہیں۔ نہ نگاہیں نیچی ہیں، نہ دوپٹے کا خیال ہے، دیکھ کر آنکھوں میں خون اُتر آیا (آج صبح بھی ایک مرتبہ خون اُترا تھا) ہمارے بارے میں سب کو علم ہو چکا تھا، ہمیں گھیر لیا گیا، ہمارے دستخط لیے گئے، ساتھ ساتھ مناسب اشعار لکھنے کو کہا گیا، ہم سے طرح طرح کے پریشان کن سوالات پوچھے گئے۔

ارادہ ہوا کہ کچھ زنانہ سامانِ آرائش ایران لے جانے کے لئے خریدیں پھر سوچا ہمارے پہنچتے پہنچتے کہیں فیشن نہ بدل جائے۔

ایک ماہ رُو نظر پڑی کہ کچھ سامان لئے جاتی ہے۔ ایک دکان کے سامنے اس نے آواز دی قلی! قلی!! کیا دیکھتے ہیں کہ پسرِ ناخلف علی قلی خدا جانے کہاں سے بھاگتا ہوا آیا اور اس کا سامان اُٹھا لیا۔

"تم قلی ہو ——؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں —— بالکل ——" علی قلی نے جواب دیا۔

اگرچہ ہم علی قلی کے اس قسم کے قلی بن جانے پر خفا تھے مگر اس کی حسِّ مزاح پر حیرت ہوئی کیونکہ ہمارا خاندان اس حس سے بے بہرہ ہے۔ ہم میں خود مذاق برداشت کرنے کی تاب نہیں۔ کچھ دیر بعد جب غلطی کا ازالہ ہوا تو نازنین بے حد محظوظ ہوئی اور بڑی معصومیت سے پوچھنے لگی۔ "آج شام کو آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"کوئی خاص کام نہیں۔" علی قلی نے جواب دیا۔

"مست قلندر صاحب کے عرس پہ ایک سرکس آیا ہوا ہے ـــ" وہ بدستور معصومیت سے بولی۔

"میں پہلے شو کے لیے دو نشستیں بک کرا لوں گا اور باہر ٹکٹ گھر کے پاس انتظار کروں گا۔ خدا حافظ! میرے ابا مجھے گھور رہے ہیں۔" علی قلی بھاگا۔

شام کو ہم اس کے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ آئینے کے سامنے کھڑا مونچھیں تراش رہا ہے، باز پرس کی تو بولا عرس پر جا رہا ہوں۔ ہم نے پوچھا ٹکٹ کی قیمت کون دے گا۔ اس کے منہ سے نکل گیا چچا محمد شاہ نے دو سیٹیں بک کرا دی ہیں۔ پوچھا دوسری کس کے لئے ہے تو چپ ہو گیا۔

"نامعقول! ایسے ہجوم میں جا کر خواہ مخواہ سکینڈل کروائے گا ـــ" ہم نے گرج کر کہا۔ "کچھ ہماری پوزیشن ہی کا خیال کر ـــ"

"ابا جان میں وعدہ کر چکا ہوں ـــ" اس نے ایسے عدم تشدد انہ انداز

سے کہا کہ ہم لوٹ آئے۔

## ہندی کلچر

ہندی کلچر کی بے حد تعریفیں سنی تھیں چنانچہ دیکھنے کا شوق تھا (حملے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی۔ فرمانبردار خاں کو وقت پر سوجھتی نہیں)

عزیزی محمد شاہ سے ذکر کیا وہ بولا کلچر وغیرہ کا تو پتہ نہیں۔ آپنے ایگری کلچر سنا ہوگا وہ البتہ مشہور رہے۔ ہم مُصر ہوئے تو کہنے لگا آپ سنی سنائی باتوں کا یقین نہ کیجئے ویسے ہمارے ہاں چند ایک باتیں واقعی شہرۂ آفاق ہیں۔ ایک تو یہی قدیمی دواخانے جن کے اشتہار آپ چپے چپے پر دیکھتے ہیں۔ دوسرے قدیم روایات جن کے لئے بھیس بدل کر شہر میں چلنا ہوگا۔ چنانچہ ہم دونوں گئے۔ ایک جگہ ایک شخص (جو کہ مدرس تھا) بھینسوں کے آگے بین بجا رہا تھا اور بھینسیں متوجہ نہیں تھیں۔ ایک سیاسی جلسے میں بہت سے حضرات اپنے سامنے ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ رکھے عبادت میں مشغول تھے۔ وہیں ایک شخص کہ باغیرت معلوم ہوتا تھا چلّو میں پانی لئے ناک ڈبونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک جگہ دو حکّامِ شہر ایک پرندے کو کھینچ کر سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پرندہ اُلّو تھا۔ ایک نہایت ضعیف بزرگ قبر کے کنارے پاؤں لٹکائے نوجوانوں پر تنقید کر رہے تھے۔ محمد شاہ کے متعلق ہم کہہ نہیں سکتے البتہ ہم از حد محظوظ ہوئے۔

## علی قلی کی گستاخی اور ہمارا تحمّل

آہستہ آہستہ برخوردار علی قلی اور اس لڑکی کا قصّہ مشہور ہوتا جارہا تھا۔ سوچا کہ اس معاملے کو فوراً ختم کیا جائے چنانچہ اس کے کمرے میں گئے، وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال گھنگھریالے بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر بولا۔ "ابا جان معاف فرمائیے۔ دروازہ کھٹکھٹائے بغیر اندر آنا موجودہ آداب کے خلاف ہے ـــــ"

ہمیں سخت غصّہ آیا یہ نئی پود ہمیں آداب سکھائے گی، یہ لڑکا دن بدن بگڑتا جارہا ہے۔

"ہم تجھے جگالی کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں ـــــ جب سے دلّی آیا ہے ہر وقت منہ چلتا رہتا ہے ـــــ کیا ہے تیرے منہ میں ـــــ ؟"

"پان کھا رہا ہوں ـــــ کسی نے دیا تھا ـــــ" وہ بولا۔

"یہ کسی کون ہے؟ وہی عرس والی لڑکی تو نہیں ـــــ ؟ وہ تو بیحد معمولی سی ہے ـــــ" ہم نے فرمایا۔

"ابا جان اس کی ٹھوڑی پر جو وہ خوشنما تل ہے وہ نہایت بھلا معلوم ہوتا ہے ـــــ"

"مصیبت تو یہ ہے کہ آجکل کے نوجوان خوش نما تل پر عاشق ہو کر سالم لڑکی سے شادی کر بیٹھتے ہیں ـــــ"

"ابّا جان محبت بُری چیز ہے —" وہ سرد آہ کھینچ کر بولا

"تو سپاہی ہے تجھے تلوار اور گھوڑے سے محبت کرنی چاہیئے۔ ہم خود گھوڑوں کو چاہتے ہیں، گھوڑے جب پیار کریں تو ساریوں اور زیورات کی فرمائش نہیں کرتے۔"

"ابّا جان بات دراصل یہ ہے کہ مجھے — اس سے —"

"خبردار گستاخی کرتا ہے۔ جانتا نہیں کہ تو نادر شاہ ابنِ شمشیر ابنِ شمشیر کی اولادِ ناخلف ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ دادا جان کا نام شمشیر تھا، شمشیر شاہ —"

"ابے گستاخ! شمشیر سے مراد تلوار ہے، سمجھا؟"

"سمجھ گیا — ابا جان کیا آپ مجھے چار روپے آٹھ آنے دے سکیں گے سرکس کے لیئے۔"

ایسے نالائق کو ہم اور کیا کہہ سکتے تھے۔

## ہمارا اصلاحات رائج کرنا

مصاحبِ حضوری حقہ بردار خاں معروض ہوا کہ شہنشاہوں کا رواج رہا ہے کہ رعایا کی بہبودی کے لیئے حسبِ توفیق اصلاحات نافذ کرتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم بھی چند مفید اصلاحات عمل میں لائیں تاکہ اہلِ ہند ہمیں رہتی دنیا تک یاد کیا کریں۔ ہم حیران ہوئے کیونکہ ہمارے خیال میں ہماری

ہر حرکت میں اہلِ ہند کے لئے کوئی نہ کوئی اصلاح پوشیدہ تھی۔ جب دیکھا کہ وہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتا تو کافی غور و خوض کے بعد مندرجہ ذیل فہرست مرتب فرمائی۔

۱۔ درۂ خیبر کو ڈھا کر ہموار کرایا جائے، وہاں سے دلّی تک دس دس میل کے فاصلے پر عالیشان سرائیں تعمیر کرائی جائیں تاکہ حملہ آوروں کو کسی وقت کا سامنا نہ ہو۔ سڑک پر جگہ جگہ "خوش آمدید" نصب کیا جائے۔ ساتھ ہی ایک محکمہ کھولا جائے جو دوسرے ملکوں میں نشر و اشاعت کے ذریعے لوگوں کو ہند میں آنے کی ترغیب دے۔

۲۔ ستلج اور جمنا کے درمیان ایک وسیع علاقہ خشک اور غیر آباد پڑا ہے، اس قطعے کو سیراب کرنے کے لئے ایک عظیم الشان دریا کھدوایا جائے۔

۳۔ ہند کے تاریخی مقامات ملک بھر میں بکھرے ہوئے ہیں، سیّاحوں کو بڑی قباحت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاج محل آگرے میں ہے، غار ہائے الورا، الورا میں تو جہانگیر کا مقبرہ لاہور میں۔ ان ساری تاریخی عمارات کو منہدم کرا کے دلّی میں (کہ مرکزی مقام ہے) دوبارہ تعمیر کرایا جائے تاکہ سب کچھ بیک وقت دیکھا جا سکے۔

۴۔ ہر سال درخت اکھاڑنے کا ہفتہ بڑے زور شور سے منایا جائے۔

۵۔ قطب صاحب کی لاٹھ کا نام تبدیل کر کے اگلے حملہ آور کے آنے تک نادر شاہ کی لاٹھ رکھا جائے۔ تاکہ لوگوں کو حملہ آوروں کے نام بآسانی یاد رہ سکیں۔

اور تاریخ ہند مرتب کرنے میں آسانی ہو۔

وہ اصلاحات گنانے بیٹھیں جو ہم نے اس مختصر سے قیام میں نافذ کرائیں تو بے شمار ہیں۔ ہمیں یاد بھی نہیں رہیں، مثلاً بارہ دری کی جگہ تیرہ دری بھی تعمیر کرائی جائیں۔ جنگل میں منگل ہی نہیں بدھ بھی منایا جائے، وغیرہ وغیرہ۔

## محبت اور شادی کے متعلق ہمارے خیالات

ہمارے خیال میں اگر محبت کو شادی سے اور شادی کو محبت سے دور رکھا جائے تو دونوں نہایت مفید چیزیں ہیں۔ لیکن نوجوان بڑی جلد بازی سے کام لیتے ہیں، دوسروں کے تجربے سے مستفیض نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ شادی مول لے بیٹھتے ہیں۔

اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ جو لوگ شادی سے پہلے پچھتاتے تھے وہ شادی کے بعد بھی خوب پچھتاتے ہیں۔ ہم کبھی نہیں پچھتائے حالانکہ ہم کسی زمانے میں بڑے بانکے البیلے نوجوان مشہور تھے۔

جب ہمیں معلوم ہوا کہ برخوردار علی قلی شادی پر تلا بیٹھا ہے تو ارادہ ہوا کہ اسے من مانی کرنے دیں، کیا یاد کرے گا۔ لیکن ان ہی دنوں ہم ایک ایسی حرکت کے مرتکب ہوئے جو ہمارے جیسے بزرگ کی شان کے شایاں ہرگز نہ تھی۔ ویسے ہم چھپ کر کسی کی باتیں سننے کے عادی نہیں ہیں، اس روز نہ جانے کیونکر ہم نے یہ برداشت کیا اور اوٹ سے ان دونوں کی گفتگو سنی۔

لڑکی نے برخوردار علی قلی کی آمدنی کے متعلق پوچھا۔ علی قلی نے ہمارا حوالہ دیا کہ والدِ بزرگ شہنشاہ ہیں۔ وہ بولی۔ "شہزادوں کی تو خدا کے فضل سے یہاں بھی کوئی کمی نہیں، ہر تیسرا نوجوان شہزادہ ہے بلکہ غیر شہزادہ ہونا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔"

"ہمارے ملک میں تیل کے چشمے ہیں —" علی قلی کا یہ کہنا تھا کہ لڑکی کی باچھیں کھل گئیں۔

"تمہارے کنبے کے متعلق امّی پوچھ رہی تھیں، تم مغل ہو؟"

"مغل وغیرہ کا پتہ نہیں، ویسے ہم ابنِ شمشیر ابنِ شمشیر ہوتے ہیں —" علی قلی بولا۔

"بہرحال ہمارے کنبے والے ایران سے تمہارے چال چلن کی تصدیق کرائیں گے"

"چال تو میں ابھی چل کر دکھا دیتا ہوں"— علی قلی نے بھولپن سے کہا —

"رہ گیا چلن، شادی کے بعد ایران چلو گی تو وہ وہاں دیکھ لینا —"

"ایران جانا تو ذرا مشکل ہے کیونکہ امّی جان مجھے بے حد چاہتی ہیں، وہ کہتی ہیں کہ شہزادہ علی قلی ہر سال ایک ماہ کی چھٹی لے کر آجایا کرے گا۔ یا یوں ہو کہ آبا جان شہنشاہ محمد شاہ سے مل کر تمھیں کوئی ریاست الاٹ کرا دیں۔"

"تجویز تو یہ بھی اچھی ہے —" وہ ناخلف بولا۔ "لیکن اگر میں ایران چلا گیا تو تم اداس رہا کرو گی۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ ہمارے ہاں کافی شہزادوں کا آنا جانا ہے۔"

علی قلی بگڑنے لگا۔ "تم پرسوں شام کس شہزادے کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے گئی تھیں۔؟"

"وہ تو بھائی جان کے دوست ہیں ان کی پالکی بالکل نئے ماڈل کی ہے، تمہارے ساتھ پیدل چلنا پڑتا ہے۔ شام کا لباس خراب ہو جاتا ہے۔"

ہم بقیہ گفتگو سنے بغیر تشریف لے آئے۔

## علی قلی کا علاج

ہمیں یقین ہو چکا تھا کہ یہ لڑکی بہت زیادہ ماڈرن خیالات کی ہے، بیچارے علی قلی کو وہ تگنی کا ناچ نچائے گی کہ نِرا زن مرید بن کر رہ جائے گا۔ ہم نے برخوردار خاں فیلسوف سے ذکر کیا، اس نے بڑے پتے کی بات کہی، یہی کہ وہ دونوں محض فلرٹ کر رہے ہیں سنجیدہ کوئی بھی نہیں ہے، علی قلی لڑکی سے ہمیشہ شام کو ملتا ہے اور شام کو اس کے سانس میں مئے رنگیں کی بو ہوتی ہے۔ جسے وہ الائچی یا پان سے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک روز اس کی پوستین سے پوست کی کافی مقدار برآمد ہوئی۔

ہمارا تجربہ ہے کہ غروبِ آفتاب کے بعد قندیلوں کی جھلملاتی روشنی میں سب لڑکیاں حسین معلوم ہوتی ہے، خصوصاً چند گھونٹ بادہ رنگیں چڑھا لینے کے بعد۔

ہم نے درویشِ کامل شیخ بوٹا شجرپوری کا نسخہ نکالا جو انھوں نے محبت اُتارنے کے سلسلے میں بتایا تھا۔ اسے علی قلی پر آزمایا اور تیر بہدف پایا۔ شام ہوتے ہی علی قلی کو کہیں باہر کام پر بھیج دیا جاتا۔ پینا پلانا چھڑوا دیا گیا۔ لڑکی لگاتار علی الصبح اُسے دکھائی گئی

سورج کی روشنی میں جب علی قلی نے لڑکی کی اصلی شکل بغیر میک اَپ کے دیکھی، تو بہت سے رازہائے پنہاں آشکار ہوئے۔ چند ہی دنوں میں ایسا بدلا کہ لڑکی سے کوسوں دُور بھاگنے لگا۔ دلّی کا رُخ ہی نہ کرتا تھا، بلکہ ایک روز معروض ہوا کہ میں تارک الدنیا بننا چاہتا ہوں، ہم نے اسے منع کر دیا۔

شیخ بوٹا شجرپوری کے بقیہ نسخے بھی استعمال کریں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔

## ہند کے بادشاہ گر

ہند کے دو بادشاہ گر سید برادرز (حسین علی خاں اور پتہ نہیں کیا علی خاں) تقریباً ہر روز پریس کانفرنس منعقد کرتے اور انواع واقسام کے بیان دیتے۔ چونکہ پریس ان کے ہاتھ میں تھا اس لئے ملک کی سیاست پر پورا قابو تھا۔ دونوں بھائی اکثر دورے پر رہتے تھے اس لئے ہماری خدمت میں حاضر نہ ہو سکے، ایک روز ہم نے بازار میں ایک بورڈ دیکھا جس پر "اصلی شہنشاہی بادشاہ گرانِ مملکتِ ہند" لکھا تھا اوقاتِ ملاقات اور مشورے کی فیس بھی درج تھی۔ ہم نے انھیں اپنے دیدار سے سرفراز فرمایا اور انھیں بلا کا چست وچالاک وچارسوبیس پایا۔ کاش کہ ہم ایسے سمارٹ لوگوں کو اپنے ساتھ لے جاسکتے۔ محمد شاہ سے کہا کہ ہمیں ایک جوڑی بادشاہ گر درکار ہیں۔ وہ ملتمس ہوا کہ ان ہی کے دم سے تو دلّی میں رونق ہے۔ للہ انھیں چھوڑ جائیے۔ گداگر البتہ حاضر ہیں۔"

"وہ تو ہم ملتان سے خود لے سکتے ہیں ——" ہم نے فرمایا۔

## ایک رفیقِ دیرینہ سے ملاقات

چاندنی چوک سے گذر رہے تھے کہ شور وغل سنائی دیا، دیکھتے ہیں کہ بہت بڑا جلوس آرہا ہے، آگے آگے ہاروں سے لدا ہوا ایک شخص ہے کہ شکل اس کی زمانہ ساز خاں سے ملتی ہے' یہ زمانہ ساز خاں ہی تھا۔ ہمیں پہچان گیا، معانقہ کیا۔ معلوم ہوا کہ ملک کے بڑے لیڈروں میں سے ہے۔ خدا کی شان کہ یہی زمانہ ساز خاں کبھی زمانے کی ٹھوکریں کھاتا اور بھیڑوں کی اُون تراشتا، آج اس شان و شوکت سے نکلتا ہے کہ شہنشاہ دیکھیں تو رشک کریں۔ شام کو ہم نے اسے مدعو کرکے اس کی عزّت افزائی فرمائی اور اس حیرت انگیز ترقی کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگا کہ اس کی زندگی قربانیوں کا مرقّع رہی ہے' ملک اور قوم کی خدمت کرکے اس رتبے کو پہنچا ہے۔ شراب کا دَور چلا تو بہت جلد آؤٹ ہوگیا۔ ہمارے دوبارہ استفسار کرنے پر اصلی بھید کھلا۔ اس نے اقبال کیا کہ ایران سے یہاں آکر بکریوں کی اُون تراشنے کی کوشش کی۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ پھر پوسٹر چسپاں کرنے پر ملازم ہوگیا۔ ایک روز شومیٔ قسمت سے کوئی پوسٹر لگاتا ہوا گرفتار کرلیا گیا صاحبِ پوسٹر سے جیل میں تعارف ہوا۔ رہائی کے بعد انھوں نے ایک سیاسی جلسے میں بلایا۔ سٹیج کے قریب دھواں دھار تقریر سننے میں ہمہ تن گوش تھا (جو خاک سمجھ میں نہیں آرہی تھی) کہ لاٹھی چارج کی مہیب صدا کانوں میں پڑی، گھڑی بھر میں افراتفری مچ گئی، چنانچہ مخالف سمت میں جست لگائی اور اتفاقاً سٹیج

پر اپنے تئیں کھڑا پایا۔ گرفتاری شروع ہوئی تو غلطی سے لیڈروں کے ساتھ دھر لیا گیا۔ جیل میں سیاسی قیدیوں والا سلوک ہوا۔ جو کہ نہایت تسلّی بخش تھا، رہائی ہوئی تو پبلک نے جھنڈوں، بینڈ باجوں، نعروں اور آتش بازی سے استقبال کیا شہر بھر میں جلوس نکلا۔ گھر پہنچا تو بالکل جی نہ لگتا تھا، اگلے ہفتے سیاسی جلسے میں دانستہ طور پر سٹیج کے قریب رہا، لاٹھی چارج ہوتے ہی فوراً لیڈروں میں گھس گیا تاکہ گرفتاری کے وقت آسانی سے دستیاب ہو سکے۔ بڑے گھر میں قیام وطعام کا انتظام گھر سے لاکھ درجے بہتر تھا، چنانچہ تقریباً ہر ماہ یہی تماشا ہوتا، پبلک بھی اسے بار بار دیکھ کر نوٹس لینے لگی۔ اسے بھی محسوس ہونے لگا کہ آہستہ آہستہ وہ کچھ لیڈر سا بنتا جا رہا ہے، اب اس نے سنجیدگی سے کام شروع کیا، کتابوں سے تقریریں نقل کرنے لگا۔ آئینے کے سامنے مشق شروع کر دی۔

خدا نے دن پھیرے اور وہ لیڈروں میں شمار کیا جانے لگا۔

ہم نے یہ سنا تو رشک و حسد کے جذبات محسوس فرمائے۔ پھر سوچا کہ موجودہ پوزیشن بھی کوئی خاص بُری نہیں ہے۔ زمانہ ساز خاں معروض ہوا کہ "برخوردار علی قلی خاں کچھ کچھ پرولتاری سا معلوم ہوتا ہے۔ کیوں نہ اس کو اسی لائن میں ڈال دیں۔" ہم نے فرمایا کہ علی قلی خاں روپے پیسے والا ہے یہ تو جب چاہے لیڈر بن سکتا ہے۔ وہ ملتمس ہوا کہ یہ بھی درست ہے لیکن فی زمانہ لیڈری افضل ترین پیشہ ہے، ہم نے بات کاٹی اور فرمایا کہ نہیں لیڈری نمبر دو ہے اور پیری مریدی نمبر ایک۔

## ہمارا مقامی سیاست میں حصّہ لینا

ان دنوں ایک الیکشن زوروں پر تھی۔ اُلّو شناس معروض ہوا کہ ہم دلی میں اس قدر مقبول ہو چکے ہیں کہ کسی ٹکٹ پر کھڑے ہو جائیں انشاءاللہ کامیاب ہوں گے۔ بادشاہ گروں سے مشورہ لینا بیکار تھا۔ کیونکہ الیکشن کے معاملے میں وہ بالکل یوں ہی تھے۔ ایک ایک ٹکٹ پر لاتعداد امیدواروں کو نامزد کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات امیدواروں کی تعداد رائے دہندگاں سے زیادہ ہو جاتی۔ لطف یہ تھا کہ ہمارے مقابلے میں محمد شاہ بھی تھا۔ فرمانبردار خاں نے حسبِ معمول نہایت مایوس کُن خبریں سنائیں، جب ہم نے اس کو برا بھلا کہا تو وہ بھی مان گیا کہ واقعی ہم شہر میں بے حد ہر دلعزیز ہیں اور الیکشن میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ یہ شخص آہستہ آہستہ ہمارے مزاج سے واقف ہوتا جا رہا ہے۔

سات امیدواروں سے دو کو زرِ کثیر تحفتاً دے کر بٹھایا گیا، تیسرے کو ڈرا دھمکا کر علیحدہ کیا، چوتھے کو سفیر بنا کر باہر بھجوانا پڑا، دو کمال درجہ ضدی نکلے، ایک کو زدوکوب کرایا تو مانا، دوسرے نے مشکوک حالات میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ رائے شماری شروع ہوئی، حقّہ بردار خاں نے شہر بھر کی دعوت کی، لوگوں کو تحفے اور زرِ نقد دیا، رائے دینے والوں کو طرح طرح سے خوش کیا۔ اتنی خاطر تواضع کے بعد بھی کوئی بدتمیز نہ مانتا تو اسے ڈنڈے کے زور سے منوایا جاتا کہ ہم سچ مچ ہر دلعزیز ہیں۔ ہم جیت تو گئے لیکن اخراجات کی

تفصیل دیکھی تو از حد پشیمان ہوئے، افسوس بھی ہؤا کہ ناحق ذرا سی خوش وقتی کی خاطر اتنا روپیہ اور وقت برباد کیا۔ معلوم ہؤا کہ ہند میں ہر صاحبِ دولت کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے کہ الیکشن لڑے، سیاسی معاملات میں یہ لوگ سنجیدہ بالکل نہیں ہوتے۔ نتیجے سے زیادہ وقتی ہنگامے کی پرواکرتے ہیں اور محظوظ ہوتے ہیں۔

ملک ملک کا رواج ہے صاحب۔

## دلّی میں سیٹل ہونے کا ارادہ

الّو شناس نے مشورہ دیا کہ دنیا میں یوں مارے مارے پھرنے کی بجائے کیوں نہ ہم ایک اچھی سی مملکت میں باقاعدہ سیٹل ہو جائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اب تک ہماری حیثیت مانند ایک رفیوجی کے رہی ہے۔ ہم نے عزیزی محمد شاہ سے ذکر کیا اور رہائش کے لئے لال قلعہ الاٹ کروانے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ بولا۔ لال قلعے میں تو ہم رہتے ہیں، آپ قطب صاحب کی لاٹھ الاٹ کرا لیجئے یا شاہی مسجد۔

ہم نے انکار فرمایا اور اپنے مہاجر ہونے کی اہمیت جتائی، وہ بولا۔ ہم لوگ بھی تو مہاجر ہیں۔ ہمارے آبا و اجداد وسط ایشیا سے آئے تھے۔ ہم نے بہتیرا سمجھایا کہ وہ مقامی مہاجر ہیں اور ہم نو وارد ہیں جنہیں اب تک نہیں بسایا گیا۔ اس نے گستاخانہ کہا۔ یوں تو حضرت آدم بھی مہاجر تھے کہ بہشت چھوڑ کر

آئے تھے۔

ہمیں سخت غصہ آیا، لیکن فوراً اُتر گیا، پتہ نہیں کیا بات ہے۔ ہند میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد وہ پہلے جیسا غصہ ہی نہیں آتا۔ لیکن محمد شاہ کو اس گستاخی کی سزا اسی شام کو مل گئی۔ التوشناس بھاگا بھاگا آیا، بولا۔ محمد شاہ خزانے میں ہے اور زر و جواہرات ادھر اُدھر چھپا رہا ہے۔ ہم فوراً موقع پر پہنچے، ہمارے دیکھتے دیکھتے اس نے ایک وزنی سی چیز اپنی پگڑی میں چھپالی۔ ہند کے رواج کے مطابق ہم نے ازراہِ مروّت فرمایا کہ آج سے محمد شاہ اور ہم بھائی بھائی ہیں لہٰذا ہم دونوں اپنی پگڑیاں بدلیں گے۔

یہ محض اتفاق تھا کہ اس کی پگڑی سے کوہِ نور ہیرا برآمد ہوا۔

**ہندی وزرا سے شکر رنجی** التوشناس اور محمد شاہ کے وزراء کی ناچاقی کی وجہ دو کروڑ کی وہ رقم تھی جو شاہی ایلچی ہمارے لئے کرنال میں لے کر آیا تھا۔ وزراء کا اصرار تھا کہ رقم ادا ہو چکی ہے۔ التوشناس انکار کرتا تھا اور یہ بھی کہتا تھا کہ رقم دو کروڑ نہیں ڈھائی کروڑ تھی۔ ایلچی اسی کشمکش میں اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔ ہم نے محمد شاہ سے فرمایا کہ روپیہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے لہٰذا شاہی خزانے سے رقم چکا دی جائے۔ رقم ادا کر دی گئی لیکن شکر رنجی نہ گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ اپنے وزیروں سے ڈرتا ہے، بولا۔ اہلِ دربار کی التجا ہے کہ اس مرتبہ آپ سے رسید لکھوا لی جائے

ہم مان گئے ڈھائی کروڑ کی رسید تیار کی گئی۔ ہم نے دستخط شروع کئے، ابھی چوتھی مرتبہ ہی ابنِ شمشیر لکھا ہوگا کہ وہ گھبرا گئے اور کہنے لگے کہ کاغذ چھوٹا ہے دستخط مختصر ہونے چاہئیں۔ عزیزی محمد شاہ کے دستخط تو بے حد مختصر ہیں، اس نے شکستہ حروف میں محض "ایم۔ ایس رنگیلا" لکھا۔

اب کمبخت محرّر کہیں سے آمرا۔ معروض ہوا کہ محاسب اعلیٰ کے اعتراض سے بچنے کے لئے رسید پر ایک آنے کا ٹکٹ چسپاں کیا جائے۔ ٹکٹ لگایا تو معلوم ہوا کہ یہ غلط ٹکٹ تھا، محکمۂ مال کا ٹکٹ ہونا چاہیئے، پھر کسی نے کہا کہ ایک آنے کا نہیں دو آنے کا ٹکٹ لگے گا۔ مجبوراً اپنی جیب سے دو آنے دیئے۔ اس دفتری کارروائی سے طبیعت بدمزہ سی ہو گئی اور ساڑھے چار کروڑ کا لطف نہ آیا۔

"ایسے لاجواب وزیر تم نے کہاں سے حاصل کئے؟" ہم نے پوچھا۔

"وزیرستان سے۔" وہ بولا۔

"اور یہ وزیرآباد کیا ہے؟"

"یہ یونہی ہے۔"

**ایک باکمال بزرگ** قطب الدین خاں جاگیردار کی شادی پر گئے، دولھا کی عجب دُرگت بنی۔ عورتیں پہلے تو اسے برا بھلا کہتی رہیں پھر زدوکوب کرنے لگیں اور وہ تھا کہ چپ چاپ بیٹھا تھا، سوچا کہ اَن بن ہو گئی ہے لیکن معلوم ہوا کہ شادی کی رسمیں ادا ہو رہی ہیں۔ لاحول پڑھی۔

نکاح سے قبل ہم نے . . . . دولھا سے دریافت کیا کہ اس کی آخری خواہش کیا ہے تاکہ پوری کروادی جائے۔ وہیں ایک لنگوٹی پوش بزرگ کو دیکھا کہ لمبا سا عصا ہاتھ میں لئے خاموش بیٹھے ہیں، کسی کو علم نہ تھا کہ یہ رہتے کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ لیکن کہیں شادی ہو تو ضرور آتے ہیں۔ نکاح شروع ہوا تو ذرا قریب آگئے، جب دولھا نے "قبول کیا" کہا تو بزرگ نے ڈنڈا اچھال کر "پھنس گیا" کا نعرہ لگایا اور غائب ہوگئے۔ ہر شادی میں وہ اسی طرح کرتے ہیں۔

تعجب ہے کہ ہند میں ایسے ایسے باکمال بزرگ بھی موجود ہیں۔

## مینا بازاروں کی بھرمار

اب تو مینا بازار ہر ہفتے ہوتا، ملک کے مختلف حصّوں سے خواتین آرائشی سامان خریدنے کے بہانے آتیں، اپنی دختران وغیرہ کو بھی ساتھ لاتیں۔ نہ جانے کس نے اڑا دی تھی کہ یا تو خدانخواستہ ہم ایک اور شادی کریں گے یا برخوردار علی قلی خاں منگنی کرائے گا۔ لیکن ہم خواتین سے دور ہی رہتے، برخوردار علی قلی کو بھی دور دور رکھتے، ہم شادی برائے شادی کے ہرگز قائل نہیں ہیں۔

خواتین سے دُور رہنے کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ ان کے قریب رہ کر ہمیں دیدے مٹکانے، ہاتھ نچانے اور اُنگلی سے ناک چھو کر بات کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ دورانِ گفتگو میں ہمارے منہ سے غیر شعوری طور پر اُف، اُوئی، اللہ، توبہ، ہائے، نگوڑا وغیرہ جیسے کلمات بھی نکل جاتے جس سے بعد میں سخت پشیمانی ہوتی، ہم زیورات، کپڑوں اور لباس وغیرہ کے قصوں میں بھی دلچسپی لینے لگے تھے

ذرا ذرا سی باتوں پر جھنجھلا اُٹھتے، بات بات پر لڑنے کو تیار ہو جاتے۔ چنانچہ جب کسی خاتون نے مینا بازار میں ہم سے حملہ آوری کی وجہ پوچھی تو ہم نے پہلے تو بھرے بازار میں اسے کوسنے دیئے کہ اگر ہم نہ آتے تو کوئی اور آجاتا۔ پھر فائیل منگا کر وہ تمام کانفیڈنشل خطوط دکھائے جو ہندی اُمرا نے وقتاً فوقتاً ہمیں لکھے تھے اور ہمیں حملہ کرنے کا مشورہ دیا تھا (ہماری حملہ آوری کی ایک یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے جو فرمانبردار خاں کو یاد نہ رہی)۔

## جنوبی ہند سے وفد

جنوبی ہند سے وفد برائے نادر یار جنگ بہادر آیا ہم بہادر ضرور ہیں، جنگ کا بھی شوق ہے لیکن یار وغیرہ کسی کے نہیں ہیں۔ انھیں گلہ تھا کہ خیبر سے آنے والے حملہ آور دلی تک آتے ہیں اور وہیں کے ہو رہتے ہیں، جنوب کو بھولے سے بھی نہیں نوازتے۔ ہم چونکہ سیٹل ہونے کے اہم مسئلے پر غور فرما رہے تھے اس لیے معذوری ظاہر کی۔ انھوں نے التجا کی کہ شبیہہ مبارک کی ایک تصویر ہی عنایت فرمائی جاتے تاکہ کیلنڈروں، جنتریوں میں چھپوا سکیں۔ ہندی بادشاہ تصویر اتروانے وقت ہاتھ میں ایک پھول پکڑ کر سونگھتے ہیں ہم نے جدت پیدا کی اور دونوں ہاتھوں میں دو پھول پکڑ کر سونگھے۔

## ایک ترقی یافتہ خاتون

ہمارا اور محمد شاہ کے دربار کی ایک ترقی یافتہ خاتون کا قصہ بہت بڑھا چڑھا کر

بیان کیا گیا ہے، یہ بیان بالکل بے بنیاد ہے کہ ہمیں اس سے لگاؤ تھا۔ دراصل ہمیں تمباکو، شراب، محبت و دیگر منشیات سے بچپن سے نفرت رہی ہے۔ خاتونِ موصوف کو گانے بجانے کا شوق تھا اور ہمیں گانے بجانے سے شغف ہو چلا تھا۔ دربار میں اس نے "تابِ وصل دارم نے طاقتِ جدائی" والی رباعی کچھ ایسے انداز سے گائی کہ یار لوگوں کو شبہ ہوا اور افواہیں اڑنے لگیں۔ شروع شروع میں تو ہمارا خیال اس کی جانب رہا لیکن پھر آلو شناس کے سمجھانے پر سنبھل گئے۔ اس نے بتایا کہ بالائی طبقے میں لڑکیوں کا ایک مدرسۂ فکر ایسا بھی ہے جو چہلیں تو کرتی ہیں نوجوانوں سے اور شادی کرتی ہیں بوڑھے امیروں سے خواہ ان کی پہلی بیویوں کی تعداد کتنی ہی ہو۔ کبھی کبھار بوڑھے کے پروگرام میں شریک ہو گئیں لیکن زیادہ وقت کزنوں کے ساتھ گزارا۔

ایسا کرنے میں وہ اپنے آپ کو اس لیے حق بجانب سمجھتی ہیں کہ نوجوانوں کے پاس روپیہ نہیں ہے اور بوڑھوں کے پاس ہے۔ اور باقی چیزیں آنی جانی ہیں۔

ایک روز ہم چڑ گئے، اس نے ایک غزل گائی جس کے شروع کے بول تھے:

ساٹھویں سال میں قدم آیا زلفِ مشکیں میں پیچ و خم آیا
آمد آمد ہوئی جوانی کی غمزہ و ناز و دلستانی کی

یہاں ساٹھ برس کی عمر میں اکثر لوگ سٹھیا جاتے ہیں، ہم ساٹھ کے نہ تھے مگر سمجھ گئے کہ وار ہم پر ہوا ہے، دیر تک آئینے کے سامنے کھڑے رہے لیکن قطعی رائے قائم نہ کر سکے۔ فرمانبردار خاں سے اپنی شکل و صورت کے متعلق دریافت کیا اس نے حسبِ معمول نہایت گستاخ و مایوس کن جملے کہے۔ طیش میں آکر اُسے دُرّے لگوانے کا قصد کیا۔ پھر خیال آیا کہ فرمانبردار خاں تو پہلے سے ہی دُرّانی ہے، چنانچہ اُسے معاف کیا اور اُلّو شناس کو بُلایا۔ وہ نمک خوار دست بستہ معروض ہُوا کہ روئے پُر نور پر وہ پُر ہیبت جلال طاری ہے کہ نگاہیں اوپر نہیں اُٹھتیں لہٰذا شکل و صورت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس فقرے سے بھی ہماری تسلی نہ ہوئی۔

پھر ہمیں معلوم ہُوا کہ سارے معاملے میں مسز محمد شاہ کا ہاتھ ہے۔ محمد شاہ خود ترقی پسند ہے لہٰذا خاتونِ موصوف میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لیتا رہا ہے، عورتوں کا حسد مشہور ہے، مسز محمد شاہ ہمیں اس عمر میں بے وقوف بنانا چاہتی ہیں کہ ہم اس طرار حسینہ کو اپنے ہمراہ ایران لے جائیں ہم بھانپ گئے اور اس سے دُور دُور رہنے لگے۔ خاتونِ مذکور ہماری بے اعتنائی سے چراغ پا ہو گئی اور ایک جلسے میں ہمارے رجعت پسند ہونے کا اعلان کرکے ہم سے مکمل بائیکاٹ کر دیا۔

خیر، رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔

**جامعۂ فرقانی**

آج صبح ملّا فرقان اللہ بن برہان اللہ کہ مقامی جامعہ فرقانی کا صدر ہے آستاں بوسی کے لیے حاضر ہوا اور ملتمس ہوا کہ جامعہ ہم کو ایک اعزازی سند دے کر عزت افزائی (اپنی) کرنا چاہتا ہے۔ جامعہ میں پورا کورس چھ برس کا ہے بعض فارغ البال اور نیک نفس والدین کے بچے یہ کورس بارہ سال میں کرتے ہیں۔ ان طلبا کو خلیفے کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی بچہ کورس کے اختتام سے پہلے بھاگ جائے تو اس کو صرف علامہ کی سند ملتی ہے، کورس پورا کرلے تو علامۃ الدہر کہلاتا ہے۔ دوسری سندیں مثلاً ابوالبرکات ابوالفضال، ابوالفضیلت عموماً سرکاری حکاموں، جامعہ کے معلّین کے دوستوں اور ہمارے جیسے سیاحوں، تاجروں اور حملہ آوروں کے لیے وقف ہیں عزیزی محمد شاہ دو مرتبہ ابوالبرکات ہے اور تین مرتبہ ابوالفضیلت۔

جامعہ ہر سال چار سو علامۃ الدہر بناتا ہے جو عموماً بیس پچیس روپے ماہوار کے منشی یا کسی تاجر کے منیم بن جاتے ہیں۔ منشی بننے کے کوئی چار پانچ مہینے کے بعد ان کے والدین کو شادی کی (اپنے ہونہار فرزند کی، اپنی نہیں) فکر پڑ جاتی ہے۔ شادی کرتے وقت شکل صورت کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی جاتی (کیونکہ اس ملک میں شکل صورت نہیں ہوتی) صرف روپے پیسے کا خیال رکھا جاتا ہے۔ عجیب تماشا ہے کہ شادی میں لڑکے دلہن کے علاوہ ایک کثیر رقم کی بھی توقع رکھتے ہیں، یہ بھی چاہتے ہیں کہ سسرال والے انھیں اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے سمندر پار بھیج دیں۔

تاکہ وہ خوب دادِ عیش دے سکیں۔ ہمارے خیال میں یہ انتہا درجے کی کم ہمتی ہے تبھی اس ملک میں بیچاری لڑکیوں کی وہ آؤ بھگت نہیں ہوتی جو لڑکوں کی ہوتی ہے۔

**جامعہ میں ہماری تقریر** اعزازی سند کے سلسلے میں ہمیں خواہ مخواہ تقریر کرنی پڑی حالانکہ نہ ہمیں پہلے سے خبردار کیا گیا تھا اور نہ ہم تیار تھے۔ پہلے مُلّا فرمان اللّٰدین برہان اللّٰد نے ہماری ذات کا تعارف یُوں کرایا۔

"حضرات کیسا روزِ سعید جامعہ کی زندگی میں آیا ہے کہ اعلیٰ حضرت نادر شاہ صاحب کی ذاتِ والاصفات کا نزول ہوُا ہے۔ شاہ صاحب کا تعارف محتاجِ بیان نہیں، آپ نے جس سلسلے میں دتّی تشریف لانے کی زحمت گوارا کی ہے وہ اب واضح ہو چکا ہے۔ سنا ہے کہ جناب خاں صاحب بین الاقوامی سطح پر ایرانی اور ہندوستانی روپے کی قیمت چکانے آئے ہیں۔ آپ کی علمیّت شبیہ مبارک سے ظاہر ہے۔ آغا صاحب پہلوی زبان کے ہر پہلو سے ماہر ہیں، شہنشاہی سے پہلے آپ کا شغل ــ خیر جانے دیجیے ــ ان کی تقریر کو خاموشی سے سُنا جائے کیونکہ آپ شہنشاہ ہیں۔ اور آپ کو اپنی پھوپھی صاحبہ مدظلہا سے بھی ملاقات مقصود تھی جو اتفاق سے اس ملک میں مقیم نہیں ہیں لیکن ہماری شامتِ اعمال ــ معاف کیجیے ــ اچھا تو حضرات ــ مولانا نادر شاہ صاحب!

ہم کو اس بدتمیز ملّا پر سخت غصہ آیا کہ ہمارے نیٹیں کبھی آغا کہا ہے تو کبھی مولینا، ایک بات پر قائم نہیں رہتا۔ یہ شخص دانستہ طور پر ہمارا تمسخر اڑا تا ہے۔ اچھا اسے سمجھیں گے۔

ہم تالیوں کے شور میں اُٹھے اور فرمایا۔ ”پیارے اطفال، معلّمین حضرات، و پرنسپل مُلّا الیف اُللہ، آپ نے ہم کو یہاں مدعو کر کے جامعہ کی جو عزت افزائی کی ہے اس کے لیے ہم آپ سب کو ممنون ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ آپ کو یہ موقعے روز روز کہاں مّیسر ہوتے ہیں کہ ہم سا شہنشاہ آپ کو اپنی خوش کلامی سے مستفیض کرے۔ اول تو ہمیں آپ حضرات کی زبوں صحت پر تعجب ہوتا ہے، رونا بھی آتا ہے ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ یہاں کوئی دو ہزار کی تعداد میں بیٹھے ہیں بخدا ہمیں آپ ڈیڑھ سو کے قریب لگ رہے ہیں۔ پرسوں دربار میں کوئی کاریگر بیس گز ڈھاکے کی ململ ایک انگوٹھی میں سے گذار رہا تھا، دوسری طرف سے کپڑے کو جھٹکے سے کھینچا گیا تو کاریگر خود بھی انگوٹھی میں سے گذر گیا۔ اس قدر دھان پان انسان ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھے، یہ آپ کی غذا کا قصور ہے یا آب و ہوا کا۔ آپ کے چہروں پر کچھ ایسا جمود اور بے حسی ہر وقت رہتی ہے جیسے آپ ہر چیز سے مطمئن ہیں، آپ جی کیا رہے ہیں زندگی پر احسان کر رہے ہیں۔ آپ کے قبرستانوں میں کتبے تک غلط ہیں (ہم نے بلیک بورڈ پر لکھنا شروع کیا) مثلاً شیخ خدا بخش مرحوم

فلاں سنہ میں پیدا ہوتے

ساٹھ برس کی عمر میں انتقال فرما گئے۔

یہ غلط ہے اس کی جگہ یوں ہونا چاہیے ۔

شیخ خدا بخش مرحوم

فلاں سنہ میں پیدا ہوئے

پچیس سال کی عمر میں انتقال فرمایا

ساٹھ برس کی عمر میں دفن ہوئے ۔

حضرات و اطفال ہم ایران سے بڑی بڑی امیدیں لے کر چلے تھے، خیال تھا کہ دشمن کی بوٹی بوٹی اڑا دیں گے، کابل میں آئے تو سوچا انھیں زد و کوب کریں گے، خیبر پہنچے تو ارادہ ہوا کہ ان سے کشتی لڑیں گے۔ لیکن یہاں کی آب و ہوا کو اس درجہ سکون پرور اور باشندوں کو اس حد تک با اخلاق، وضعدار، نحیف و نزار پایا کہ دن بھر قیلولہ کرنے اور بازاری لوگوں سے گپیں اڑانے کا شغل اختیار کر لیا ہے یہاں کی آب و ہوا کا اثر نہایت صلح جویانہ ہے۔ یہ خون کو بھی ٹھنڈا کرتی ہے۔ اب ہم سوچتے ہیں کہ دشمن نے ہمارا کیا بگاڑا ہے۔ مفت کی لڑائی بھڑائی سے آخر فائدہ؟ سنا ہے کہ جنوبی اور مشرقی ہند کی آب و ہوا اور بھی گئی گذری ہے لیکن ہم اور آگے نہیں جائیں گے۔ ہم آپ کو مبارک باد دیتے ہیں آپ کی روایات پر۔ آپ کی قومی روایات بے حد شاندار ہیں، آپ نے کسی اجنبی کو مایوس نہیں کیا، کئی سو سال سے آپ کا شغل بیرونی لوگوں سے حکومت کروانا ہے۔ اور تو اور آپ نے خاندانِ غلاماں سے بھی حکومت کروائی ہے اور وسعتِ قلب کا ثبوت دیا ہے۔ آپ کو ایک دیگر

کی نقل کرنے میں خاص مہارت حاصل ہے یعنی آپ بھیڑ چال چلتے ہیں۔ (یہاں ہم سٹیج سے نیچے اترے اور بھیڑ چال چل کر دکھائی)

آپ کے ادب و موسیقی کے چرچے ہم نے پہاڑ کے اُس پار سُنے تھے، آپ کے ہاں تقریباً ہر شخص شعر کہتا ہے اور تخلص کرتا ہے۔ یہ آب و ہوا اور یہ صحت جیسی کہ آپ کی ہے شعر و شاعری کے لیے نہایت ساز گار ہے، آپ کی موسیقی کے کیا کہنے، پچھلے ہفتے لال قلعے میں چار پانچ آدمیوں کو قوالی گاتے سنا، وہ لوگ خوب سر دھنتے اور وجد میں آ کر تالیاں بجاتے۔ یہ لوگ بے حد دانا ہیں گاتے وقت ایک کان پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں، غالباً دوسرے کان سے جسے کھلا چھوڑتے ہیں ضرور بہرے ہو جاتے ہوں گے۔ پھر ایک شخص کو دیکھا کہ گانے کے بہانے طرح طرح سے ہمارا منہ چڑاتا تھا، ہماری طرف عجیب و غریب اشارے کرتا تھا، ہمیں غیظ و غضب آیا ہی چاہتا تھا کہ ہمیں بتایا گیا کہ پکے راگ گاتا ہے، سنا ہے کہ آپ کے ہاں ہر وقت کا راگ جدا جدا ہوتا ہے۔ آپ کی موسیقی کا مطالعہ فرما کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہاں صبح صبح ہر شخص بیزار ہوتا ہے، غالباً رات کو آپ زیادہ نشہ کر جاتے ہیں کئی مرتبہ یہ ہوا کہ علی الصبح مسرور اُٹھے لیکن وقت کے راگ نے غمگین کر دیا، رات کو عبادت کا قصد کر رہے تھے کہ وقت کے راگ سے متاثر ہو کر رنگ رلیاں شروع کر دیں۔

حضرات! جب ہم پشاور سے آگے آئے تو ہمیں بتایا گیا کہ سکندر یونانی کے زمانے میں یہاں بہت بڑا جنگل تھا، مبارک ہو کہ آپ نے بتدریج جنگلات کو صاف

کر دیا ہے۔ آپ کے نزدیک درخت کا صحیح مقصد اس کو کاٹ ڈالنا ہے۔ ہم نے گاؤں میں بچوں کو چھوٹی چھوٹی کلہاڑیاں لیے نفریحاً درخت کاٹتے دیکھا ہے۔"

ہماری تقریر جو کہ بے ربط تھی مُلّا فرقان اللہ کی گستاخی کا صحیح جواب تھی، ہم دیر تک بولتے رہے۔ ہمیں یاد نہیں کہ ہم نے اور کیا کچھ کہا۔ اچانک چند بد تمیز طلبا کی جمائیوں اور خراٹوں نے ہمیں چونکا دیا اور ہم بیٹھ گئے

## سوالات اور جوابات

مُلّا فرقان نے اُٹھ کر ہمارا شکریہ ادا کیا حاضرین سے مخاطب ہو کر بولا "نادر شاہ سے سوال پوچھے جائیں تو آپ ان کا مناسب جواب دیں گے ۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر ایک کونے میں کھُسر پھُسر ہونے لگی "کیا آپ ملوکیت پسند ہیں؟" پوچھا گیا۔

"ہم طوائف الملوکیت پسند ہیں ۔" ہم نے جواب دیا۔

"تو گویا آپ شہنشاہ پسند ہوئے ۔" کسی اور نے پوچھا۔

"شہنشاہ پسند؟" ہم نے مسکرا کر کہا "ہم خود شہنشاہ ہیں۔"

"کیا آپ کے خیال میں شہنشاہی بیکار سی چیز نہیں ۔ خصوصاً جب ہم سب کے سب ایک جیسے ہیں۔" ایک برخوردار بولے ۔

"ہاں" ہم نے فرمایا "جسمانی لحاظ سے تو ایک جیسے ہیں لیکن اُوپر والی منزل میں (ہم نے اپنے سر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا) فرق ہوتا ہے۔"

مزید حقائق

"صاف صاف بتائیے قبلہ آپ دائیں جانب ہیں یا بائیں جانب۔"

یہ سوال ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ہم نے اسی طرح مسکراتے ہوئے (منفرد کو ہمیشہ مسکراتے رہنا چاہیے) جواب دیا "ہم شہباز خاں آلو شناس کی بائیں جانب ہیں اور مُلّا فرقان اللہ کی دائیں جانب ــــ"

"کیا آپ ایران سے آتے ہیں ــــ؟"

ایسے آسان سوال پر ہم بڑے خوش ہوئے "ہاں ہاں برخوردار اور کیا تم ہندوستان میں رہتے ہو؟"

"شہنشاہی سے پہلے آپ کا ذریعۂ معاش کیا تھا ــــ؟" ایک طرف سے آواز آئی۔

اگرچہ ہم نے کافی صبر و تحمل دکھایا تھا لیکن اس سوال نے ہمیں سیخ پا کر دیا ہماری آنکھوں میں خون اترنا شروع ہوا، میز پر ہمارا مکّہ اتنے زور سے پڑا کہ میز ٹوٹ گئی۔منہ کا جھاگ مُلّا فرقان اللہ پر گرا جس نے جست لگائی اور دوسری میز پر چڑھ گیا۔ہڑبونگ سی مچ گئی۔لوگ اپنی پگڑیاں چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے ہمیں یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ سب اسی مُلّا کی شرارت ہے، پہلے ہمیں خفا کر کے ایسی جلی کٹی تقریر کروانا نوازنا مُلّا فرقان اللہ کو سوال پوچھنے کا شوشہ جان بوجھ کر چھوڑنا۔ اگلے روز ہم نے اس کی مالی حالت کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں۔پتہ چلا کہ مُلّائی کا ڈھونگ ہے۔خوب عیش و عشرت

کی زندگی بسر کرتا ہے۔ چنانچہ ہم نے عزیزی محمد شاہ سے کہا کہ اس کی خدمات کے صلے میں اسے ایک ہاتھی انعام میں دیا جائے۔ کچھ عرصے کے بعد آدمی بھیج کر پتا کرایا تو معلوم ہوا کہ شاہی ہاتھی کے خورد و نوش پر نصف سے زائد اثاثہ نیلام ہو چکا ہے۔ ہم نے دوبارہ دربار میں بلوا کر عزت افزائی کے بہانے ایک اور ہاتھی (جو سفید تھا) مرحمت فرمایا۔ ہفتے عشرے کے انتظار کے بعد خبر ملی کہ مُلّا فرقان اللہ نے خودکشی کر لی اور کیفرِ کردار کو پہنچا۔ ہمارے ساتھ کوئی جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔

## اہلِ ہند کو گستاخیوں کا صلہ

ہم نے وہ تقریر کیا کی مصیبت ہی مول لے لی، دنیا میں سچ بولنا بھی جرم ہے۔ ذرا سی تنقید بھی ان لوگوں سے برداشت نہیں ہوتی۔ احتجاج ہو رہے ہیں، جلوس نکل رہے ہیں، پوسٹر لگ رہے ہیں۔ آج تو اہلِ ہند کی گستاخی حد سے بڑھ گئی، گذشتہ چند راتیں عزیزی محمد شاہ کی دعوتوں میں جاگ کر گذارنا پڑیں۔ چنانچہ طبیعت کچھ گراں ہو گئی، شاہی حکیم معاینہ کرنے آئے، اتنے میں نہ جانے کس احمق نے شہر میں یہ اڑا دی کہ نعوذ باللہ ہم اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ لوگوں نے اس خبر کو نہ صرف سچ مان لیا بلکہ اسی سلسلے میں جامع مسجد کے پاس فقراء کو جلیبیاں تقسیم کی گئیں۔ اس کی شہادت یُوں ہوئی کہ شہباز خاں اُلّو شناس کو جو اس وقت جامع مسجد کے قریب سے گذر رہا تھا فقیر سمجھ کر کچھ جلیبیاں دی گئیں جنھیں وہ بارگاہِ دولت میں لے کر

حاضر ہوا، ہم نے ان کو چکھا اور نہایت لذیذ پاکر اسے دوبارہ جامع مسجد کی طرف بھیجا۔

ہم دو ہزار ایرانی سپاہی لال قلعے میں رکھا کرتے تاکہ بوقتِ ضرورت کام آسکیں، مفسدوں نے اُن کے متعلق یہ مشہور کر دیا کہ ہم انھیں ہر شام مقفل کر دیتے ہیں کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائیں۔ ان سپاہیوں کو قلعے کے اندر چھیڑا گیا، ہمارے کچھ سپاہی چاندنی چوک سے گزر رہے تھے ان پر آوازے کسے گئے اور ٹماٹر شلجم وغیرہ پھینکے گئے، ایسی کئی واردات کی اطلاع ہمیں ملی، ہم اسپِ نمرود (یہ خطاب ہمارا دیا ہوا تھا) پر سوار ہو کر شہر میں گئے تاکہ رعایا کو شرفِ دیدار بخش کر ان کی غلط فہمی دور کرا دیں۔ اب یہ مشہور ہو گیا کہ اصلی نادر شاہ تو بہشت کو سدھار چکے ہیں۔ یہ کوئی اور شخص ہے جو بہروپ بھرے ہوئے ہے۔ ہم تختِ طاؤس پر بیٹھے تھے کہ دُور سے "نادر شاہ مردہ باد" کے نعرے سنائی دیتے، اسی وقت غیض و غضب میں تخت سے چھلانگ لگا کر اپنے دو ہزار سپاہیوں کو کھولا اور تلوار کھینچ کر حکم دیا کہ تلوار کے دستوں سے لاٹھی چارج کر دو۔" یہ تھا وہ "قتلِ عام"۔ ہم چاہتے تو باقاعدہ تلواریں استعمال کرا سکتے تھے۔ گرمی سخت تھی ہم قمیض اُتار کر موتی مسجد میں حوض کے کنارے ننگی تلوار ہاتھ میں لیے بیٹھے رہے۔

**قتلِ عام** چنانچہ صاحب قتلِ عام شروع ہوا، ہمارے سپاہیوں نے فقط اہلِ شہر کو زدوکوب کیا تھا اس کے باوجود لاتعداد لوگوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اگلے روز ایک بزرگ آنکھوں میں آنسو بھرے آئے اور دردناک

ہیچے ہیں گویا ہوتے — کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کشی —

یہ شعر ہم نے پہلے سن رکھا تھا، چنانچہ ہم نے مسکرا کر دوسرا مصرع —
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی، سنا کر ظاہر کر دیا کہ ہمیں پرانی فرسودہ شاعری زیادہ متاثر نہیں کر سکتی۔ ہمیں شاعری کی جدید قدروں کا قدر دان پا کر انھوں نے جیب سے کاغذ کا پرزہ نکال کر ایک آزاد نظم پڑھی جو ہماری سمجھ میں بالکل نہ آئی۔ سوائے ایک مصرعے کے جس میں ہمیں تلوار نیام میں ڈالنے کو کہا گیا تھا۔ رات بھر جاگتے رہے تھے گرمی زیادہ تھی، ہمارا دل پیسیج اٹھا بغلگیر ہونے کی نیت سے آگے بڑھے کہ بزرگ جلدی سے آداب بجا کر جھمپٹ ہوتے۔ خیر، اب تلوار کو میان میں ڈالنے کی کوشش جو کرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ ہمارے ہاتھ میں تو شہباز خاں کی تلوار تھی، ہماری تلوار تو پہلے ہی میان میں تھی۔ گویا کہ سارا قتلِ عام ہی غلط ہوا تھا۔ ہم نے خود امنادی کرا دی کہ پہلا قتلِ عام غلط ہوا ہے بلکہ ہوا ہی نہیں کیونکہ تلوار تو میان سے ذرا نہیں نکلی۔ چنانچہ اس مرتبہ دوسرا صحیح قتلِ عام شروع ہوا جو کافی کامیاب رہا۔ دراصل فریقین کو کافی ریہرسل مل چکی تھی۔ پہلے ارادہ تھا کہ اس کے بعد ایک مختصر سا قتلِ خاص بھی کرائیں جو امراء کے لیے ہو۔ پھر سوچا اہلِ دلی اس قسم کے تماشوں کے عادی ہو چکے ہیں، تیمور کا قتلِ عام تین دن رات تک ہوتا رہا تھا بھلا ہمیں یہ کب خاطر میں لائیں گے۔

شام کو وہی بزرگ آئے ایک اور آزاد نظم سنائی (جو ہماری سمجھ میں بالکل

نہ آئی) اور معافی کے خواستگار ہوئے، ہم بھی مسجد میں اکیلے بیٹھے بیٹھے تھک چکے تھے مسکرا کر معاف فرمایا اور ازراہِ تلطف انھیں بغلگیری سے سرفراز فرمایا، وہ فوراً بیہوش ہوگئے، جب ہوش میں آئے تو پسلیوں میں درد کی شکایت کرتے تھے۔ پتہ نہیں کیوں۔ شاید ہماری بغلگیری کا نتیجہ ہو۔ آئندہ محتاط رہیں گے انشاء اللہ۔ باری تعالیٰ کارساز ہے۔

**ہم پر کمبل ڈلوانے کی کوشش** شام کو دریائے جمنا کے کنارے مچھلی پکڑنے کی نیت سے بیٹھے تھے، مچھلیاں تھیں کہ جلالِ شاہی سے قریب نہ ٹھٹکتی تھیں، اندھیرا ہو چلا تھا، اچانک ہم نے اپنے اُوپر کمبل کا دباؤ محسوس فرمایا، سوچا کہ کوئی ہمارا پرستار ہے جو خنکی کا خیال کرتے ہوتے گرم کپڑا لایا ہے، چنانچہ خاموش بیٹھے رہے۔ لیکن ہمیں بالکل ڈھانپ دیا گیا، ہمارا دم گھٹنے لگا، گستاخ آوازیں سنیں تو معلوم ہوا کہ کوئی شرارت ہے۔ ہڑبڑا کر اُٹھے دونوں لفنگوں کو پکڑ کر بغلوں میں دبایا ہی تھا کہ انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہہ کر سعادتِ دارین پائی۔ نیا ملک ہے، خبردار رہنا چاہیے۔

**واپسی کا قصد** ایک کباڑیے کی دکان پر پوستین دیکھی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے دفرمانبردار خاں کی آنکھوں میں) ہم کبھی پوستین کو دیکھتے تھے اور کبھی اپنے چوڑی دار پاجامے اور جالی دار کرتے کو۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ پوستین ہماری ہی تھی، اس قدر تنگ ہو چکی تھی کہ کوشش کرنے کے باوجود نہ پہن سکے، پہلے سے ہمارا وزن کافی بڑھ گیا تھا۔ دن بھر طرح طرح کے خیالات

دل میں آتے رہے۔ دلّی کے قیام نے ہمیں کتنا تبدیل کر دیا ہے، ہم موٹے ہو گئے ہیں، رات کو خرّاٹے لیتے ہیں، صبح کی چاء اور تمباکو نوشی کے بغیر بستر سے نہیں اٹھتے، قیلولے کی عادت قلیچہ ہمیں شام تک برقرار رکھتی ہے، ہماری رنگت سنولاتی جا رہی ہے، اگرچہ ہندی شاعری میں سانولا، سنوریا، کالیا وغیرہ کو پسند کیا گیا ہے۔ تاہم یہ پسندیدگی تسلی بخش نہیں کیونکہ ہندی شاعری ہے تو عورت کی زبانی لیکن شاعر سارے مرد ہیں۔ اور پھر ہم نے جنوبی ہند کے باشندوں کو بھی دیکھ پایا تھا جن کے آباؤاجداد کبھی اچھے بھلے ہوں گے۔ ادھر ملک میں عجیب دھما چوکڑی مچی ہوئی ہے۔ ہماری تقریر اور قتلِ عام سے پبلک دشمن بن گئی ہے۔ ہر روز کہیں بھوک ہڑتال ہو رہی ہے تو کہیں ستیہ گرہ۔ کمبل ڈالنے کے حادثے نے ہمارا موڈ قطعی طور پہ خراب کر دیا ہے۔ چنانچہ سٹیبل ہونے کے خیال پر لعنت بھیجی اور کوچ کا مصمم ارادہ کر لیا

## ہمارا دلّی سے تشریف لے جانے کا حال

خدا کے فضل سے زادِ راہ کافی تھا کہ راستے میں اخراجات بھی کافی ہوتے ہیں۔ ہم نے ازراہ مروّت محمد شاہ کو اجازت دے دی کہ اگر اس کی نظر میں کوئی ایسی چیز ہو جس کو ہم بطورِ تحفہ لے جا سکتے ہوں اور غلطی سے یاد نہ رہی ہو تو بے تکلف ساتھ باندھ دے۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے تھے اور بار بار کہتے تھے کہ لال قلعہ اب خالی خالی سا معلوم ہو رہا ہے، حقیقت یہ تھی کہ لال قلعہ ہمیں بھی خالی خالی سا معلوم ہو رہا تھا۔

اسپ نمرود پر سوار ہو کر وہ در و دیوار پر حسرت کی نظر ڈال ہی رہے تھے کہ عین چوراہے میں گھوڑے سے نیچے آرہے۔ اس بے ایمان گھوڑے کو ہم نے زیادہ منہ چڑھالیا ہے، تعزیری طور پر اہلِ ہند کو واپس دے دیا اور عزیزی محمد شاہ سلمہٗ سے فرمایا کہ اس انسان ناشناس کو خطاب سے محروم کر کے تانگے میں جتوایا جائے۔

## کابل میں والئ کابل سے نجات

والئ کابل ہماری خدمت میں ملتمس ہوا کہ آپ ہند سے ہمارے لیے جو تحفے لائے ہیں وہ دیتے جائیں ورنہ مروّت سے بعید ہوگا۔ ہم نے سمجھایا کہ یہ ہزار اونٹوں پر لدے ہوئے تحائف جو وہ دیکھ رہا ہے ہمارے پیارے عزیز محمد شاہ کی نشانیاں ہیں جن سے ہم مرتے دم تک جدا نہیں ہو سکتے، البتہ کچھ پوستینیں، دُنبے یا گلقند درکار ہو تو وہ دے سکتے ہیں۔ والئ کابل راضی نہ ہوتا تھا۔ عجب ہونق آدمی ہے، دنیاوی دولت کی ہوس اس کو بہت ہے بہتیرا سمجھایا کہ آدمی کو خدا سے لو لگانی چاہیے، دنیا آنی جانی ہے۔ شیخ بڈھا شیخوپوری کی مثال پیش کی کہ دنیاداری سے مستعفی ہو کر تارک الدنیا بنے ہوئے ہیں۔ اس پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ گستاخ بولا۔ آپ خود تارک الدنیا کیوں نہیں ہو جاتے۔ بہت کہا کہ ہمارے حالات مختلف ہیں۔ وقت آنے پر تارک الدنیا بھی بن کر دکھا دیں گے۔ جب نہ مانا تو ہم نے ٹالنے کو فرمایا کہ تو خود سیاحت پر کیوں نہیں جاتا۔ آدمی سیانا تھا جان گیا کہ پچھلے چالیس پچاس سال کی دولت تو ہم سمیٹ چکے ہیں اب وہ ہند گیا تو کر کری ہوگی۔ کچھ ہاتھ نہ آئیگا۔ آخر

از راہِ پرورش اس کو پانچ شتر تازی۔ چھ اسپ باسی، دو سو مقامی مینڈھے رد بنے، دو من گلقند، لال قلعے کا کچھ بوسیدہ فرنیچر، نقرئی پنجرے میں بند ایک ہندی کوا دے کر سرفراز کیا اور اس حریص لمبو نچوڑ سے رہائی پائی۔

ختم شد

× × × × × × × × ×

## تتمہ

جس بات کا دیر سے خدشہ تھا آج وہی ہو کر رہی۔

**ہمارا خلد میں نزول** چند نابکاروں نے تنہا پا کر گھیر لیا اور ہمارا کام تمام کیا۔ اِنّا للہ و انّا الیہ راجعون، ہند سے ایران واپس پہنچ کر ہم اس نئی سیاحت پر سوئے عراق نکل کھڑے ہوتے تھے۔ ہمیں اپنی ناگہاں جوانامرگ پر بیحد قلق ہے کیونکہ اس میں مشیّتِ ایزدی ہرگز نہ تھی، اگر ہم فرمانبردار خاں کا کہا مان لیتے اور اتنی رات گئے تنہا باہر نہ نکلتے تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا، خیر اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

ع عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

دیکھئے آنجہانی بنتے ہیں یا خلد آشیانی یا کچھ اور۔ ہمارے متعلق یہاں طرح طرح کی مایوس کن افواہیں اڑ رہی ہیں۔

# یہ ریڈیو روم تھا

"کہاں سے آنا ہوا ۔ ؟"

"سرزمینِ پاک سکاٹ لینڈ سے آ رہا ہوں جہاں کے باشندوں کی دریادلی کے قصّے دنیا بھر میں مشہور رہیں۔"

"کیسے آمد ہوئی ؟"

"بذریعہ ریل آیا، ارادہ جہاز سے آنے کا تھا لیکن جہاز نکل چکا تھا، دراصل یہ آمد نہیں آورد تھی۔"

"ویسے روم کس سلسلے میں آنا ہُوا ؟"

"مثنوی مولینا روم سے متاثر ہُوا، اُدھر داناؤں سے سن رکھا تھا کہ سب سڑکیں

روم پہنچتی ہیں، چنانچہ ایک سڑک اختیار کی اور اپنے تئیں روم میں پایا۔ میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں ـــ"

"کب تک قیام ہوگا؟"

"ارادہ تو دو چار روز ٹھہرنے کا تھا لیکن اگر زیادہ تنگ کیا گیا تو شاید آج شام ہی کو ہجرت کر جاؤں۔"

"روم میں کیا کچھ کیا؟"

"وہی کیا جو رومن کرتے ہیں۔ لیکن بڑا ہوا اطالوی زبان کا، میں اطالیہ آ چکا لیکن زبان اب تک نہیں آئی۔ کچھ کام رومنوں کے اصرار پہ کرنے پڑے۔"

"مثلاً"

"مثلاً ایک پار کر ۵۱ ایک ہزار لیرے میں خریدنا پڑا، حالانکہ آجکل ۵۲ ہے"

"یہ تو بہت سستا ملا، ہزار لیرے یعنی تقریباً گیارہ شلنگ۔"

"مگر وہ قلم صرف دکھاوے کا ہے، لکھنے لکھانے سے منکر ہے۔"

"کچھ خرید و فروخت کی ـــ؟"

"خرید تو کی، لیکن شکر ہے کہ ابھی تک فروخت کی نوبت نہیں پہنچی۔"

"آپ کو کرنسی کی سمجھ آ گئی؟ ایک پاؤنڈ کے سترہ سو لیرے ہوتے ہیں۔"

"مجھے تو یہ پتہ ہے کہ چند ہی منٹوں میں نوٹوں کے لیرے لیرے ہو جاتے ہیں۔"

"روم میں آپ نے کیا کچھ دیکھا؟"

"وہی دیکھا جو گائیڈ نے دکھایا، گائیڈ جو کچھ دکھائے دیکھنا اور پسند کرنا پڑتا ہے، یوں بھی ہوا کہ گائیڈ دہنی طرف کے گن گا رہا ہے، لوگ بائیں طرف دیکھ رہے ہیں اور میں سامنے دیکھ رہا ہوں۔ نہ جانے ابھی اور کیا کچھ دیکھنا ہے ــــ"

"آپ کو آرٹ کا شوق تو ہوگا؟"

"تھا۔ لیکن یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ مائیکل اینجلو اور ڈاونچی کا انتقال ہو چکا ہے"

"یہ کیوں ــ؟"

معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے ساری اٹلی میں صرف یہی دو حضرات رہتے تھے۔ ہر جگہ، ہر چیز، ملک کا ہر حصّہ انہی نے ترتیب دیا، فلارنس سارے کا سارا انھوں نے بنایا ہے۔ روم کا تہائی حصہ، میلان کا نصف حصّہ، بقیہ شہر ان کے شاگردوں نے بنائے ہیں۔ جن شہروں میں یہ نہیں پہنچ سکے انھیں بھی تعمیر کرنے کا قصد رکھتے تھے لیکن افسوس کہ زندگی نے وفا نہ کی۔"

"کلیسائے پطرس دیکھا ــــ؟"

"پطرس صاحب آجکل روم میں ہیں کیا؟"

"جی نہیں ــــ سینٹ پیٹر کا گرجا ــــ"

"اچھا وہ ــــ تو انگریزی میں بتائیے نا ــــ وہ تو آج صبح دیکھا تھا، بڑی اونچی عمارت ہے، وہیں کسی زمانے میں مذہبی دیوانوں نے گنبد سے چھلانگ لگا کر خودکشی

کا فیشن شروع کیا تھا۔ میرے خیال میں پہلے ان عقیدت مندوں نے بخشش کی دعائیں مانگی ہوں گی، جب خاطر خواہ جواب نہ ملا تو سوچا ہو گا کہ اب انتظار فضول ہے'
وہ اُونچے اُونچے جنگلے بھی دیکھے جو اس رسم کو روکنے کے لیے اُوپر لگائے گئے ہیں۔ اب اگر کوئی ضرورت مند خودکشی کرنا چاہے تو پہلے جیسی آسانی نہیں رہی۔ یہ کیسی دنیا ہے کہ انسان اطمینان سے خودکشی بھی نہیں کر سکتا۔ اتنے اُونچے جنگلے نہیں ہونے چاہئیں، زیادہ سے زیادہ یہ کرتے کہ نوٹس لگا دیتے ۔۔۔ کہ یہاں خودکشی کرنا منع ہے ۔۔۔'

"ہوں ۔۔۔! تو اور کہاں کہاں کی سیر کی ۔۔۔؟"

'چڑیا گھر دیکھا، جہاں چڑیا کے علاوہ دیگر پرندے تھے' پرندوں کے علاوہ جانور بھی تھے اور یہ سب بڑے غور سے انسانوں کو دیکھ رہے تھے۔ واٹیکن کے میوزیم میں ورجل اور دانتے کے مسودات دیکھے جنھیں کانپ بڑی حفاظت سے واپس رکھ گیا تھا، وہاں کولمبس کا نقشہ بھی تھا جس میں یورپ تو ٹھیک طرح بنایا ہے لیکن باقی دنیا کا حدود اربعہ کچھ عجیب سا ہے، دراصل کولمبس کا عقیدہ تھا کہ جب تک انسان ایک ایک ملک کو خود دریافت نہ کر لے نقشہ بنانا فضول ہے"

"اور مائیکل اینجلو کا تراشا ہوا حضرت موسیٰ کا مجسّمہ؟"

"خوب مجسّمہ ہے! گائیڈ کا وہ فقرہ نہیں بھولتا کہ اینجلو نے مجسّمہ مکمل کر کے ہتھوڑی سے گھٹنے پر ضرب لگائی ۔۔۔ مجسّمے کے گھٹنے پر ۔۔۔ اور نعرہ لگایا کہ بولتے

کیوں نہیں تم ہی تو مکمل ترین موسیٰ ہو۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا، اُن کی اس حرکت سے پتھر پر خواہ مخواہ نشان پڑ گیا۔"

"سیزروں کے روم کی سیر کی۔۔؟"

"جی ہاں پرانا روم دیکھا، وہ مقام جہاں سیزر کو قتل کیا گیا، جہاں مارک انطنی نے اپنی شہرۂ آفاق تقریر کی جسے شیکسپیئر نے سن کر وہیں حرف بحرف نقل کر لیا۔ کولوزیم جو کولوسل ہے، جہاں انسان اور حیوان آپس میں لڑا کرتے تھے، یہ لڑائی اب بھی ہوتی ہے۔ سنا ہے وہاں ایک قیدی نے شیر کے کان میں کچھ کہہ کر اپنی جان بچا لی تھی۔"

"اُس نے کیا کہا تھا؟"

"یہی کہ اگر آپ نے مجھے کھا لیا تو ڈنر کے بعد مجمع کے سامنے آپ کو تقریر کرنی پڑے گی۔"

"مارکس آری لیئس کا مجسمہ تو ضرور دیکھا ہوگا۔"

"جی ہاں! آپ نے تاثراتِ مارکس آری لیئس پڑھی؟ نہایت لاجواب کتاب ہے۔ سنا ہے کہ آپ بڑے متقی، پرہیز گار، خداترس فلاسفر و من بادشاہ تھے جب فرصت ملتی چند عیسائیوں کو شیروں کے سامنے پھنکوا کر کتاب لکھنی شروع کر دیتے، جب تحریریں بے جان اور پھیکی معلوم ہونے لگتیں تو چند اور عیسائیوں کو چند اور شیروں کے سامنے پھنکوا کر جلدی سے پھر لکھنا شروع کر دیتے ۔۔۔ پیارا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

کولوزیم کے سامنے نیرو کے محل کے کھنڈرات ہیں۔ گائیڈ نے بڑے وثوق سے بتایا کہ روم کو دیا سلائی دکھا کر وہ بھلا آدمی وائیلن بجا رہا تھا، گائیڈ کے لہجے سے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود موقع پر موجود تھا۔ حالانکہ وائیلن کا اس زمانے میں نام و نشان تک نہ تھا۔"

"نہیں صاحب یہ بات تو ضرب المثل ہے، کیسے غلط ہو سکتی ہے۔"

"تو پھر ممکن ہے کہ بنسری بجا رہا ہو یا نفیری، مگر وائیلن ہرگز نہیں بجا سکتا۔"

"آپ نے ٹریوی کا وہ چشمہ دیکھا جہاں لوگ پانی میں سکّے پھینک کر دعا مانگتے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"آپ نے کیا مانگا؟"

"میں نے پانی میں سکّہ پھینک کر کہا کہ کاش کہ میں یہاں پہلے آیا ہوتا۔"

"یہاں کی آب و ہوا کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

"آب تو یہاں بوتلوں میں ملتا ہے جو سوڈے واٹر سے کسی طرح کم نہیں، ہوا میں سکون اور ٹھہراؤ ہے، چنانچہ چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی، پر عمل پیرا ہونا سخت مشکل ہے۔"

"اور غذا ۔۔۔؟"

"غذا میں غذائیت ضرورت سے زیادہ ہے اور باشندے ماشاء اللہ خوش خوراک ہیں ۔"

"روم تک سفر کیسا رہا ۔۔۔ بہت کچھ دیکھا ہوگا۔"

"راستے میں نظارے ایسے سہانے تھے کہ کچھ اور دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ PISA کے جھکے ہوئے مینار کو دیکھ کر افسوس تو ہُوا مگر اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔ کششِ ثقل کے متعلّق جو شبہات تھے وہ اور قوی ہو گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مینار اب گرا، اب گرا، دن بھر میں وہاں رہا لیکن مینار نہیں گرا ـــ"

"ماہرین نے اس پر کتابیں لکھی ہیں"

"ماہرین تو ہمیشہ بتنگڑ میں بات پیدا کرتے ہیں۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ اس کے معمار نا تجربہ کار تھے کسی نے دل لگا کر کام نہیں کیا۔ ٹھیکیدار نے پتھّر اور مسالہ بھی گھٹیا کو الٹی کا لگایا، ورنہ دلّی میں قطب صاحب کی لاٹھ اس سے کہیں بلند ہے اور بالکل جوں کی توں ہے۔ کششِ ثقل بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکی"

"اٹلی آنے سے پہلے آپ نے کہاں کہاں کی سیر کی؟"

"سوئٹزرلینڈ اور فرانس کی۔ NICE میں پھولوں کی جنگ میں شمولیت کی، لوگوں نے پھول مار مار کر ایک دوسرے کا بھُرکس نکال دیا۔ یہ حالت ہوئی کہ اگلے دن سڑکوں پر چلنا محال تھا ـــ"

"اور مانٹی کارلو ـــ؟"

"پیشتر اس کے کہ آپ وہاں کے قمار خانے کے متعلّق پوچھیں میں یہ بتا دوں کہ میں وہاں صرف عبرت حاصل کرنے گیا تھا"

"پیرس کیسا لگا؟"

"پتہ نہیں پیرس کے مضافات میں مجھے گوجرانوالہ اور خان پور کیوں یاد آئے۔ لوگ تہمد نما چیزیں باندھے موڑھوں پر بیٹھے حقہ سا پی رہے تھے، لیکن پیرس بہت مہنگا ہے، ایک تو وہاں بخشیش بہت مانگتے ہیں۔ بات بات پر سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں اور تب تک ٹکٹکی باندھے مسکراتے رہتے ہیں جب تک آپ کم از کم دو تین سو فرانک نہ دے دیں، ورنہ تعاقب کرتے ہیں، صحیح معنوں میں تعاقب کرنا ایک فرانسیسی ہی جانتا ہے۔ راستہ پوچھو تب بخشیش، کسی چیز کی تعریف کرو تب بخشیش، یہاں تک کہ صبح بخیر یا شب بخیر کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے:"

"فرانس، سوئیٹزرلینڈ اور اٹلی میں سے آپ کو کون سا ملک پسند آیا؟"

"ان تینوں میں سے مجھے سپین پسند ہے۔"

"وہاں کیا ہے ۔۔۔؟"

"سپین ہی وہ ملک ہے جہاں گھر یاد نہیں آتا۔ جہاں دوپہر کے کھانے کو اَل مرضا کہتے ہیں ۔۔۔ جو غالباً اَل مرغا سے نکلا ہے۔ سلاد کو اَل سلادا، گیراج کو کو اَل گیراجو اور بھینس کو اَل بفیلو ۔۔۔ جہاں اَل فانسو نام کے بادشاہ گذرے ہیں، جہاں مغربی کھانوں کے ساتھ پلاؤ بھی کھایا جاتا ہے، بازاروں میں حلوہ کھلم کھلا بکتا ہے، جہاں لوگ قیلولہ کرتے ہیں، گھروں میں زنانہ مردانہ علیحدہ علیحدہ ہے، جہاں کی موسیقی مشرقی ہے۔ جہاں خانہ بدوش گٹار کی دُھن پر والہانہ رقص کرتے ہیں، جہاں بال اور آنکھیں سیاہ اور دل سفید ہیں، اگرچہ رنگت گندمی ہے اور شہروں کے

نام جانے پہچانے سے ہیں — ریاضۃ الکنیز، قرطبہ، طلیطلہ، القنطرہ، غرناطہ، ظفرہ، اشبیلیہ، جہاں رات گئے لوگ ہار پہن کر پیچیدہ گلیوں میں سیر کرتے ہیں، اور محبوب کے کوچے میں بلند آواز سے اشعار بھی پڑھ ڈالتے ہیں اور ؎

آج بھی اُس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

ہے ہے یہ آپ نے کیا یاد دلا دیا، کاش کہ ہم روم سے سپین کی باتیں نہ کریں —"

"اب کیا پروگرام ہے —"

"ابھی تو باہر نکل کر ایک سگریٹ پیوں گا —"

"میرا مطلب ہے روم سے کہاں جائیے گا —؟"

"کیٹس اور شیلے کے مزاروں پر فاتحہ خوانی کے بعد یہ دریافت کر کے کہ روم کتنے دنوں میں بنا تھا نیپلز ایک اطالوی دوست سے ملنے جاؤں گا، وہ جنگ کے دوران میں قیدی تھا اور میرا مریض تھا، مریض اور طبیب نہ چکنے کے باوجود ہمارے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔"

"آپ کو کئی دلچسپ ہم سفر بھی تو ملے ہوں گے۔"

"جی ہاں جینیوا میں دو اطالوی لڑکیاں ملیں دو فرانسیسی جن کا تعاقب کر رہے تھے، مانٹی کارلو میں دو فرانسیسی لڑکیوں سے ملاقات ہوئی جو دو اطالوی لڑکوں کا

تعاقب کر رہی نہیں۔ اب میں کچھ ایسے لوگوں سے ملنا چاہتا ہوں جو ایک دوسرے کا تعاقب نہ کر رہے ہوں ـــــ اگر اجازت ہو تو ایک سوال پوچھوں۔"

"ارشاد۔"

"ابھی اور کتنی دیر ہے؟"

"تقریباً دو منٹ۔"

"میرے خیال میں اب ایک فلمی گانا ہو جائے ـــــ کوئی نیا ریکارڈ ہے آپ کے پاس؟"

"جی ہاں ـــــ 'تیری لونگ دا پیا لشکارا' پچھلے مہینے آیا ہے۔"

"تو پھر بسم اللہ ـــــ شائقین کو زیادہ مت ترسائیے۔"

"بہت اچھا ـــــ خدا حافظ۔"

"فی امان اللہ!"

# کلیدِ کامیابی

## (حصّہ دوم)

ہم لوگ خوش قسمت ہیں کیونکہ ایک حیرت انگیز دور سے گذر رہے ہیں۔ آج تک انسان کو ترقی کرنے کے اتنے موقعے میسّر نہیں ہوئے۔ پرانے زمانے میں ہر ایک کو ہر چیز خود سیکھنی پڑتی تھی۔ آج کل ہر شخص دوسروں کی مدد پر خواہ مخواہ تلا ہوا ہے دوسروں کو شاہراہ کامیابی پہ گامزن دیکھنا چاہتا ہے۔

اس موضوع پہ بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ اگر آپ کی مالی حالت مخدوش ہے تو فوراً "لاکھوں کماؤ" خرید لیجئے۔ اگر مقدمہ بازی میں مشغول ہیں تو "رہنمائے قانون" لے آئیے۔ اگر بیمار ہیں تو "گھر کا طبیب" پڑھنے سے شفا یقینی ہے۔ اسی طرح "کامیاب زندگی"، "کامیاب مرغی خانہ"، "ریڈیو کی کتاب"، "کلیدِ کامیابی"، "کلیدِ مویشیاں" اور دوسری

لاتعداد کتابیں بنی نوعِ انسان کی جو خدمت کر رہی ہیں اس سے ہم واقف ہیں۔

مصنّف اِن کتابوں سے اس قدر متاثر ہُوا کہ ازراہِ تشکّر 'کلیدِ کامیابی حصہ دوم' لکھنے کا ارادہ کیا تاکہ وہ چند نکتے جو اس افادی ادب میں پہلے شامل نہ ہو سکے اب شریک کر لیے جائیں۔

**عظمت کا راز** تاریخ دیکھیے دنیا کے عظیم ترین انسان غمگین رہتے تھے۔ کارلائل کا ہاضمہ خراب رہتا تھا۔ سیزر کو مرگی کے دورے پڑتے تھے، روس کا مشہور آئیون نیم پاگل تھا۔ خودکشی کی کوشش کرنا کلائیو کا محبوب مشغلہ تھا۔ کانٹ کو یہ غم لے بیٹھا کہ اس کا قد چھوٹا ہے۔ یورپ کی کلاسیکی موسیقی بیمار اور بیزار فن کاروں کی مرہونِ منّت ہے۔ دنیا کا عظیم ادب مغموم موڈ کی تخلیق ہے اور اکثر جیلوں میں لکھا گیا ہے۔ لہٰذا غمگین ہوئے بغیر کوئی عظیم کام کرنا ناممکن ہے غم ہی عظمت کا راز ہے ـــــ یا غم آسرا ئیلا۔

تو پھر آج ہی سے رنجیدہ رہنا شروع کر دیجیے۔ بہت کم تھوڑے ملک ایسے ہیں جہاں غمگین ہونے کے اتنے موقعے میسّر ہیں جتنے ہمارے ہاں۔ ابھی چند اشعار پڑھیے، ہماری شاعری ماشاءاللہ حزن والم سے بھرپور ہے۔ سوچیے کہ زندگی پیاز کی طرح ہے اسے چھیلتے رہیے اندر سے کچھ بھی برآمد نہیں ہوتا، رشتہ داروں اور ان کے طعنوں کو یاد کیجیے۔ پڑوسی عنقریب آپ کے متعلق نئی افواہیں اڑانے والے ہیں۔ جن لوگوں نے آپ سے قرض لیا ہے ایک پائی بھی ادا نہیں کی (ویسے

جو قرض آپ نے لیا ہے وہ بھی ادا نہیں ہوا) ۔۔۔ زندگی کتنی مختصر ہے ۔۔۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ ۔۔۔ شام کی گاڑی سے کوئی بیس رشتہ دار بغیر اطلاع دیئے آجائیں گے ان کے لیے بستروں کا انتظام کرنا ہوگا۔ یہ چشتی صاحب اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں ۔۔۔ پچھلے ہفتے قطب الدین صاحب نے کھانے پر سارے شہر کو مدعو کیا سوائے آپ کے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب آپ غمگین ہیں۔ آہیں بھریے۔ ماتھے پر شکنیں پیدا کیجئے۔ ہر ایک سے لڑیے عنقریب آپ اس احساسِ برتری سے آشنا ہوں گے جو سدا بیزار رہنے والوں کا ہی حصّہ ہے۔ وہ احساس جو انسان کو نطشے کا فوق الانسان بناتا ہے۔ اب آپ شاید کوئی عظیم کام کرنے والے ہیں۔

عظیم کام کر چکنے کے بعد اگر موڈ بدلنا منظور ہو تو فوراً بازار سے "مسرور رہو، مسکراتے رہیئے" یا ایسی ہی کوئی کتاب لے کر پڑھیے اور خوش ہو جائیے۔

**اپنے آپ کو پہچانو** حکما کا اصرار ہے کہ اپنے آپ کو پہچانو۔ لیکن تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ اپنے آپ کو کبھی مت پہچانو ورنہ سخت مایوسی ہوگی۔ بلکہ ہو سکے تو دوسروں کو بھی مت پہچانو۔ ایمرسن فرماتے ہیں کہ "انسان جو کچھ سوچتا ہے وہی بنتا ہے"۔

کچھ بننا کس قدر آسان ہے۔ کچھ سوچنا شروع کر دو اور بن جاؤ۔ اگر نہ بن سکو تو ایمرسن صاحب سے پوچھو۔

**خواب اور عمل** اپنے خوابوں کو عملی جامہ پہنائیے۔ یہ جامہ جتنا جلد پہنایا گیا اتنا ہی بہتر ہوگا۔ ان لوگوں سے مشورہ کیجیے جو اس قسم کے جامے اکثر پہناتے رہتے ہیں

**حافظہ تیز کرنا** اگر آپ کو باتیں بھول جاتی ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کا حافظہ کمزور ہے۔ فقط آپ کو باتیں یاد نہیں رہتیں۔ علاج بہت آسان ہے۔۔۔ آئندہ باتیں یاد رکھنے کی کوشش ہی مت کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ کچھ باتیں آپ کو ضرور یاد رہیں گی

بہت سے لوگ بار بار کہا کرتے ہیں ۔۔۔ ہائے یہ میں نے پہلے کیوں نہیں سوچا۔ اس سے بچنے کی ترکیب یہ ہے کہ ہمیشہ پہلے سے سوچ کر رکھیے اور یا پھر ایسے لوگوں سے دور رہیے۔ دانشمندوں نے مشاہدہ تیز کرنے کے طریقے بتائے ہیں کہ پہلے پھرتی سے کچھ دیکھیے پھر فہرست بنائیے کہ ابھی آپ نے کیا کیا دیکھا تھا۔ اس طرح حافظے کی ٹریننگ ہو جائے گی اور آپ حافظ بنتے جائیں گے۔ لہٰذا اگر اور کوئی کام نہ ہو تو آج سے جیب میں کاغذ اور پنسل رکھیے۔ چیزوں کو فہرست اور فہرست کو چیزوں سے ملایا کیجیے ۔۔۔ بڑی فرحت حاصل ہوگی۔

شوپنہار سیر پر جاتے وقت اپنی چھڑی سے درختوں کو چھوا کرتا تھا۔ ایک روز اُسے یاد آیا کہ پُل کے پاس جو لمبا سا درخت تھا اُسے نہیں چھوا۔ وہ مرد عاقل ایک میل واپس گیا اور جب تک درخت نہ چھو لیا اُسے سکونِ قلب حاصل نہ ہوا۔

شو پنہار کے نقشِ قدم پر چلیئے۔ اس سے آپ کا مشاہدہ اس قدر تیز ہوگا کہ سب حیران رہ جائیں گے۔

**خوف سے مقابلہ** دل ہی دل میں خوف سے جنگ کرنا بے سُود ہے۔ کیونکہ ڈرنے کی ٹریننگ ہمیں بچپن سے ملتی ہے اور شروع سے ہمیں بھُوت، چڑیل، ہاؤ و دیگر چیزوں سے ڈرایا جاتا ہے۔ اگر آپ کو تاریکی سے ڈر لگتا ہے تو تاریکی میں جائیے ہی مت۔ اگر اندھیرا ہو جائے تو جلدی سے ڈر کر روشنی کی طرف چلے آئیے۔ آہستہ آہستہ آپ کو عادت پڑ جائے گی اور خوف کھانا پُرانی بات ہو جائے گی۔

تنہائی سے خوف آتا ہو تو لوگوں سے ملتے رہا کیجئے۔ لیکن ایک وقت میں صرف ایک چیز سے ڈریئے ورنہ یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ اس وقت آپ دراصل کس چیز سے خوفزدہ ہیں۔

**وقت کی پابندی** تجربہ یہی بتاتا ہے کہ اگر آپ وقت پر پہنچ جائیں تو ہمیشہ دوسروں کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے اکثر دیر سے آتے ہیں۔ چنانچہ خود بھی ذرا دیر سے جائیے۔ اگر آپ وقت پر پہنچے تو دوسرے سمجھیں گے کہ آپ کی گھڑی آگے ہے۔

**وہم کا علاج** اگر آپ کو یونہی وہم ہوگیا ہے کہ آپ تندرست ہیں تو کسی طبیب سے ملیئے۔ یہ وہم فوراً دور ہو جائے گا۔

لیکن اگر آپ کسی وہمی بیماری میں مبتلا ہیں تو ہر روز اپنے آپ سے کہئے ــــ
میری صحت اچھی ہو رہی ہے ــــ میں تندرست ہو رہا ہوں۔
احساسِ کمتری ہو تو مندرجہ ذیل فقرے کہے جائیں:۔
میں قابل ہوں۔ مجھ میں کوئی خامی نہیں۔ جو کچھ میں نے اپنے متعلق سُنا سب جھوٹ ہے۔ میں بہت بڑا آدمی ہوں ــــ (یہ فقرے زور زور سے کہے جائیں تاکہ پڑوسی بھی سن لیں۔)

**بے خوابی سے نجات** اگر نیند نہ آتی ہو تو سونے کی کوشش مت کیجئے بلکہ بڑے انہماک سے فلاسفی کی کسی موٹی سی کتاب کا مطالعہ شروع کر دیجئے۔ فوراً نیند آجائے گی۔ مجرب نسخہ ہے۔ (ریاضی کی کتاب کا مطالعہ بھی مفید ہے)

**ہمیشہ جوان رہنے کا راز** اول تو یہ سوچنا ہی غلط ہے کہ جوان رہنا کوئی بہت بڑی بات ہے۔ اس عمر کے نقصانات فوائد سے کہیں زیادہ ہیں ملاحظہ ہو وہ شعر ــ خیر سے موسم شباب کٹا؛ چلو اچھا ہُوا عذاب کٹا۔
تاہم اگر آپ نے ہمیشہ جوان رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو بس خواہ مخواہ یقین کر لیجئے کہ آپ سدا جوان رہیں گے۔ آپ کے ہم عمر بیشک بوڑھے ہو جائیں لیکن آپ پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ جوانوں کی سی حرکتیں کیجئے، جوانوں میں اُٹھئے بیٹھئے، اپنے ہم عمر بوڑھوں پر پھبتیاں کسیے۔ خضاب کا استعمال جاری رکھیے اور حکیموں کے اشتہاروں کا بغور مطالعہ کیجئے۔

**دلبر بننے کا طریقہ** دوسرے تیسرے روز چڑیا گھر جا کر شیر اور دیگر جانوروں سے آنکھیں ملائیے (لیکن پنجرے کے زیادہ قریب مت جائیے) بندوق خرید کر انگیٹھی پہ رکھ لیجئے اور لوگوں کو سنائیے کہ کس طرح آپ نے پچھلے مہینے ایک چیتا یا ریچھ (یا دونوں) مارے تھے۔ بار بار سنا کر آپ خود یقین کرنے لگیں گے کہ واقعی آپ نے ریچھ مارا تھا۔

ویسے خان بہادر بننے سے بھی کافی فرق پڑ جاتا ہے۔

**بے روزگاری سے بچئے** اگر آپ بے روزگار ہیں تو فوراً امپلائمنٹ ایکسچینج میں درخواست دے کر کسی کھاتے پیتے رشتہ دار کے ہاں انتظار کیجئے۔ اور یہ یاد رکھئے کہ انتظار زندگی کا بہترین حصہ ہے۔

**ایک خانگی مشورہ** اگر آپ بیوی ہیں۔ آپ کا خاوند تھکا ماندہ دفتر سے آتا ہے۔ آپ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتی ہیں اور اچھی اچھی باتیں سناتی ہیں تو شام کو وہ ضرور کہیں اِدھر اُدھر چلا جائے گا۔ لیکن اگر آتے ہی آپ اُسے بے بھاؤ کی سُنا دیں۔ بات بات پہ لڑیں اور پریشان کن تذکرے چھیڑ دیں۔ تو وہ منانے کی کوشش کرے گا اور شام گھر میں گذارے گا۔ اگر کہیں باہر گیا تو ساتھ لے جائے گا۔ (مگر یہ عمل بار بار نہ دہرایا جائے۔ ورنہ کہیں شوہرِ موصوف واپس گھر کا رُخ ہی نہ کرے)

## ایک کہانی

یا تو لوگ تقدیر کو کوستے ہیں یا تدبیر کو۔
یہ مسئلہ بہت نازک ہے۔

مشہور ہے کہ پہاڑوں میں پارس پتھر ہوتا ہے۔ جو چیز اسے چھو جائے سونا بن جاتی ہے۔

ایک شخص نے چھ مہینے کی چھٹی بغیر تنخواہ کے لی اور قسمت آزمائی کرنے نیپال پہنچا۔ کرائے کے جانوروں کے پاؤں میں زنجیریں باندھیں کہ شاید کوئی زنجیر پارس پتھر سے چھو جائے۔۔۔ دن بھر انھیں جنگلوں میں لئے لئے پھرتا۔ دن گذرتے گئے اور کچھ نہ بنا۔ چھٹی ختم ہوئی۔ جانور اور زنجیریں لوٹا کر قسمت کو برا بھلا کہہ رہا تھا کہ جوتا اتارتے وقت معلوم ہوا کہ میخیں سونے کی بن چکی ہیں۔ سنار کے پاس گیا اس نے میخیں تول کر قیمت بتائی۔۔۔ یہ پورے چھ مہینے کی تنخواہ تھی۔

اس سے نتائج خود نکالئے۔ لیکن تقدیر اور تدبیر پر لعنت ملامت نہ کیجئے اور قسمت آزمائی کے لئے پہاڑوں کی طرف مت جایئے۔

## گفتگو کا آرٹ

جو کچھ کہنے کا ارادہ ہو ضرور کہئے۔ دوران گفتگو میں خاموش رہنے کی صرف ایک وجہ ہونی چاہیے وہ یہ کہ آپ کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ جتنی دیر جی چاہے۔۔۔ باتیں کیجئے اگر کسی اور نے بولنا شروع کر دیا تو موقعہ ہاتھ سے نکل جائے گا اور کوئی دوسرا آپ کو بور کرنے لگے گا (بور وہ شخص ہے جو اس وقت بولتا چلا جائے جب آپ بولنا چاہتے ہوں)

چنانچہ جب بولتے بولتے سانس لینے کے لئے رُکیں تو ہاتھ کے اشارے سے واضح کر دیجئے کہ ابھی بات ختم نہیں ہوئی۔ یا قطع کلامی معاف کہہ کر پھر سے شروع کر دیجئے۔ اگر کوئی دوسرا اپنی طویل گفتگو ختم نہیں کر رہا، تو بیشک جمائیاں لیجئے۔ کھانسیئے۔ بار بار گھڑی دیکھئے ...... ابھی آیا — کہہ کر باہر چلے جائیے یا وہیں سو جائیے۔

یہ غلط ہے کہ آپ بحث نہیں جیت سکتے۔ اگر آپ ہار گئے تو مخالف کو آپ کی ذہانت پر شبہ ہو جائے گا۔ مجلسی تکلفات بہتر ہیں یا اپنی ذہانت پر شبہ؟ البتہ لڑیئے مت۔ اس سے بحث میں خلل آسکتا ہے۔

کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اُسے کبھی مت مانیئے۔ لوگ ٹوکیں تو اُلٹے سیدھے دلائل بلند آواز میں پیش کر کے اُنھیں خاموش کرا دیجئے ورنہ وہ خواہ مخواہ سر پر چڑھ جائیں گے۔ دورانِ گفتگو میں لفظ "آپ" کا استعمال دو یا تین مرتبہ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اصل چیز "میں" ہے۔ اگر آپ نے اپنے متعلق نہ کہا تو دوسرے اپنے متعلق کہنے لگیں گے۔

تعریفی جملوں کے استعمال سے پرہیز کیجئے۔ کبھی کسی کی تعریف مت کیجئے۔ ورنہ سننے والے کو شبہ ہو جائے گا کہ آپ اُسے کسی کام کے لئے کہنا چاہتے ہیں۔ اگر کسی شخص سے کچھ پوچھنا مطلوب ہو جسے وہ چھپا رہا ہو تو بار بار اُس کی بات کاٹ کر اُسے چڑا دیجئے۔ وکیل اسی طرح مقدمے جیتتے ہیں۔

## دوسروں کو متاثر کرنا

اگر آپ ہر شخص سے اچھی طرح پیش آئے، ہاتھ دبا کر مصافحہ کیا، قریب بیٹھے اور گرمجوشی سے باتیں کیں تو نتائج نہایت پریشان کن ہوں گے۔ وہ خواہ مخواہ متاثر ہو جائے گا۔ اور نہ صرف دوبارہ ملنا چاہے گا بلکہ دوسروں سے تعارف کرا دے گا، یہ مزید دوسروں سے ملائیں گے چنانچہ اتنے ملاقاتی اور واقف کار اکٹھے ہو جائیں گے کہ آپ چھپتے پھریں گے۔

ممکن ہے کہ لوگ متاثر ہو کر آپ کو بھی متاثر کرنا چاہیں۔ بلا ضرورت بغلگیر ہوں گے۔ ہاتھ دبائیں گے اور قریب بیٹھنے کی کوشش کریں گے۔

لہٰذا کسی کو متاثر کرنے کی کوشش مت کیجئے۔ بالفرض اگر آپ کسی کو متاثر کر رہے ہوں تو خیال رکھیے کہ آپ اور اُس شخص کے درمیان کم از کم تین گز کا فاصلہ ہو ورنہ وہ متاثر ہوتے ہی آپ سے بغلگیر ہونے کی کوشش کرے گا۔ (ہو سکتا ہے کہ کہیں آپ بھی اس سے متاثر نہ ہو جائیں) —— زندگی پہلے ہی کافی پیچیدہ ہے کبھی مت کہیئے کہ —— "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی" بلکہ اُس سے پوچھئے کہ کہیں وہ تو آپ سے مل کر خوش نہیں ہو رہا ہے۔ اگر یہ بات ہے تو خبردار رہیئے۔

## رشتہ داروں سے تعلقات

دور کے رشتہ دار سب سے اچھے ہوتے ہیں۔ جتنے دور ہوں اتنا ہی بہتر ہے۔ مثل مشہور ہے کہ دور کے رشتہ دار سہانے۔

## تربیتِ اطفال

بچوں سے کبھی کبھی نرمی سے بھی پیش آئیے۔

بچے سوال پوچھیں تو جواب دیجئے مگر اس انداز میں کہ دوبارہ سوال نہ کر سکیں۔ اگر زیادہ تنگ کریں تو کہہ دیجئے جب بڑے ہوگے سب پتہ چل جائے گا۔

بچوں کو بھوتوں سے ڈراتے رہیئے۔ شاید وہ بزرگوں کا ادب کرنے لگیں۔

بچوں کو دلچسپ کتابیں مت پڑھنے دیجئے۔ کورس کی کتابیں کافی ہیں۔

اگر بچے بے وقوف ہیں تو پروا نہ کیجئے بڑے ہو کر یا تو جینئس بنیں گے یا اپنے آپ کو جینئس سمجھنے لگیں گے۔ بچے کو سب کے سامنے کبھی مت ڈانٹیے، اس کے تحت الشعور پر بُرا اثر پڑے گا۔ ایک طرف لے جا کر اس کی خوب تواضع کیجئے۔

بچوں کو پالتے وقت احتیاط کیجئے کہ وہ ضرورت سے زیادہ نہ پل جائیں۔ ورنہ وہ بہت موٹے ہو جائیں گے اور والدین اور پبلک کے لئے خطرے کا باعث ہوں گے۔

اگر بچے ضد کرتے ہیں تو آپ بھی ضد کرنی شروع کر دیجئے۔ وہ شرمندہ ہو جائیں گے ۔

ماہرین کا اصرار ہے کہ موزوں تربیت کے لئے بچوں کا تجزیۂ نفسی کرانا ضروری ہے۔ لیکن اس سے پہلے والدین اور ماہرین کا تجزیۂ نفسی کرالینا زیادہ مناسب ہوگا۔ دیکھا گیا ہے کہ کنبے میں دو تین بچے ہوں تو وہ لاڈلے بنا دیئے جاتے ہیں۔ لہٰذا بچے ہمیشہ دس بارہ ہونے چاہئیں تاکہ ایک بھی لاڈلا نہ بن سکے۔

اسی طرح آخری بچہ سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے بگاڑ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ آخری بچہ نہیں ہونا چاہیئے۔

## مردوں کے لئے دُبلا ہونے کا طریقہ

ملاحظہ ہو عظمت کا راز؛

## خواتین کے لئے دُبلا ہونے کی ترکیب

آج سے مندرجہ ذیل پرہیزی غذا شروع کر دیجیے۔

ناشتے پر — ایک اُبلا ہوا انڈا، بغیر دودھ اور شکر کی چاء

دوپہر کو — اُبلی ہوئی سبزی، بغیر شوربے کا تھوڑا سا گوشت، ایک چپاتی۔

سہ پہر کو — ایک بسکٹ، بغیر دودھ اور شکر کی چاء

رات کو — اُبلا ہوا گوشت، سبزی، ڈیڑھ چپاتی، پھل، بغیر دودھ اور شکر کی کافی۔

(اس پرہیزی غذا کے علاوہ ساتھ ساتھ باورچی خانے میں نمک چکھنے کے سلسلے میں پلاؤ، مرغن سالن اور پراٹھے، میٹھا چکھتے وقت حلوہ، کھیر، فرنی۔ دیکھ بلی تو نہیں تھی، کے بہانے بالائی، دودھ اور مکھن۔ دکھاؤ تو سہی تم کیا کھا رہا ہے، کے بہانے بچوں کے چاکلیٹ اور مٹھائیاں)

بعض اوقات اس پرہیزی غذا کا اثر نہیں ہوتا، تعجب ہے؟

**مردوں کے لئے موٹا ہونے کا نسخہ** بھینس رکھنا، دفتر کی ملازمت، دوپہر کے کھانے کے بعد دہی کی لسی اور قیلولہ۔ سارے کھیل چھوڑ کر صرف شطرنج اور تاش کھیلئے۔ اور اگر آؤٹ ڈور گیم ہی کھیلنا ہو تو بیڈمنٹن کھیلئے، بس۔

**خواتین کے موٹا ہونے کی ترکیب** کسی خاص ترکیب کی ضرورت نہیں، اس سلسلے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے

**تسخیرِ حُبّ** تعجب ہے کہ ایسے اہم موضوع پر اس قدر کم لکھا گیا ہے، مصیبت یہ ہے کہ ماہرینِ تسخیرِ حُبّ سب کچھ صیغۂ راز میں رکھتے ہیں۔ بس کبھی کبھی اس قسم کے اشتہار چھپتے ہیں۔

محبت کے ماروں کو مژدہ!

محبوب ایک ہفتے کے اندر اندر قدموں میں نہ لوٹنے لگے تو دام واپس!

اس کے علاوہ امتحان میں کامیابی، اولاد کی طرف سے خوشی، خطرناک بیماریوں سے شفا، مقدمہ جیتنا، تلاشِ معاش، افسر کو خوش کرنے کے وعدے بھی ہوتے ہیں۔ اشتہار میں ایک مونچھوں والے (یا داڑھی والے) چہرے کی تصویر، کئی سندیں اور سرٹیفکیٹ ہوتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں نہ کتابوں میں کچھ موجود ہے نہ رسائل میں۔ اُدھر ہمارے ملک میں تسخیرِ حُبّ کی قدم قدم پہ ضرورت محسوس ہوتی ہے، ہر شخص اس چشمۂ حیواں کی تلاش میں ہے اگرچہ مصنف کی معلومات اس موضوع پہ نہ ہونے کے برابر ہیں، تاہم اُس نے جگ بیتی سے چند مفید باتیں اخذ کی ہیں۔

سب سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ چاہنے والا مرد ہے یا عورت اور اُدھر محبوب کا تعلق کس جنس سے ہے۔ لہٰذا سہولت کے لیئے ان ہدایات کو تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے :-

یعنی ۱- اگر محبوب عورت ہو۔

۲- اگر محبوب مرد ہو (اور صنفِ نازک کے کسی فرد کو اُس میں دلچسپی ہو)

۳- اگر محبوب شادی شدہ ہو (فریفتہ ہونے والا مرد ہو یا عورت)

## ۱- اگر محبوب عورت ہو

محبوب چُنتے وقت یہ احتیاط لازم ہے کہ رشتہ داروں پہ ہرگز عاشق نہ ہوں اس کے بعد ارد گرد اور پڑوس میں رہنے والوں سے بھی حتی الوسع احتراز کریں۔ (یہ تجرباتی خار ہوئے ہیں اور طالبِ حب کو وجہ پوچھے بغیر ان پہ اندھا دھند عمل کرنا چاہیئے۔)

محبوب سے ملاقات کے لیئے جاتے وقت پوشاک سادہ ہو (رومال پر خوشبو نہ چھڑکیئے۔ کہیں محبوب یا آپ کو زکام نہ ہو جائے) خوراک سادہ ہو (پیاز اور لہسن کے استعمال سے پرہیز کیجیئے) مونچھوں کو ہرگز تاؤ نہ دیجئے ورنہ محبوب خوفزدہ ہو جائے گا۔ ویسے بھی فی زمانہ بنی سنوری مونچھوں کا اثر طبعِ نازک پر کوئی خاص اچھا نہیں پڑتا (اس کا فرمائشی مونچھوں پہ اطلاق نہیں ہوتا) اگر محبوب کو آپ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تو استقبال یوں ہو گا —

"تشریف آوری کا شکریہ" "بڑی تکلیف کی آپ نے" بھائی جان ابھی آتے ہی ہوں گے، آپ بیٹھئے، میں دادا جان کو ابھی بھیجتی ہوں" لیکن اگر محبوب کو محبت ہے تو وہ بھاگا بھاگا آئے گا اور آپ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہے گا — ہلّو جی! (یا اسی قسم کا کوئی اور مہمل جملہ استعمال کرے گا)

محبوب کو یکسانیت سے بور مت کیجئے، ہر اتوار کو ملتے ہوں تو تیسری مرتبہ منگل کو ملنے جائیے۔ اگلی مرتبہ جمعے کو، بلکہ ایک ٹائم ٹیبل بنا لیجئے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ عورتوں کو سنجیدہ مرد اس لئے پسند آتے ہیں کہ انہیں یونہی وہم سا ہو جاتا ہے کہ ایسے مرد اُن کی باتیں سُن رہے ہیں، لہٰذا تسخیرِ حب کرتے وقت بدگفتگو کا فن "میں جو کچھ لکھا ہے اُسے محبوب کے لئے نظر انداز کر دیجئے۔ نہ صرف محبوب کی باتیں خاموشی سے سنتے رہیئے بلکہ اُسے یقین دلا دیجئے کہ دنیا میں فقط آپ ہی ایسے شخص ہیں جس کے لئے محبوب کی ہر اُلٹی سیدھی بات ایک مستقل وجۂ مسرّت ہے۔

محبوب سے زیادہ بحث مت کیجئے، اگر کوئی بحث چھڑ جائے تو جیتنے کا بہترین نسخہ یہ ہے کہ محبوب کی رائے سے متفق ہو جائیے۔ اور ذرا جلدی کیجئے کہیں محبوب دوبارہ اپنی رائے نہ بدل لے۔

اگر محبوب آپ کی ہر بات پر مسکرا دے اور لگاتار ہنستا رہے تو اُس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے نفیس دانتوں کی نمائش کر رہا ہے (ایسے

## مزید حماقتیں

موقعے پر محبوب سے پوچھئے کہ وہ کون سی ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتا ہے)

اگر محبوب اپنی تعریفیں سن کر ناک بھوں چڑھائے اور ہٹیئے بھی ـــ وغیرہ کہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ مزید تعریف چاہتا ہے۔

محبوب کے میک اپ پر بھول کر بھی نکتہ چینی نہ کیجئے، شاید وہ چہرہ اس لئے سرخ کرتا ہو کہ یہ پتہ نہ چل سکے کب شرما گیا (فقط اُس صورت میں اعتراض کیجئے جبکہ محبوب کا رنگ خدانخواستہ مشکی ہو، اگرچہ گرم خطوں میں ایسے محبوب بافراط پائے جاتے ہیں۔)

ویسے ہر قسم کی تنقید سے پرہیز کیجئے، جو لوگ زیادہ نکتہ چینی کرتے ہیں محبوب اُن سے بیزار ہو جاتا ہے اور تھوڑے دنوں کے بعد محبت میں ان کی حیثیت وہی ہو جاتی ہے جو ٹینس میں مار کر کی۔

دو باتوں سے محبوب از حد مسرور ہوگا، ایک تو یہ کہ کوئی اُس سے کہدے کہ اُس کی شکل کسی ایکٹرس سے ملتی ہے دوسرے یہ کہ اُس کی جو رقیب ہے وہ تو یونہی انٹلکچوئل سی ہے۔

محبوب کی بہن (اگر بہن کی عمر پندرہ اور پینتالیس کے درمیان ہو) کے سامنے محبوب کی کبھی تعریفیں مت کیجئے ورنہ نتائج بڑے حیرت خیز نکلیں گے۔ اور اگر محبوب کے عیب معلوم کرنے ہوں تو اُس کی سہیلیوں کے سامنے اُسے اچھا کہہ خدا کی قدرت کا تماشہ دیکھئے۔ کبھی چھپ کر محبوب کو کسی سے لڑتے ہوئے ضرور

دیکھئے، یا محبوب کو کسی سے لڑوا دیجئے، بہت سی لرزہ خیز چیزوں کا انکشاف ہو گا
اگر محبوب کئی مرتبہ یہ جتلائے کہ آپ آج بالکل نوعمر لڑکے نظر آ رہے ہیں
تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بوڑھے ہونے جا رہے ہیں۔
یاد رکھئے کہ محبوب کی نگاہوں میں ایک چالیس برس کا نوجوان ایک تیس سالہ بوڑھے سے کہیں بہتر ہے (اور ایسے بوڑھے ان دنوں کافی تعداد میں ہر جگہ ملتے ہیں)
محبوب کی سالگرہ یاد رکھئے لیکن اُس کی عمر بھول جائیے۔
بعض اوقات محبوب کو آپ کے احسانات یاد نہیں رہتے لیکن وہ فرمائشیں کبھی نہیں بھولتیں جنھیں آپ پورا نہ کر سکے۔
اوائلِ محبت میں محبوب سے یہ پوچھنا کہ کیا اُسے آپ سے محبت ہے — ایسا ہی ہے جیسے کسی ناول کا آخری باب پہلے پڑھ لینا۔
تنگدستی محبت کی دشمن ہے، ایک قیمتی تحفہ منٹوں میں وہ کچھ کر سکتا ہے جو شاعر مہینوں میں نہیں کہہ سکتے۔
اگر محبوب کسی اور پر عاشق ہے تو سب کوششیں رائیگاں جائیں گی، ایسی حالت میں برابر برابر چھڑوا دینے والے مقولے پر عمل کیجئے، اور ریٹائر ہو جانا بہتر ہو گا، اور اگر محبوب کسی اور کی جانب ملتفت بھی نہیں لیکن آپ کے سب حربے بیکار نظر آنے لگیں تو یہ نہ سمجھئے کہ محبوب سنگدل یا ناقابلِ تسخیر ہے — وہ فقط تجربہ کار ہے۔ احتیاطاً یہ ضرور معلوم کر لیجئے محبوب نے اپنے سابقہ چاہنے والوں

سے کیا سلوک کیا تھا، وہی سلوک دوہرایا بھی جا سکتا ہے۔ اور غالباً دوہرایا جائے گا
یہ ہمیشہ یاد رکھئے کہ جیسے جیسے محبوب کی عمر بڑھتی جائے گی وہ بالکل اپنی امی
کی طرح ہوتی چلی جائے گی۔

## ۲۔ اگر محبوب مرد ہو

محبوب میں سب سے پہلی چیز یہ نوٹ کیجئے کہ آیا وہ آپ کو نوٹ کر رہا ہے یا نہیں۔
محبوب سے نہ کبھی مذہب پر بحث کیجئے نہ روس پر۔ بلکہ اُس سے یہ بھی مت پوچھئے
کہ وہ کماتا کیا ہے۔

محبوب کے سامنے کبھی کسی عورت کی برائی مت کیجئے، اِس سے وہ بے حد
متاثر ہو گا۔

محبوب سے یہ ہرگز مت پوچھئے کہ اُس نے مصنوعی دانت کب لگوائے ہیں۔
یہ یاد رکھئے کہ ایک حسین عورت کی سب عورتیں دشمن ہیں اور اُن کا
سمجھوتہ نہیں ہو سکتا، لہٰذا محتاط رہیئے۔

محبوب کی تعریف کرتے وقت وضاحت سے کام لیجئے، یہ نہیں کہ آپ
خوب ہیں، آپ وجیہہ ہیں، لاکھوں میں ایک ہیں، بلکہ آپ کا ماتھا کشادہ ہے، بال
گھنگھریالے ہیں، شانے ماشاءاللہ مردوں جیسے ہیں۔

جو مرد اپنی مونچھوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں وہ خود پسند ہوتے ہیں، لیکن جو شیو
کرتے ہیں وہ بھی کم خود پسند نہیں ہوتے۔

## مزید حماقتیں

اگر محبوب کلب سے پی کر آیا ہو تو کبھی مت جھلائیے، صرف یہ کہہ کر منہ بنا لیجئے کہ آج آپ نے جنجر پی ہے، اس سے وہ اس قدر خوش ہو گا کہ بیان سے باہر ہے۔ محبوب کے ساتھ کہیں بھاگ جانے کے خیال کو کبھی دل میں نہ لائیے، کسی کے ساتھ بھاگنا بے حد فضول حرکت ہے۔

اگر محبوب گنجا ہو تو نہ اس کی بلند پیشانی کا ذکر کیجئے نہ اس کے سر کی طرف دیکھئے۔

مرد اپنی محبت کا واسطہ دے کر پرانی محبتوں کے متعلق پوچھا کرتے ہیں۔ انھیں کچھ نہ بتائیے ورنہ پچھتانا پڑے گا۔

آپ کی باتیں خواہ کتنی ہی بے جا کیوں نہ ہوں تب تک سب بے جا ہیں جب تک آپ کی آنکھوں میں آنسو نہیں آتے۔ لہٰذا پیشتر اس کے کہ محبوب کو پتہ چل سکے کہ کیا ہو رہا ہے آپ رو دیجئے۔ اپنی رقیبوں سے خبردار رہیئے۔ محبوب جن عورتوں کے متعلق باتیں کرتا رہے ان کی پروا نہ کیجئے لیکن جب وہ کسی عورت کے ذکر سے جان بوجھ کر گریز کرے تو سمجھ جائیے کہ دال میں کالا ہے۔

یہ تو ناممکن ہے کہ آپ اپنے دل کا راز کسی اور کو نہیں بتائیں گی۔ لیکن بتاتے وقت فقط یہ مت کہیئے — تمھیں قسم ہے جو کسی اور سے کہا — اس سے سننے والی کو فوراً شبہ ہو گا اور وہ اُسی وقت سب سے کہہ دے گی۔

محبوب آپ کی تازہ ترین تصویریں مانگے گا — رسماً، اخلاقاً یا محبت سے

لیکن جب وہ آپ کی بچپن کی تصویر مانگے تو سمجھ لیجئے کہ وہ بہت دور کی سوچ رہا ہے اور اب کچھ ہو کر رہے گا۔

شروع شروع میں محبوب کو آپ کے چچے، ماموں بھائی وغیرہ اچھے نہ لگتے ہوں تو کچھ دیر انتظار کیجئے۔ آہستہ آہستہ وہ خود سیدھا ہو جائے گا۔

عقلمند محبوب کو قابو میں رکھنا زیادہ مشکل نہیں۔ لیکن اگر محبوب بے وقوف ہو تو ذہین سے ذہین عورت کے لئے بھی اُسے ہاتھ میں رکھنا محال ہو گا۔

## ۳۔ اگر محبوب شادی شدہ ہو

(یہ موضوع بیحد ضروری ہے۔ کیونکہ آج کل شادی شدہ محبوب سے عشق کرنا نہ صرف عام ہو گیا ہے بلکہ فیشن میں شامل ہے۔ روز بروز اس کی اہمیت ہر خاص و عام پر واضح ہوتی جا رہی ہے)

چونکہ شادی شدہ محبوب مقابلتاً تجربہ کار ہوتا ہے اس لئے بڑے احتیاط کی ضرورت ہے۔ ان ہدایات پر بڑی سنجیدگی سے عمل کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر شبہ ہو جائے کہ کسی ہدایت کو محبوب پہلے سے جانتا ہے تو اُسے وہیں ترک کر دیجئے۔ (ہدایت کو) اور دوسری پر عمل کیجئے۔

شادی شدہ محبوب کو مسخر کرنے کے لئے سب سے اہم چیز نہ حسن ہے نہ قابلیت ——— بلکہ پراپیگنڈہ ہے۔ لہذا تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد اپنے متعلق کوئی خبر اُڑا دیجئے ——— کہ آپ کا ارادہ ولائت جانے کا ہے ——— کبھی کلاسیکل ڈانس

سیکھنے کے منصوبے باندھیئے تو کبھی اُردو میں ایم۔ اے کرنے کی خبر مشہور کر دیجئے۔

پہلے محبوب منتخب کیجئے پھر اُسے چند فالتو خواتین و حضرات کے ساتھ مدعو کیجئے — پک نک — ادبی محفل — برج یا کسی اور بہانے سے۔ آہستہ آہستہ دوسرے لوگوں کو نکالتے جایئے حتیٰ کہ صرف آپ اور محبوب باقی رہ جائیں۔ (اس طرح محبوب کو شبہ نہیں ہو گا۔ شبہ ہؤا بھی تو دیر میں ہو گا)

محبوب سے اس کی نقل و حرکت کے بارے میں سوالات مت پوچھیئے، کسی اور کے ساتھ دیکھ کر اُلٹی ہمدردی جتایئے۔ اُسے وہم ہو جائے گا کہ صرف آپ ہی نے اُسے سمجھا ہے۔

بہتر تو یہ ہو گا کہ ایک وقت میں کئی جگہ کوشش کیجئے۔ اگر کامیابی دس فی صدی بھی ہوئی تب بھی نا تسلّی بخش نہیں۔

کچھ ایسا انتظام کیجئے کہ محبوب ہر وقت آپ کے متعلق قیاس آرائیاں کرتا رہے۔ مثلاً کھوئی کھوئی نگاہوں سے خلا میں تکا کیجئے۔ ذرا ذرا سی دیر کے بعد ٹھنڈے سانس لیجئے۔ وہ بار بار پوچھے گا — کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ؟

اپنے یا محبوب کے شریکِ حیات کا ذکر بالکل نہ آنے دیجئے۔ یوں ظاہر کیجئے جیسے اس دنیا میں نہ آپ کا کوئی ہے نہ اُس کا۔

اگر محبوب بے رُخی برتتا ہو تو اس کا خوب تعاقب کیجئے — بار بار فون

کیجیے ۔۔۔ ملنے جائیے ۔۔۔ سندیسے بھیجئے ۔۔۔ خط لکھئے ۔۔۔ کسی دن وہ اتنا تنگ آئے گا کہ آپ پر عاشق ہو جائے گا۔ الماریوں میں چند اوٹ پٹانگ ضخیم کتابیں، دیواروں پر ماڈرن آرٹ کی بے تکی تصویریں اور کمرے میں ستار یا وائلن ضرور رکھئے خواہ آپ کو ان سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ محبوب یہ سمجھے گا کہ آپ کی طبیعت فن کارانہ ہے

تقریبوں اور پارٹیوں میں ذرا دیر سے جائیے تاکہ لوگ پوچھیں کہ یہ کون ہے؟

بیٹھنے کے لئے ایسی جگہ چنئیے جہاں مناسب روشنی اور موزوں لوگ ہوں ۔

اگر شریکِ حیات ساتھ ہو تو سب کے سامنے اُسے کبھی ڈارلنگ مت کہیئے بلکہ پبلک میں اُس کا نوٹس ہی نہ لیجیے۔

اپنے بچے کو کبھی ساتھ مت لے جائیے ۔ ایک بچے کی موجودگی سارے حسن و جمال کو ختم کر دینے کے لئے کافی ہے ۔ محبوب کے بچوں کو بھی لفٹ نہ دیجئے۔

ذرا سے جھوٹ سے عجب دلکشی پیدا ہو جاتی ہے ۔ یاد رکھئے کہ بچپن میں جھوٹ بولنا گناہ سمجھا جاتا ہے، شادی سے پہلے اسے ایک خوبی تصور کیا جاتا ہے، محبت میں اسے ایک آرٹ کا درجہ حاصل ہے ۔۔۔ اور شادی کے بعد جھوٹ کی پختہ عادت پڑ جاتی ہے۔

عینک کبھی مت لگائیے، خواہ ایک فٹ سامنے نہ دکھائی دیتا ہو ۔ مگر ذرا سنبھل سنبھل کر چلئے، راستے میں گڑھے بھی ہوتے ہیں۔

دعوتوں پر یا تو کھانا کھا کر جائیے یا واپس آکر کھائیے ۔ کم خوراک ہونا بلند مذاقی کی نشانی ہے۔

افواہوں میں خاص دلچسپی لیجئے۔ اگر محبوب کو سنانے کے لئے نئی نئی افواہیں آپ کے پاس ہوئیں تو وہ باقاعدگی سے سننے آئے گا۔

اگر لوگ آپ کے یا محبوب کے متعلق کچھ کہتے ہیں تو ذرا خیال نہ کیجئے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں میں برائیاں نہیں ہوتیں ان میں خوبیاں بھی بہت کم ہوتی ہیں۔ تبھی سارے دلچسپ لوگ بگڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

محبت ختم کرتے وقت ہرگز مت لڑئیے۔ خدا جانے کل کلاں کہیں سابق محبوب ہی سے واسطہ نہ پڑ جائے۔

آخر میں مصنف سفارش کرے گا کہ کبھی کبھی اپنے رفیقِ حیات سے بھی تھوڑی سی محبت کر لیا کیجئے۔ اُس کا بھی تو آپ پر حق ہے۔ جیسا کہ ایک مشہور مفکر نے کہا ہے کہ اپنے رفیقِ حیات سے محبت کرنا محبت نہ کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

## چند جنرل ہدایات

محبوب سے تبھی ملئے جب اس کی صحت اچھی ہو (اور آپ کی بھی) دانت یا سر کے ذرا سے درد سے دنیا اندھیر معلوم ہونے لگتی ہے۔

سب جانتے ہیں کہ حسین اتنے خطرناک نہیں ہوتے جتنے سادہ شکل والے۔ آخرالذکر چھپے رستم ہوتے ہیں۔ یہ ہمدردی جتاتے ہیں، سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں احسانوں سے زیر بار کر دیتے ہیں۔ نشانہ درست کر کے پھر وار کرتے ہیں۔ لیکن حسین اپنے آپ ہی میں مگن رہتے ہیں، اُنھیں آئینہ دیکھنے اور کپڑے سلوانے سے ہی فرصت نہیں ملتی

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ذہین انسان بڑی مشکلوں سے عاشق ہوتے ہیں ۔۔ ان کے خیال میں محبت تخئیل کی فتح ہے ۔۔۔ ذہانت پر۔

محبوب ایک دوسرے سے اس لئے بور نہیں ہوتے کہ وہ ہر وقت ایک دوسرے کے متعلق باتیں کرتے رہتے ہیں۔

(محبت کی شادی کے ذکر سے قصداً گریز کیا گیا ہے کیونکہ یہ جُدا موضوع ہے لیکن علماء کا قول ہے کہ جہاں محبت اندھی ہے وہاں شادی ماہرِ امراضِ چشم ہے)

---

نوٹ:۔ اگر اس مضمون سے ایک کا بھی بھلا ہو گیا تو مصنف سمجھے گا کہ اس کی ساری محنت بالکل رائیگاں گئی۔

# شیطان، عینک اور موسمِ بہار

بہار آگئی۔ ولایتی سینٹ مہکے، کمپنی باغ میں نئی نئی کونپلیں پھوٹیں، پژمردہ چہروں پر میک اپ سے تازگی آگئی۔ مسرت و شادمانی کی لہر سول لائنز کے گوشے گوشے میں دوڑ گئی۔ سڑکوں پہ پیراشوٹ کے کپڑے کے رنگین ملبوس دکھائی دینے لگے۔

جب قدرت اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ انگڑائی لے کر اُٹھی تو شیطان کی عینک کھو گئی۔

شیطان کی عینک ایسی ویسی عینک نہیں جسے ہر عینک ساز مہیا کر سکے۔ اُن کی عینک کے شیشوں کے افقی رُخ میں بھی کئی نمبر ہیں اور عمودی رُخ میں بھی۔ چنانچہ کچھ شمال مشرق اور جنوب مغرب جنوب کی قسم کے شیشے ہیں۔

ایسی پیچیدہ عینک کا جلد ملنا محال تھا، لہٰذا شیطان بغیر عینک کے دکھائی دینے جانے لگے۔

جج صاحب نے ولائیت جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سب متعجب ہوئے سوائے شیطان کے۔ شیطان کا خیال تھا کہ لوگ بڑی تیزی سے ولایت جا رہے ہیں۔ ان دنوں تو یہ رفتار اتنی تیز ہو چکی ہے کہ کسی کے ولایت جانے پر ذرا حیرت نہیں ہوتی، حیرت ہوتی ہے تو اس بات پر کہ فلاں شخص اب تک ولایت کیوں نہیں گیا۔ ان کا اندازہ تھا کہ ہر شخص اللہ کو پیارا ہونے سے پہلے کم از کم ایک مرتبہ ولائیت ضرور ہو آئے گا۔

ویسے جج صاحب کے جانے نہ جانے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا فکر تھا تو رضیہ کا۔ اگر وہ ساتھ چلی گئی تو بہت برا ہوگا۔ شیطان کا تو بہت ہی برا حال تھا کیونکہ وہ رضیہ پر دوبارہ فریفتہ ہوئے تھے۔ ہُوا یوں کہ وہ تقریباً دو سال تک رضیہ سے نہ مل سکے۔ جب وہ باہر سے آتے تو جج صاحب کا کنبہ کہیں چلا جاتا، جب کنبہ آتا تو شیطان کہیں اِدھر اُدھر ہوتے۔ پورے دو سال کے بعد وہ چار پر رضیہ سے ملے۔ میں نے دونوں کا تعارف کرایا۔ اور بتایا کہ وہ جج صاحب کے ساتھ ولایت جا رہی ہے۔ بڑی رسمی قسم کی گفتگو ہوئی۔ شیطان نے پوچھا۔ آپ کے مشغلے کیا ہیں؟ آپ کے محبوب ایکٹر اور پسندیدہ مصنفین کون کون سے ہیں، رُوس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے، آپ شام کو کیا کیا کرتی ہیں۔ بی اے میں آپ کے مضامین کیا تھے، آپ کو شلوار پسند ہے یا غرارہ، آلڈس ہکسلے اور جیمز جوائس کی کون کون سی کتابیں آپ نے نہیں پڑھیں ——؟

اگلے دن شیطان نے بیان دیا کہ جمعے کی سہ پہر کو چار بج کر پچپن منٹ سے وہ رضیہ پر نئے سرے سے دوبارہ عاشق ہو گئے ہیں۔

اُن کی حالت اس قدر مخدوش ہو چکی تھی کہ میں سچ مچ ان کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ میں دستبردار کیوں ہُوا؟ شاید یہ قربانی کا جذبہ تھا، جذبۂ ترحّم تھا یا وہ لافانی فوق البشر آسمانی جذبہ جو انسان کے دل میں کبھی کبھی آتا ہے جو رُوح کو لامتناہی وسعتوں میں لے جاتا ہے، جو انسان کو فرشتوں میں لا کھڑا کرتا ہے، جذبہ جو ـــ وغیرہ وغیرہ دستبردار ہونے کی ایک اور وجہ بھی تھی ـــ مجھے یقین تھا کہ چاہے شیطان کچھ کر لیں رضیہ ان کی جانب کبھی ملتفت نہ ہو گی۔ بنے گا کچھ بھی نہیں۔

شیطان تو عاشق ہو گئے لیکن رضیہ پر کوئی خاص اثر نہیں ہُوا۔ ویسے رضیہ کا رویّہ ہم سب کے متعلق عجب مولویانہ سا تھا، اُسے کسی سے محبت ہوتی تھی نہ نفرت۔

شیطان نے مجھے فون کیا اور چائے پر ایک کیفے میں بلایا۔ پوچھا کہ اور کون ہو گا۔ بولے یونہی ایک آدھ دوست وغیرہ وغیرہ۔ میں کیفے کے دروازے میں داخل ہُوا تو یک بیک بلّیوں کی چیخیں، کتّوں کے رونے کی آوازیں، مرغیوں کی فریادیں ملی جلی سنائی دیں معلوم ہُوا کہ آرکیسٹرا کوئی انگریزی دُھن بجا رہا ہے۔ شیطان کو ڈھونڈنا مصیبت ہو گئی۔ جدھر دیکھتا ہوں اجنبی چہرے نظر آتے ہیں آخر انھوں نے خود آواز دی۔ عینک کے بغیر وہ واقعی اجنبی سے معلوم ہو رہے تھے۔ دراصل عینک ان کے چہرے کا جزو بن چکی تھی، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی میں

نے ان کو عینک کے بغیر بھی دیکھا ہو۔ شاید ایّام طفلی میں بھی وہ عینک لگاتے ہونگے،
پوچھا کہ باقی اصحاب کہاں ہیں۔ انھوں نے اشارے سے بتایا، ایک
تو میں ہوں اور یہ تین وغیرہ وغیرہ ہیں۔ میں نے دیکھا کہ تین بالکل ایک جیسی عینکیں
مجھے دیکھ رہی ہیں۔ بالکل ایک جیسی شبیہیں تھیں پہلے تو خیال ہُوا کہ کہیں ایک
چہرے کا عکس مختلف آئینوں میں تو نہیں پڑ رہا۔ شیطان نے تعارف کرایا۔
یہ کریمہ ہیں —— یہ رحیمہ ہیں —— اور سفینہ۔
میرے لئے وہ تینوں بالکل ایک سی تھیں، سب سے پہلے نظر عینکوں پر
جاتی جو ایک سی تھیں، عینکوں کے عقب میں جو تھوڑے بہت خد وخال دکھائی دیتے
وہ بھی ایک جیسے تھے۔ باوجود انتہائی کوشش کے میں اُن میں تمیز نہ کر سکا۔ بار بار
ایک ہی لڑکی کے سامنے کیک سرکاتا رہا اور اپنی طرف سے یہی سمجھتا رہا کہ طشتری
تینوں کو پیش کی تھی۔ ایک لڑکی کو مس نرینہ بھی کہہ گیا جس پر شیطان نے دوبارہ ان
کے نام لئے۔ مجھے صرف کریمہ یاد رہا شاید کریما بہ بخشائے بر حالِ ما کی وجہ سے۔
کریمہ تینوں میں کم معمولی تھی۔ ویسے وہ حسین ہوتے ہوتے بال بال بچ گئی تھی۔
آخر میں نے ہمت کی اور تینوں کو مس کریمہ اور سفینہ وغیرہ کہہ کر مخاطب کیا
اور بتایا کہ مجھے اُن سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ شیطان نے لفظ مس کئی دفعہ
دہرایا اور بولے —— جانتے ہو دنیا میں عورت یا تو HIT ہوتی ہے —— اور یا
پھر مس۔

## شیطان، عینک اور موسمِ بہار

چاۓ کے بعد شیطان انھیں چھوڑنے چلے گئے اور میں وہیں بیٹھا ان کے نام یاد کرتا رہا۔ دفعتاً کوئی شخص زور زور سے نمکین پانی کے غرارے کرنے لگا۔ میں نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا ریڈیو پر پکا گانا ہو رہا تھا۔

شیطان نے واپس آ کر کہا" اب تمھارے ذمے تین لڑکیاں اُدھار ہیں"

انھوں نے میری رائے طلب کی۔ میں نے انھیں بتایا کہ معنک لڑکیوں سے آج تک میرا واسطہ نہیں پڑا اس لیۓ میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور پھر اس صورت میں جب کہ شیطان کی ایک معنک کزن کسی کالج میں استانی ہیں۔ البتہ ایک شعر میں نے کہیں سے سنا تھا۔

اگرچہ عینکوں سے فرق کچھ اتنا نہیں پڑتا
معنک لڑکیوں پر لوگ عاشق کم ہی ہوتے ہیں

لیکن اُن کا خیال تھا کہ عینک لڑکی کا زیور ہے۔ عینک کو مقوی حسن کا درجہ دیا گیا ہے۔ کئی چہرے تو عینک کے بغیر اچھے معلوم نہیں ہوتے۔ میں نے اُنھیں بتایا کہ یہ وہ چہرے نہیں تھے۔ دراصل وہ چہرے میں نے آج تک نہیں دیکھے۔

انھوں نے مجھے بتایا کہ یہ مختلف کالجوں میں پڑھتی ہیں، مہینے میں پندرہ دن ہوسٹلوں میں رہتی ہیں اور پندرہ دن گھر۔ ان سے واقفیت بھی خوب ہوئی۔ موسمِ بہار کی آمد پر ابھی شیطان کی عینک کو گم ہوۓ چند دن ہی گزرے ہونگے کہ انھوں نے سینما میں اپنی اُن کزن کو دیکھا جو اُستانی ہیں۔ وہ ایک گوشے میں

بالکل اکیلی بیٹھی تھیں۔ یہ اُن کے پیچھے جا بیٹھے۔ پہلے گلا صاف کیا، کھنکارے۔ پھر ایک ترقی پسند سا شعر پڑھا، مگر وہ خاموش رہیں۔ انھوں نے عینک کے شیشے صاف کرنے کا مشورہ دیا کہ میلے ہو رہے ہیں۔ وہ چپ رہیں۔ یہ شکائتیں کرنے لگے کہ مہینے ہو جاتے ہیں اور تم نہیں ملتیں، ہم بلاتے ہیں تو انکار ہو جاتا ہے، خود اکیلی سینما آجاتی ہو۔ پہلی تاریخیں ہیں، تمھیں تنخواہ ملی ہو گی۔ دیکھیں تمھارا بٹوہ۔

جب شیطان نے بٹوے پر ہاتھ ڈالا تو چھینا جھپٹی شروع ہو گئی۔ اُس پاس کے لوگ دیکھنے لگے۔ آخر فتح شیطان کی رہی اور انھوں نے بٹوہ چھین لیا۔ اب جو قریب سے انھیں دیکھتے ہیں تو وہ کوئی اور تھیں۔ بڑے شرمندہ ہوئے۔ جو معافی مانگنی شروع کی تو انھیں فلم بھی نہ دیکھنے دی۔ پکچر ختم ہوئی تو انھیں گھر چھوڑنے گئے اور دوستی ہو گئی۔ یہ تھی کہ میمہ جس کی بائیں آنکھ پر شیطان بری طرح فریفتہ ہو گئے تھے۔ کیونکہ وہ اکثر شیطان کی دائیں طرف بیٹھتی اور وہاں سے بائیں آنکھ مقابلتاً قریب ہوتی۔

ایک روز شیطان کافی ہاؤس میں بیٹھے کہ دروازہ کھلا، کریمہ آئی۔ اور شیطان کے سامنے سے ہوتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر چلی گئی۔ انھیں بہت بُرا لگا۔ یہ اُٹھے اور اسی طرح تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اس کے سامنے جا بیٹھے۔ کچھ اندھیرا سا تھا انھوں نے خفگی کا اظہار کیا، اور کہا کہ لڑکیوں کو آداب بالکل نہیں آتے۔ اگر باتیں کرنا نہیں چاہتی تھیں تو کم از کم ہیلو ہی کہہ دیتیں، اسی طرح تو غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ جب

اچھی طرح خفا ہو چکے تو معلوم ہُوا کہ یہ کہ یمیہ نہیں تھی کوئی اور منحنی لڑکی تھی۔ شیطان نے بڑی خوشامدیں کیں۔ بات بات پہ ہی ہی کرتے رہے۔ بالائی اور کافی منگائی ـــ یہ رحیمہ تھی۔

تیسری لڑکی سفینہ خود کنارے آ لگی۔ اور ایک دن کریمیہ اور رحیمہ کے ہمراہ چڑیا گھر میں مل گئی۔

"تو سارا قصور تمہاری گمشدہ عینک کا ہے ـــ" میں نے پوچھا۔

"اور موسم بہار کا بھی ـــ" وہ بولے۔

میں نے مشورہ دیا کہ وہ اپنی سرگرمیوں کو تب تک ملتوی کر دیں جب تک ان کی نئی عینک نہیں آ جاتی۔

"عینکیں تو آتی جاتی رہتی ہیں، موسم بہار بہت دیر میں آتا ہے۔" وہ آہِ سرد کھینچ کر بولے۔ "اور پھر رضیہ نے بھی تو کہا تھا کہ آپ عینک کے بغیر اچھے معلوم ہوتے ہیں۔"

ہم نے بل منگایا۔ شیطان نے حسبِ معمول بل کا بغور مطالعہ کیا۔ دوبارہ میزان کیا اور ساڑھے تین آنے کی غلطی نکالی، بیرہ بل درست کرا کے لایا۔ میں نے چار آنے طشتری میں چھوڑ دیئے۔ بیرے نے بہت بُرا منہ بنایا۔ ابھی تھوڑی دور ہی گیا ہو گا کہ شیطان نے آواز دے کر واپس بلا لیا اور چار آنے طشتری سے اٹھا کر جیب میں ڈال لئے۔

ہم باہر نکلے، موٹر سائیکل سنبھالی اور جج صاحب کی کوٹھی کا رُخ کیا۔ شیطان کا اصرار تھا کہ جس طرح ملازمت میں اپٹی ڈیٹ ملتی ہے اسی طرح انہیں بھی وہ کئی سال مل جانے

چاہئیں جو انہوں نے رضیہ کے عشق میں پہلے گذارے تھے۔ ان کا عشق تب سے گنا جائے جب وہ پہلی مرتبہ رضیہ پر عاشق ہوئے تھے۔ اس طرح وہ مجھ سے کافی سینیئر ہو جاتے تھے۔

پھاٹک پر ہمیں ننھا ملا جو غلیل لئے کھڑا تھا۔ اس سے معلوم ہُوا کہ حکومت آپا شکار کھیلنے گئی ہیں جج صاحب کے ساتھ۔۔۔ یہ سُن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ حکومت آپا کی جُدائی میرے لئے ہمیشہ مسرّت آمیز ہوتی ہے۔

شیطان بولے "کاش، مجھے پہلے پتہ چل جاتا۔ جہاں وہ گئی ہیں وہاں کے جانوروں کو مسلح کر دیتا"

ہم نے رضیہ کے متعلق دریافت کیا۔ "یقین کیجئے بھائی جان، میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ آخر رضو آپا میں ایسی کیا چیز ہے جو آپ دونوں کو پسند ہے۔ کم از کم مجھے تو وہ بے حد معمولی دکھائی دیتی ہیں"

"جب تم ہماری عمر کو پہنچو گے۔ تو تمہارا معیار یقیناً بدل جائے گا"

"مگر میں نے تو عمر بھر ایسی لڑکی نہیں دیکھی جس نے مجھے متوجّہ کیا ہو"

شیطان ننھے میاں کو دیکھ کر دانت پیستے اور قسم کھاتے کہ اگر وہ کبھی اسمبلی کے ممبر بن گئے تو ایک قانون نافذ کرائیں گے جس کی رو سے عشاق کو اجازت ہو گی کہ اگر محبوب کا کوئی ایسا چھوٹا بھائی ہو تو اسے جاں بحق تسلیم کرا دیں۔

شیطان ان دنوں کچھ حسّاس سے ہو گئے تھے، بہار آتے ہی وہ حسّاس ہو جاتے ہیں۔

بیگم ملیں "سُناؤ بچّو کیسے ہو۔۔ تمہاری موٹر سائیکل کیسی ہے؟"

"جی خُدا کے فضل سے اچھی ہے اور آپ کی خیریت کی طالب ہے"

"بھائی جان آپ کی موٹر سائیکل کی طاقت کتنی ہے؟"

"ڈھائی ہارس پاور۔"

"یعنی دو گھوڑے اور ایک بچھیرا۔ لیکن جس روز میں اس پر سوار ہُوا تو ساڑھے تین ہارس پاور کی ہو جائے گی۔ امّی جان ہارس پاور کا ترجمہ کیجئے۔"

"مجھے کیا پتہ کہ یہ کمبخت پاور ہاؤس کیا بلا ہے۔"

"قوّتِ اسپ۔" ننھّا سینہ پُھلا کر بولا۔

"یہ دن بدن شرارتی ہوتا جا رہا ہے۔ آج یہ کہیں سے ایک چھوٹا سا بچّے کا بکرا پکڑ لایا، جو اُدھم مچایا ہے تو خدا کی پناہ۔"

بیگم نے ذرا دوسری طرف دیکھا اور شیطان غائب تھے۔

"امّی جان۔ ایف اے۔ خاں صاحب کی موٹر آئی ہے۔"

یہ ایف اے خاں شاید کوئی فقیر احمد یا فدا احمد وغیرہ تھے۔ ان پر ننھّے میاں خاص طور پر مہربان تھے۔ ہر ملاقات پر سلام کے بعد سوال ہوتا "چچا جان آپ برسوں سے ایف اے خاں کیوں ہیں۔ لوگ ایم اے ہو گئے ہیں آپ بی۔ اے خاں تک نہیں ہوئے۔"

"مسز خاں بھی آئی ہوں گی۔ اچھا میں چلتی ہوں اتنی دیر تم ننھّے کو پڑھاؤ، اس کا سبق بھی سُننا، یہیں بیٹھے رہو، باہر مچھیاں اور مکھّر بہت ہیں۔"

سب سے پہلے ننھّے میاں نے اپنی تازہ ترین تھیوریاں پیش کیں کہ دراصل آسمان ایک سیاہ خول ہے جس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے سوراخ ہیں، اس خول کے پیچھے نہایت تیز روشنی رہتی ہے۔ ہم ان سوراخوں کو ستارے سمجھتے ہیں۔ یہ ہوائی جہاز والے اگر زیادہ اُونچے چلے گئے تو خول سے ایسے ٹکرائیں گے کہ دھڑام سے آواز آئے گی اور سب کا انتقال ہو جائے گا! اور یہ کہ کششِ ثقل کے بالکل اُلٹ

ایک ادر کشش ہے جو انسان کو آسمان کی طرف کھینچتی ہے۔ اس کا نسخہ ابھی تک معلوم نہیں ہُوا جس روز دریافت کر لیا گیا سفر میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔ لوگ منٹوں سے آسمان کی طرف اُڑ جایا کریں گے۔ اتنی دیر میں زمین گردش کرتی رہے گی اور وہ شہر دور چلا جائے گا جب نیا شہر آنے والا ہوگا تو مخالف گئیر لگا کر کشش ثقل کے ذریعے نیچے اُتر آیا کریں گے۔"

اِس کے بعد وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ انسان اپنا توازن کس طرح قائم رکھتا ہے۔ اگر پونے چھ فٹ لمبے لٹھ کو زمین پر کھڑا کر دیا جائے تو وہ فوراً گر پڑتا ہے لیکن انسان کھڑا رہتا ہے اور نہیں گرتا۔ انہیں یہ بات بھی حیرت میں ڈالتی تھی کہ پانی پت کی لڑائیاں ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کے بغیر کیونکر فتح کی گئیں۔

بڑی مصیبتوں سے میں نے ننھے میاں سے پیچھا چھڑایا۔ دبے پاؤں باغیچے میں پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ نہایت سہانا سماں ہے، معطر جھونکے چل رہے ہیں، تارے جگمگا رہے ہیں چاند ابھی نکلا تو نہیں لیکن ارادہ کر رہا ہے۔ فوّارے کے سامنے رضیہ اور شیطان یوں پوز کئے کھڑے ہیں جیسے تصویر اُتروا رہے ہوں۔

شیطان نے ایک نہایت لمبی آہ کھینچی، اتنی لمبی کہ میں حیران رہ گیا۔ بڑے غمگین لہجے میں بولے۔
"ٹوٹے چمک چمک کے ستارے اُمید کے ۔۔۔ اک خواب تھا کہ پتہ نہیں کیا ہو تا رہا ۔۔۔"

"اک خواب تھا کہ تا بہ سحر دیکھتے رہے۔" رضیہ نے لقمہ دیا اور دونوں روش پر چلنے لگے۔ وہ میرے قریب سے گزرے۔ شیطان تو اتنے قریب تھے کہ میں چاہتا تو ہاتھ بڑھا کر گدگدی کر سکتا تھا۔

"جی ہاں بالکل وہی ۔۔۔ اُف یہ ستارے کتنے اُداس ہیں ۔۔۔ رات بھر سنسان فضاؤں میں اکیلے ٹمٹماتے رہتے ہیں۔ میری زندگی بھی ستارے کی طرح اُداس اور تنہا ہے۔"

جس جگہ میں چھپا ہوا بیٹھا تھا وہ ایسی تھی کہ اگر ذرا بھی ہلتا تو نظر آجاتا۔ اس لئے میں ان کا تعاقب نہیں کر سکا۔ اب وہ دونوں واپس آرہے تھے۔ رضیہ کہہ رہی تھی ـــ "اوّل تو آپ ان سب کو ستارے نہیں کہہ سکتے۔ ستارے وہ ہیں جو سیّاروں کی طرح گردش نہیں کرتے مثلاً سورج ستارہ ہے۔ ہر ستارے کے گرد کئی سیّارے گھومتے ہیں۔ اجرامِ فلکی اتنی حسین چیزیں ہرگز نہیں جتنی آپ سمجھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر اُجاڑ اور بے نُور ہیں۔" دونوں دور نکل گئے

اِس مرتبہ جو لوٹے تو شیطان بڑے پُر درد انداز میں کہہ رہے تھے "خدایا یہ کیا اسرار ہے کہ جس سے محبت کرنے لگو اس کا دل پتھر کی سل بن جاتا ہے۔ بالکل بے حس۔ اس پر اتنا سا بھی اثر تو نہیں ہوتا۔"

جب واپس آئے تو رضیہ کہہ رہی تھی ـــ "آپ نے یہ کیا فورڈ فورڈ لگا رکھی ہے۔ فورڈ کا بیوک سے کوئی مقابلہ نہیں۔ فورڈ تو ان کاروں میں سے ہے جنہیں آج خریدا تو دو سال کے لئے کھینچنے کے لئے بیلوں کی جوڑی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔"

کچھ دیر کے بعد وہ میرے قریب سے پھر گزرے۔ اس مرتبے شیطان نے رضیہ کی کلائی تھام رکھی تھی، اس کی ننّھی سی گھڑی کو بالکل آنکھ سے لگا رکھا تھا اور کہہ رہے تھے ـــ "زمین اپنے محور کے گرد تقریباً آٹھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہی ہے۔ اس لئے اب تک ایرو ناٹکس سے اس کا کوئی تنازعہ نہیں ہوا۔ اب جٹ پروپلشن سے انقلاب آجائے گا اور ہوائی جہاز ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے اڑا کریں گے لہٰذا زمین سے آگے نکل جایا کریں گے۔ ہمارے موجودہ وقت کا نظام بیکار ہوجائے گا، اور تمہاری یہ پیاری سی گھڑی بھی بالکل بیکار ہوجائے گی۔" اتنے میں

جھاڑی میں کسی نے زور سے چھینک ماری۔ پھر ننھے میاں سرپٹ بھاگتے ہوئے دکھائی دیتے۔

میں اور شیطان موٹر سائیکل پر واپس آ رہے تھے۔ ہوا تیز تھی اور وہ پیچھے بیٹھے تھے اس لیئے چلا چلا کر میرے کان میں باتیں کر رہے تھے۔ ننھے میاں کے متعلق بے حد لطیف جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔

"اس مردود بچے کو رشوت دینی پڑے گی۔"

"لیکن اس میں اُس کا کیا قصور ــــ عشق، مُشک، اور چھینک چھپائے نہیں چھپتے ــــ یہ بتاؤ کہ آج باتیں کیسی ہوئیں؟"

"ایک ماڈرن لڑکی کے ساتھ اس سے زیادہ رومانی گفتگو ناممکن تھی۔ بس سمجھ لو کہ حالات بڑے اُمید افزا ہیں۔"

"اور وہ کریمہ، نرینہ، حسینہ ــــ؟"

"تم نام غلط مت لیا کرو ــــ"

میں چند دنوں کے لیئے باہر چلا گیا واپسی پر مجھے بتایا گیا کہ شیطان دن میں آٹھ دس مرتبہ فون کرتے تھے۔ جو غریب فون پر بولتا اس پر بے حد خفا ہوتے جیسے وہ جان بوجھ کر میری نقل و حرکت چھپا رہا ہو۔

معلوم ہُوا کہ محض میری وجہ سے ان کی پارٹی ملتوی ہو گئی جس میں وہ تینوں لڑکیاں مدعو ہیں۔ پوچھا کہ پارٹی کس تقریب میں ہو رہی ہے۔ بولے ابھی تک تو سوچا نہیں۔ شیطان انہیں اتنی دفعہ مدعو کر چکے تھے کہ تمام معقول بہانے ختم ہو گئے

تھے۔ آخر فیصلہ ہُوا کہ جنوبی امریکہ یا شمالی افریقہ کی ایک چھوٹی سی ریاست کو جو خود مختارانہ حقوق ملے ہیں اس خوشی میں ہم ایک شاندار پارٹی دیں۔

شیطان کی ایسی پارٹیوں سے میں بہت گھبراتا ہوں ایک تو وہ اتنا بڑا ہجوم اکٹھا کر لیتے ہیں کہ کسی جلسے کا شبہ ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ خود آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر میں ہمیشہ دیر سے پہنچتا ہوں، دور بیٹھتا ہوں۔ دوسرے لوگوں سے باتیں کرتا رہتا ہوں۔ پہلے چلا آتا ہوں۔ ہر ممکن طریقے سے یہ جتا دیتا ہوں کہ پارٹی سے میرا کوئی تعلق نہیں۔

چنانچہ میں دیر لگا کر پہنچا۔ شیطان سڑک پر کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے کسی خاص مسرّت کا اظہار نہیں کیا۔ ان کا چہرہ جوں کا توں رہا۔ آنکھیں جس سمت میں تک رہی تھیں اُسی سمت میں تکتی رہیں۔ میں سمجھا کہ خفا ہو گئے ہیں۔ قریب گیا، پھر بھی وہ اسی طرح ہوا میں دیکھتے رہے میں نے اشارے کئے، ہاتھ ہلائے، سر ہلایا ــــ لیکن کچھ نہ ہُوا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دفعتاً علیل ہو گئے ہوں۔ پھر مجھے ان کی عینک یاد آ گئی۔ جس کے بغیر وہ اپنے آپ کو بھی اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے، میں نے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ اچھل پڑے۔

جب ہم جلدی جلدی سڑک عبور کر رہے تھے تو شیطان سر کے بل ایک سائیکل میں جا گھسے۔ اتفاق سے سائیکل چل رہی تھی اور اُس پر ایک شخص سوار تھا، اس نے ایک قلابازی کھائی اور دراز ہونے کے لئے ایسی جگہ چُنی جہاں پانی ہی پانی تھا۔

شیطان نے بڑے انکسار سے ۔۔۔ آئی ایم سوری ۔۔۔ کہا اور آگے چل دیئے۔

میں نے اُنہیں روکا۔

"اسے اُٹھائیں؟"

"ضرورت تو نہیں۔ میں نے سوری کہہ دیا ہے"

"ذرا سہارا دے دیں۔"

"لیکن کہہ تو دیا سوری۔"

"مگر وہ خود نہیں اُٹھ سکتا۔"

"تو میں کیا کروں میں نے سوری کہہ دیا ہے۔ اسے اور کیا چاہیئے؟"

ہم کیفے میں داخل ہوئے، باہر پلاٹ میں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور آرکیسٹرا بج رہا تھا۔ لوگوں میں سے گزرتے ہوئے شیطان نے ایک کتے کی دم پر پاؤں رکھ دیا۔ کتے نے ایک عظیم الشان نعرہ لگایا۔ شیطان مڑے، کتے کی طرف جھک کر سوری کہہ دیا۔

میں نے تینوں لڑکیوں کو سلام کیا۔ مجھے ان کے نام ابھی تک یاد نہیں ہوئے تھے چنانچہ میں نے کوشش شروع کر دی۔ ایک بورژوا قسم کا کتا کرسی پر آ بیٹھا اور میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو سونگھنے لگا۔ شیطان نے غالباً اُسے ادنیٰ یا بازاری کتا سمجھ کر زور سے ڈانٹا اور پتھر اُٹھانے کی نیت سے ایک ہاتھ زمین کی طرف لے گئے۔ کتا ڈرا بالکل نہیں، اس نے شیطان کو حقارت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ساتھ کی میز سے آواز آئی۔

"جیکی واپس چلے جاؤ۔"

لڑکیوں نے شیطان کی اس حرکت پر اظہارِ افسوس کیا کہ اتنے اچھے خاندانی کتے کو خفا کر دیا۔ شیطان بولے — "بات یہ ہے کہ آج تک کوئی کتا میری زندگی میں داخل نہیں ہُوا۔"

جب لڑکیاں قہقہے لگا رہی تھیں شور مچا رہی تھیں اور آرکیسٹرا جاز کی گت بجا رہا تھا تو شیطان نے چپکے سے مجھ سے عہد کرایا کہ میں کبھی انھیں عینک کے سلسلے میں نہیں ٹوکوں گا۔ ان کی کمزوری کو صیغۂ راز میں رکھوں گا۔

گفتگو کے موضوع صرف دو تھے۔ پہلا موضوع شادی تھا اور دوسرا موضوع بھی شادی تھا۔ شیطان کریمہ کے ساتھ لگے ہوئے اُس کی بائیں آنکھ کو بڑی للچائی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

وہ کہہ رہی تھی — "میں تو ایسے شخص سے شادی کروں گی جو دولتمند ہو، صاف گو اور دلیر ہو، صاحبِ عزت و صاحبِ دماغ ہو۔ نمایاں شخصیت کا مالک ہو — مشہور و معروف ہو۔"

"تم نے دیر لگا دی —" شیطان بولے۔ "مسز چرچل اُس شخص کو کبھی کی ہتھیا چکی ہیں —"

"میرا انتخاب آخری ہوگا۔" جیسے انھوں نے شیطان کی بات ہی نہیں سنی۔ "اور جسے میں نے پسند کیا اُس کے ساتھ جہنّم میں رہنے کو بھی تیار رہوں گی۔"

"تم نے اپنی اور اُس خوش نصیب کی منزل خوب چنی ہے۔"

شیطان کچھ اور قریب ہو گئے۔ اتنے کہ جب وہ باتیں کرتے تو کریمہ کی عینک کے شیشے دھندلے ہو جاتے اور اسے بار بار صاف کرنے پڑتے۔

شیطان نے کچھ اور قریب ہو کر بجلی کے ایک بہت بڑے قمقمے کی طرف اشارہ کیا جسے وہ غالباً چاند سمجھے تھے۔ میں نے جلدی سے اُن کا ہاتھ پکڑ کر چاند کی طرف کر دیا جو درختوں سے طلوع ہو رہا تھا۔ اُنھوں نے چاند کی تعریف کی نظارے کو سراہا اور کریمہ سے رائے طلب کی۔

"چاند اچھا ہے، تارے بھی بُرے نہیں ہیں۔ پیسٹری اچھی ہے صرف اس میں مکھن زیادہ ہے"۔ جواب ملا۔

شیطان نے بیرے کو بلایا اور ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر دیا۔ "یہ آرکیسٹرا والوں کو دے دو، ایسے حسین ماحول میں کوئی اچھا سا والز سننے کو جی چاہتا ہے۔"

"اور آتے وقت کچھ گرم گرم سموسے لیتے آنا۔" ایک لڑکی بولی۔

آرکیسٹرا والے شاید شیطان کے رقعے کے منتظر ہی تھے، ابھی بیرہ وہاں تک پہنچا نہ تھا کہ والز شروع ہو گیا۔ شیطان کریمہ کے کچھ اور قریب آگئے۔

"کیا خیال ہے ۔۔۔؟" انھوں نے آگے جھک کر آرکیسٹرا والوں کی طرف اشارہ کیا۔ اور کریمہ کی عینک کے شیشے دھندلے کر دئیے۔

"ذرا نمک زیادہ ہے آپ بھی چکھیے ۔۔۔" اُس نے طشتری سامنے کر دی۔

ذرا سی دیر میں دوسرا والز بج رہا تھا اور شیطان سفینہ سے گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔

وہ اپنے خاندان کے قصیدے سنا رہی تھی کہ ان کے خاندان میں کوئی سنتّر فی صدی خان بہادر تھے، بیس فیصدی نواب زادے اور باقی صاحبزادے۔ بچے یورپین گورنسوں کے ساتھ عمر بھر رہتے تھے۔ لڑکیاں کانونٹ میں پڑھتی تھیں۔ تعلیم ختم ہونے سے پہلے ہی ان کی شادی کسی امپیرئیل سروس والے سے ہو جاتی جو انھیں سیدھا انگلینڈ لے جاتا تھا، اس کے بعد کیا ہوتا اس کا ذکر اس نے نہیں کیا۔

اس نے شیطان کے آبا و اجداد میں بھی دلچسپی ظاہر کی اور ان کے متعلق دریافت کیا، انھوں نے ٹال مٹول کر دی۔ جب اصرار بڑھا تو بولے۔ "جی ہمارا شجرہ نسب صدیوں پہلے لنگوروں سے جا ملتا ہے۔ غالباً ڈارون کی تھیوری میں تو آپ کا بھی اعتقاد ہوگا۔ لہٰذا آپ کے بزرگ اور ہمارے بزرگ اکٹھے ہی رہا کرتے تھے۔"

تیسرا دالنہ شروع ہوا اور شیطان رحیمہ کے ساتھ آ بیٹھے۔ کریمہ اور سفینہ باتیں آپس میں کر رہی تھیں اور منہ میری طرف کر رکھا تھا۔

میں نے مغز کے کباب ان کی طرف بڑھا کر کہا — "لیجیے دماغ کھائیے۔"

ایک کباب پر تھوڑا سا شوربہ ڈال کر دوسری کی طرف بڑھا دیا۔

وہ کچھ جھجکیں، میں مُصِر رہا — "کھائیے بھی مغز — آپ تکلّف کرتی ہیں —"

اب ریکارڈ بج رہے تھے۔ کروسو نہایت دلکش نغمہ الاپ رہا تھا۔ رحیمہ اور شیطان نہایت ذہین قسم کی گفتگو کر رہے تھے۔

"اب مجھے ہی لیجیے۔ مجھ پر ایسے دورے اکثر پڑتے ہیں اور میں اس قدر

پریشان ہو جاتا ہوں کہ جب سوتا ہوں تو جاگتا رہتا ہوں۔ بس ایک وہم مجھ پر سوار ہو جاتا ہے کہ میں اتنا عظیم انسان نہیں ہوں جتنا کہ ہوں۔"

"کرو سو کو بھی احساس کمتری تھا، وہ بالکل چھوٹا سا ٹھگنا سا آدمی تھا۔ تبھی اُس کے گانے میں اتنا سوز ہے یا تو اُس کا گلا اتنا سریلا تھا یا اسے زکام کی شکایت رہتی ہوگی غالباً وہ انگریزی کے پکے گانے گاتا تھا۔"

اب سناٹا کا ریکارڈ بج رہا تھا۔

"یونہی مینخی سا فاقہ زدہ انسان ہے یہ سناٹرا۔"

"اور مقصود صاحب ۔۔۔ ؟" میں نے مقصود گھوڑے کے متعلق پوچھا۔ وہ بھی کبھی کبھی گایا کرتا تھا۔

"آدمی تو فضول سے ہیں لیکن اُن کے پاس کار نہایت عمدہ ہے۔" سفینہ بولی۔ شیطان کے کان کھڑے ہوئے۔ ان دنوں مقصود گھوڑے سے ان کے تعلقات خوش گوار نہیں تھے۔

"آپ کے وہ دوست آپ کے ساتھ کبھی نہیں آئے۔" کریمہ نے پوچھا۔

"یہ چاکلیٹ کی پیسٹری نہیں چکھی آپ نے!" شیطان نے جواب دیا۔

"ان کی کار واقعی نہایت خوبصورت ہے۔ وہ ہمیشہ ہوتے بھی اکیلے ہیں۔"

"بیرہ!" شیطان چلائے ۔۔۔ "تم کچھ سموسے کھاؤ گی ۔۔۔ ؟"

"کافی کھا چکی ہوں۔ چلئے آپ کے لئے کھا لوں گی۔"

"دیر ہوگئی — کیا وقت ہوگا؟" کریمہ نے پوچھا
"دس بجنے میں بیس منٹ ہیں" میں نے بتایا۔
"تو چلیں —"
"نہیں — تمھاری گھڑی آگے ہے" شیطان بولے "صرف نو بج کر چالیس منٹ ہوئے ہیں"
جب ہم کیفے سے باہر نکلے تو شیطان کہیں غائب ہوگئے۔ دیکھا تو ایک اور تانگے میں بیٹھے ہیں۔ چونکہ میں عہد کر چکا تھا کہ ان کی بینائی کا ذکر نہیں کروں گا اس لئے خاموش تھا۔
مقصود گھوڑا اپنی کار میں مجھ سے ملنے آیا، اور لڑکیوں سے متعارف ہونے کی خواہش ظاہر کی، میں نے کہا کہ شیطان سے پوچھو۔ شیطان بڑے خفا ہوئے کہ خبردار جو کسی نے میری لڑکیوں کی طرف دیکھا بھی ہے تو — شاید وہ مقصود گھوڑے کی کار سے گھبراتے تھے۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولے۔ اور تم اپنا قرض کیوں نہیں چکاتے۔ لاؤ کہاں ہیں تین لڑکیاں۔ کہیں سے تین لڑکیاں ڈھونڈ کر لاؤ۔
ادھر جیسے حادثوں کی بارش شروع ہوگئی اور حادثے موسلا دھار برسنے لگے۔
شام کو کلب گیا دیکھتا ہوں کہ چند فلاسفر قسم کے معنک حضرات شیطان کو گھیرے بیٹھے ہیں۔ ایسی گرما گرم بحث ہورہی ہے کہ کمرے کا درجۂ حرارت کافی بڑھ گیا ہے۔ ایک صاحب جنھوں نے اپنے آپ کو کامریڈ مشہور کر رکھا تھا۔ اور شاید کامریڈ تخلص

بھی کرتے تھے شیطان کے چہرے میں اپنی عینک ٹھونسے ایک اور کامریڈ کی باتیں کر رہے ہیں جو کسی دوسرے برِّاعظم سے تعلق رکھتے تھے۔

"وہ موٹے ہیں اس لئے وسیع خیالات کے انسان ہیں۔" شیطان بولے۔

"وہ نہایت تجربہ کار انسان ہیں۔" کامریڈ بولے۔

"اور تجربہ کیا ہے۔ غلطیوں کا دوسرا نام۔ میں تو انھیں اوّل نمبر کا قنوطی انسان سمجھتا ہوں، حالانکہ انھیں انسان سمجھنا بھی زیادتی ہے۔"

"وہ کروڑوں مردوں کے پیش رو ہیں۔"

"یہی تو مصیبت ہے کہ وہ مردوں کا پیش رَو ہے اور عورتوں کا پَیرو۔۔۔"

"عورتوں کا پیرو نہیں، عورتوں کے پَیرو کہیئے۔" وہ چلّائے۔

"عورتوں کا پَیرو۔۔۔ کا پیرو۔۔۔ کا پیرو۔۔۔" شیطان نے میز پر مکّا مارا دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور تھر تھر کانپنے لگے۔

"میرے ساتھ ذرا باہر چلو۔" شیطان اُن کی گردن پکڑ کر چیخے۔

ہم انھیں باہر لے آئے۔ روشن سڑکوں سے دور ایک تاریک گوشے میں اس ڈوئل کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ شیطان نے ان کی عینک کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"۔۔۔ یہ کیا تم نے پہن رکھا ہے۔ اپنی طوطے جیسی ناک پر۔۔۔ اسے اتار دو۔ ورنہ میں تمھیں پیٹنے سے انکار کرتا ہوں۔" انھوں نے عینک زمین پر دے ماری۔

اب لڑائی شروع ہوئی۔ ہم نے ان دونوں کو دور دور لے جا کر چھوڑ دیا۔

اچھا خاصا اندھیرا تھا۔ غالباً کامریڈ صاحب کی بینائی بھی شیطان کی طرح بے حد کمزور تھی پہلے انھوں نے آستینیں چڑھائیں اور پھر ہوا میں مکّے لہراتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب سے گزر گئے۔ کامریڈ نے دفعتاً ایک نعرہ بلند کیا اور ایک درخت کے تنے کو پیٹ ڈالا۔

"کدھر دفع ہو گئے ــــ؟" انھوں نے اپنا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔

"اور تم کہاں ہو؟" شیطان بالکل اُن کے قریب سے گزر رہے۔

پھر دیکھتے دیکھتے شیطان تڑپے اور ایک سمت میں بھاگے۔ ہوا میں ایک مکّہ جو گھمایا تو وہ اتفاق سے کامریڈ کی کمر میں لگا۔ انھوں نے پیچھے مڑکر ادھر ادھر دیکھا اور طیش میں چلّائے۔ "یہ مکّہ مجھے کس نے مارا ہے؟ تماشائی ایک طرف رہیں، اگر میں نے کسی کو شرارت کرتے دیکھ پایا تو برا سلوک کروں گا۔"

ہم میں سے باری باری ہر ایک ان کے قریب سے گزرتا۔ ان دونوں کی توجہ ہماری طرف زیادہ تھی ہر پانچ منٹ کے بعد وہ چلا چلّا کر ایک دوسرے سے پوچھتے۔ "تم کہاں ہو۔" اس کے بعد کبڈّی سی شروع ہو جاتی۔ ایک مرتبہ تو وہ مختلف سمتوں میں اتنی دور چلے گئے کہ ہم پکڑ کر واپس لائے۔

غرضیکہ آدھ گھنٹے تک گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ ساری لڑائی میں صرف ایک مکّا کارآمد ثابت ہوا ــــ جو شیطان کا تھا اور کامریڈ صاحب کی کمر میں اتفاقاً جا لگا۔

اس کے بعد دیر تک دیا سلائیاں جلا جلا کر کامریڈ صاحب اور شیطان کی عینکیں ڈھونڈتے رہے

شیطان بدنام ہوتے جا رہے تھے، لوگ شکایتیں کرتے کہ مغرور ہو گیا ہے پہچانتا نہیں، سامنے سے نکل جاتا ہے۔ دیکھ لیتا ہے اور سلام تک نہیں کرتا۔ سلام کا جواب نہیں دیتا۔

گھر میں پردے پر بحث ہو رہی تھی۔ شیطان کا خیال تھا کہ پردہ سرد ملکوں کے لئے نہایت مفید چیز ہے۔ نزلے زکام وغیرہ کے بچاؤ کا نہایت اچھا ذریعہ ہے لیکن گرم ملکوں کے لئے اتنا مفید نہیں۔ گرم ملکوں میں صرف سردیوں میں پردہ کرنا چاہیئے گرمیوں میں ململ کے لباس میں بھی اتنا بُرا حال ہو جاتا ہے۔ برقع پہن کر نہ جانے کیا حالت ہوتی ہو گی۔ جو لوگ پردے کے زیادہ حامی ہیں اور بہت شور مچاتے رہتے ہیں اُن سب کو جولائی اگست میں برقعہ پہنا دیا جائے اور ستمبر میں رائے پوچھی جائے۔

باتیں ہو رہی تھیں کہ شیطان کے خالو آ گئے، وہ کچھ مہینوں سے باہر گئے ہوئے تھے ذرا دُور کرسی پر جا بیٹھے۔ شیطان نے ان کی طرف بڑے غور سے دیکھا اور بولے ــــ "معاف کیجیے حضرت میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟"

"ضرور دیکھا ہو گا۔"

"آپ کا چہرہ کچھ مانوس سا معلوم ہوتا ہے۔"

"سچ مچ؟"

"لیجیے سگریٹ پیجیے ــــ معاف فرمایئے میں چہرے یاد رکھ سکتا ہوں۔ نام یاد نہیں رکھ سکتا۔" شیطان نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں اور خالو کی طرف سے منہ

پھر لیا۔ شیطان کے خالو جو خفا ہوئے ہیں تو بس۔

پھر ایک اور تماشا ہوا۔ رات کو شیطان سفینہ کو لینے اس کے گھر گئے، اور غلطی سے پڑوس کے کسی ویسے ہی مکان میں جا گھسے۔ نمبر تو انھیں نظر ہی نہیں آتے تھے بس اندازاً مکانوں میں چلے جایا کرتے ۔پھاٹک، میدان، برآمدہ — عبور کرتے ہوئے اندر پہنچے۔ ابھی حدود اربعے سے اچھی طرح واقف نہیں ہوئے تھے کہ آواز آئی "کون ہے؟" اس کے بعد کھسر پھسر ہوئی اور قدموں کی چاپ سنائی دی۔ شیطان نے اپنی طرف سے سفینہ کی امّی کے کمرے کا رخ کیا جو مقابلتاً محفوظ جگہ تھی۔ کمرے کی تصویریں دیکھ کر انھیں شبہ سا ہوا کہ شاید کسی اور کے گھر چلے آئے ہیں۔ ایک خوبصورت سی لڑکی کی تصویر دیکھ ہی رہے تھے کہ چنگھاڑ سنائی دی۔

"اچھا تو تم ہو" ایک عمر رسیدہ بزرگ ہاتھ میں لٹھ نما چھڑی لئے داخل ہوئے۔

"تو تم ہی وہ لڑکے ہو جس نے ہم سب کی زندگی تلخ کر رکھی ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم چاہتے کیا ہو — ؟"

"باہر جانا چاہتا ہوں۔" شیطان ہکّے بکّے رہ گئے۔ انھوں نے بزرگ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

"میں نے سنا ہے کہ تم ہر ایک سے کہتے پھرتے ہو کہ تم لڑکی کو دیکھنا چاہتے ہو آج تمھاری یہ ضد بھی پوری ہو جائے گی — اے او فتّو لا اس مقصودن کو یہاں"

جیسا نام تھا ویسی ہی ایک لڑکی کمرے میں آگئی۔

"لو یہ ہے وہ۔ اب اسے دیکھ لو۔ بیچے کیا دیکھ رہے ہو اس کی طرف دیکھو۔"
شیطان دیکھنے لگے۔

"دیکھ چکے کیا؟"

"جی ہاں!"

"اچھا تم جاؤ۔" شیطان چلنے لگے۔

"نہیں تم نہیں۔ میں نے لڑکی سے کہا ہے۔ اور یہ بتاؤ کہ تم اپنے عزیزوں کی طرف سے پیغام کیوں نہیں بھجواتے۔ یوں بدنام کیوں کرتے پھرتے ہو؟ اس طرح چوروں کی طرح گھر میں گھسنا شریف آدمیوں کا کام ہے کیا؟"

"جی آپ کی بینائی کمزور تو نہیں؟ یا کہیں عینک تو نہیں کھو گئی ہے؟"

"ادھر ادھر کی باتیں مت کرو۔ میرے سوال کا جواب دو۔"

"جناب میں اس اعزاز کے قابل نہیں ہوں۔ میں شریف آدمی ہرگز نہیں ہوں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جو شرابی، کبابی اور جواری ہوتے ہیں۔"

اور ایسے سرپٹ بھاگے کہ دس پندرہ منٹ تک کمروں کے اندر ہی دوڑتے رہے، بڑی مشکل سے باہر نکلنے کا راستہ ملا۔

مجھے سب کچھ سنایا تو میں نے پوچھا کہ تم نے جھوٹ کیوں بولا۔ شیطان نے کہا کہ انگریزی دوائیوں اور ٹانکوں کی بوتلوں میں الکحل کی ذراسی مقدار ہوتی ہے۔ کباب

ہم خوب کھاتے ہیں اور برج بھی کھیلتے ہیں جو سراسر جُوا ہے۔ لہٰذا ہم سب شرابی، کبابی اور جواری ہیں۔

میں نے بہت مجبور کیا کہ خدا کے لئے کہیں سے عینک لگوالو اور شریفوں کی زندگی بسر کرنے لگو، وہ ہر بار یہی کہتے کہ تم مجھے بُرا بھلا کہہ لو، ڈانٹ لو، لیکن بس عینک کا ذکر مت کیا کرو، میرے دل کو صدمہ پہنچتا ہے۔ آخر بڑی بحث کے بعد وہ مانے اور ایک عینک ساز کو نمبر دے آئے۔ اگلے ہفتے ہم عینک لینے گئے۔ دکان میں مجسّمے رکھے تھے جن کے چہروں پر عینکیں لگی ہوئی تھیں۔ شیطان سیدھے ایک بڑے سارے مجسّمے کی طرف گئے اور مسکرا کر بولے "آداب عرض، میری عینک تیار ہوگئی یا نہیں —" میں نے جلدی سے ان کا مُنہ دکاندار کی طرف کیا جو بالکل دوسری طرف تھا۔

عینک لگا کر وہ ضد کرنے لگے کہ موٹر سائیکل چلائیں گے۔ مجھے پیچھے بیٹھنا پڑا۔ ہم کچھ دور ہی نکلے ہوں گے کہ وہ چلّائے ہٹو۔ ہٹو۔ ایک طرف ہو جاؤ۔ موٹر سائیکل گھومی اور بڑے زوروں سے جھاڑیوں میں جا گھسی۔ ہم دونوں دور دور گرے۔ شیطان کپڑے جھاڑتے ہوئے اُٹھے اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگے۔ "قبلہ معاف کیجئے۔ میں نے ہارن نہیں دیا تھا۔ ویسے آپ کو فٹ پاتھ پر چلنا چاہیئے تھا۔"

میں نے انھیں ڈانٹا کہ مجھ سے یہ سب کچھ کیا کہہ رہے ہو۔ جس سے ٹکرائے ہو

اس سے کہو ہم نے اُس شخص کو بہت ڈھونڈا جس سے ٹکر لگی تھی مگر سڑک خالی پڑی تھی۔ غالباً شیطان کسی غیر مادی چیز سے ٹکرا گئے تھے۔ جو دیکھتا ہوں تو ان کی عینک چہرے پر نہیں ہے۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ جیب میں رکھ لی تھی۔

ساڑھے چار بجے میں چاء پینے جج صاحب کے ہاں پہنچا تو وہاں چار بج کر تیس منٹ ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ حکومت آپا موٹر سائیکل چلانا سیکھ رہی ہیں۔ جج صاحب اکیلے بیٹھے فائلیں دیکھ رہے تھے۔ کوئی آدھ گھنٹے تک ہم اسی طرح بیٹھے رہے۔ جج صاحب فائلیں دیکھنے میں منہمک رہے اور میں انہیں منہمک رہتے دیکھنے میں منہمک رہا۔ دفعتاً وہ چونکے — "چاء پیو برخوردار —"

اور کچھ نئی فائلیں اٹھا کر پڑھنے لگے۔

کچھ دیر بعد پھر چونکے — "چاء پیو — پیتے کیوں نہیں؟"

میں نے بڑی ساری چاء دانی کو زور سے اٹھایا۔ وہ یک لخت اوپر چلی گئی معلوم ہوا کہ خالی ہے۔ کھولا تو اندر صرف چاء کی پتیاں تھیں۔

"آخر تم چاء کیوں نہیں پیتے —؟" انھوں نے خفا ہو کر کہا۔

"جی چاء دانی خالی ہے۔"

"اچھا۔" انھوں نے میز پر رکھے ہوئے برتنوں کا جائزہ لیا "تو اس میں دودھ ہو گا، دودھ پیو۔"

میں نے جھانک کر دیکھا۔ دودھ بھی نہیں تھا "جی دودھ بھی نہیں ہے۔"

"تو پھر ــ" انھوں نے شکر دانی کی طرف اشارہ کیا۔ "تھوڑی سی چینی چکھو۔"
فائلیں ختم کر کے وہ بڑے ملائم لہجے میں نوکروں پر خفا ہو کر مجھے کلب لے گئے۔ وہاں
شکار کی باتیں ہونے لگیں۔ جج صاحب کے متعلق کلب میں مشہور تھا کہ اگر کوئی
ان سے صرف اتنا کہہ دے کہ پچھلے مہینے جب میں فلاں تالاب کے پاس سے
گزرا تو وہاں ایک مرغابی بیٹھی تھی تو وہ فوراً بندوق لے کر اس تالاب پر جا
پہنچیں گے اور اس وقت تک منتظر رہیں گے جب تک وہ مرغابی یا کوئی اور
مرغابی واپس نہیں آتی۔ ان کے دوست ان کی نئی بندوق کی تعریفیں کر رہے
تھے کہ اس بندوق کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سلو موشن میں فائر کرتی ہے اور
گولی جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

پہلے بندوق چلنے کی آواز آتی ہے پھر نشانہ خطا ہونے کی آواز۔ کیونکہ اتنی
دیر میں جانور یا پرندہ چوکنا ہو جاتا ہے اور پینترہ بدل کر وار صاف بچا جاتا ہے
واپسی میں ان کی کار خراب ہو گئی۔ مجھے کہا گیا کہ میں ہینڈل لگاؤں۔ کافی
محنت کے بعد موٹر سٹارٹ ہوئی۔ ابھی میں ہینڈل ہاتھ میں لئے یہی سوچ رہا تھا کہ
یہ بار بار پھسلتا کیوں تھا کہ فرر سے آواز آئی اور کار سامنے سے غائب
تھی۔ سڑک کافی ویران تھی اس لئے دور تک میں ہینڈل ہاتھ میں لئے پیدل چلا
گھر پہنچ کر جج صاحب نے جرح شروع کر دی۔ "تم کہاں رہ گئے تھے؟ لڑکوں
میں یہ اچھل کود کی عادت بہت بری ہے۔ چلتی موٹر سے ہرگز نہیں اترنا چاہیے

اور یہ ہینڈل تمہارے ہاتھ میں کیوں ہے"؟

کوٹھی کے دوسری طرف جاکر دیکھا تو شیطان اور ننھے میاں کو محوِ گفتگو پایا۔

"ننھے آج تمہاری رضو آپا کیسی لگ رہی تھیں؟" شیطان نے پوچھا

"جیسی لڑکیاں لگا کرتی ہیں ــــ فقط آج ان کی قمیص نہایت اچھی تھی ــ"

"ننھے تمہارے لئے اس اتوار کو کیا لاؤں ــــ؟"

شیطان ہر اتوار ننھے کو رشوت دیتے۔ جو چیز دیتے اسے اگلے اتوار تک چپکے سے چرا لیتے اور پھر الٹا ننھے کو ڈانٹتے کہ کہاں گئی۔

"بتاؤ تمھیں کیا چیز پسند ہے"؟

ننھا سوچ کر بولا ــ" مجھے ریکارڈ کا نیا ماڈل بہت پسند ہے"۔

بیگم آ رہی تھیں ۔ ننھے نے جلدی سے کتاب کھول لی۔

" اوہو بیٹا پڑھ رہا ہے "۔ بیگم بولیں ۔" نو ٹی میاں تم اس سے کچھ سوال بھی تو پوچھا کرو"۔

جب بیگم آتیں ہمیں خواہ مخواہ ننھے کا امتحان لینا پڑتا۔

ہم نے اسے ترجمہ کرنے کو دیا۔ سٹیفن لی کاک کی کتاب سے ننھے نے نہایت سلیس ترجمہ کیا۔ یہاں تک کہ آخر میں مصنف کے نام کا بھی ترجمہ کر ڈالا اور لکھا۔ سٹیفن لی مرغ ــــ!

" بیٹے بڑے ہو کر تم کیا بنو گے"؟ بیگم نے بڑے فخر سے پوچھا۔

"جی میں پہلے تو ایم۔ اے کروں گا۔ اس کے بعد پہلی جماعت میں پھر داخل ہو کر دوبارہ ایم۔ اے تک پڑھوں گا — یعنی ڈبل ایم۔ اے کروں گا۔ اس کے بعد وکالت پڑھ کر خفیہ مشق کیا کروں گا۔"

"خفیہ مشق —؟"

"ذاتی مشق!" ننھے میاں نے جواب دیا۔

"وہ کیا ہوتی ہے؟"

"پرائیویٹ پریکٹس! — ترجمہ کیا ہے۔" ننھے میاں بولے

"کچھ مستورات آرہی ہیں۔" ملازم نے بتایا

"بھائی جان مستورات کا واحد کیا ہوتا ہے؟"

"مستور۔"

"واہ — یہ بھی کبھی سنا ہے کہ ایک مستور آرہی ہے۔"

خواتین آئیں جنہیں میں نے تو پہچان لیا۔ لیکن شیطان یونہی ہوا میں تکتے رہے

"یہ کون لوگ ہیں؟" انھوں نے بڑی بے اعتنائی سے پوچھا۔

"پہچانتے نہیں؟ تمہارے خالو کی لڑکیاں ہیں —" بیگم بولیں۔

بیگم جب کبھی شیطان کے خالو کی چھ لڑکیوں کو لے کر نکلتیں تو شیطان کہا کرتے — "وہ آرہی ہیں بیگم معہ چھ تکبیروں کے۔" بیگم چاہتی تھیں کہ رات کا کھانا ہم وہیں کھائیں — "آج تمہارے لئے حلوؤں کا انڈا پکا ہے۔"

سامنے باورچی خانے میں ایک بلی بڑے مزے سے دودھ پی رہی تھی اور شیطان کے خالو کی سب سے چھوٹی لڑکی پاس کھڑی اپنے رنگین ناخن دیکھ رہی تھی۔ بیگم چلائیں "اے بلی! ذرا پیچھے مڑ کر دیکھنا۔ وہ ننھی دودھ پی رہی ہے"۔

وہ سب چلے گئے تو شیطان نے بتایا کہ ہفتہ ہوا کسی شخص نے خواب میں ان کی ہتک کی۔ انھیں بُرا بھلا کہا اور بڑے زور سے ان کے مکا بھی مارا۔ وہ ہر رات یہ نیت کر کے سوتے ہیں کہ اگر وہ شخص انھیں خواب میں مل گیا تو مار مار کر اُس کا ستیاناس کر دیں گے۔

"بھائی جان کیا بہت زور سے مکا مارا تھا اُس نے" ننھے نے پوچھا

"ہاں بہت زور سے"۔

"اتنے زور سے کیا۔" ننھے میاں نے ایک مکا شیطان کی کمر میں رسید کیا۔ شیطان کچھ دیر اپنے ہونٹ چباتے رہے۔ پھر ننھے کے قریب جا کر بولے "اتنے زور سے نہیں۔ اتنے زور سے"۔ اور ننھے میاں نے ایک زبردست نعرہ بلند کیا۔ پیشتر اس کے کہ کوئی موقع پر پہنچتا۔ شیطان نے زور زور سے ننھے کو ڈانٹنا شروع کیا۔ "اور چڑھو اونچے درختوں پہ پاؤں نہ پھسلے گا تو اور کیا ہو گا۔ اچھا ہوا گر پڑے"۔ بیگم دوڑی دوڑی آئیں۔ ننھے کی ایک نہ سُنی گئی اور اسے خوب دھمکایا چمکایا گیا۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔ شیطان کا جوش و خروش جیسا ان تینوں لڑکیوں کے لئے تھا ویسا ہی رضیہ کے لئے تھا یا یوں کہ جیسا جوش و خروش رضیہ کے لئے تھا ویسا ہی ان تینوں لڑکیوں

کے لئے۔ ہر روز ان کے ارادے بدلتے رہتے۔ رضیہ مغرور ہے اور پروا نہیں کرتی۔ اس لئے کریمہ سے شادی بہتر رہے گی خصوصاً جب اس کی بائیں آنکھ اتنی پیاری ہے ۔۔۔ رحیمہ کے قہقہے نہایت سُریلے ہیں اور ہمیشہ ہنستی رہتی ہے۔ وہ یقیناً بہتر بیوی ثابت ہو گی ۔ پرانی محبت پھر پُرانی محبت ہے، جو جذبات رضیہ کے لئے ہیں وہ کسی اور کے لئے نہیں ہو سکتے ۔۔۔ سفینہ کی بہنیں کتنی خوبصورت ہیں۔ سفینہ سے شادی کرنا کس قدر مفید ہو گا۔

ہر روز وہ غلط جگہوں پر چلے جاتے۔ غلط لوگوں سے اُلجھ جاتے۔ صحیح لوگوں کے قریب سے گزر جاتے۔ سائیکل کے حادثے نہایت باقاعدگی کے ساتھ ہوتے لیکن انھوں نے عینک نہ لگوانی تھی نہ لگوائی۔

ادھر وہ لڑکیاں شیطان کی اس کمزوری سے واقف تھیں۔ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ میں جان بوجھ کر خاموش رہتا ہوں۔ ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ شیطان کے ساتھ آجاتیں۔ بقیہ شامیں اور لڑکوں کے ساتھ گزارتیں۔ جب کبھی کوئی خاص تقریب ہوتی تو وہ بن سنور کر اُن حضرت کے ساتھ نکلتیں جن کے پاس کار ہوتی۔ اُن کے جاننے والوں میں سے ایک صاحب گویّے تھے جو ریڈیو پر پکّے راگ گاتے تھے، اُن کا رنگ بھی پکّا تھا۔ سُنا تھا کہ ان کی آنکھیں نشیلی تھیں، چونکہ وہ ہر وقت آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے رکھتے اس لئے ہم اُن کی نشیلی آنکھوں سے مستفیض نہ ہو سکے۔ ایک بیمہ کمپنی کے ایجنٹ بھی تھے جو ہمیشہ تانگہ ساتھ لایا

کرتے اور یہ بار بار جتاتے کہ وہ خود بیمہ شدہ ہیں، تانگہ بیمہ شدہ ہے، یہاں تک کہ گھوڑا بھی بیمہ شدہ ہے۔ افواہ تھی کہ ان کے بال گھنگھریالے ہیں لیکن صد حیف کہ جب کبھی ہم نے انھیں دیکھا قدرے گنجا پایا۔ ایک صاحب طالب علم تھے جو سفینہ کے ہم جماعت تھے کرائے کی سائیکل پر آیا کرتے تھے اور بار بار گھڑی دیکھتے رہتے۔

بعض اوقات سینما دیکھتے ہوئے ایک لڑکی شیطان سے اجازت مانگتی کہ پچھلے درجے میں اس کی خالہ بیٹھی اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں۔ اس لئے وہ ان کے پاس جانا چاہتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد میں اسے کسی لڑکے کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھتا۔ یہ چیز بار بار دوہرائی جاتی۔ چاء پیتے وقت تو کیفے میں ضرور کسی نہ کسی کی امی یا ممانی آجاتیں۔ شیطان بڑی خندہ پیشانی سے انھیں رخصت کرتے اور ان کی امی جان یا خالہ جان کی خدمت میں آداب بھی بھجواتے جس کی رسید اگلے روز ملتی۔

ان جاننے والوں کو وہ یا تو سہیلیاں کہہ کر یاد کرتیں اور یا کزن کہہ کر۔ ہمیں اکثر بتایا جاتا کہ آپ ہمیں گھنٹہ چھوڑ کر نکلے ہی ہوں گے کہ ہماری ایک کار والی سہیلی آگئی۔ یا یہ کہ ہم فلاں باغ میں گئے وہاں ایک سہیلی نے نہایت دردبھرا گانا سنایا۔ فلاں سہیلی کو ہم نے سائیکل پر بھیجا کہ فلاں دکان سے چاکلیٹ لائے۔ سفینہ کے کزن ہر تیسرے روز تانگہ لے آتے ہیں۔

کبھی کبھی شیطان کو یونہی شبہ ہو جاتا "کل آپ کسی لڑکے کے ساتھ موٹر سائیکل پر جا رہی تھیں۔"

"نہیں تو ––– وہ لڑکا تو نہیں تھا وہ تو میرے چچا تھے۔ آپ نے اُن کی فرنچ کٹ داڑھی نہیں دیکھی کیا۔"

شیطان جنھیں شاید لڑکے کے گلے کا سکارف دکھائی دیا تھا۔ مسکراتے اور کہتے "اوہ کیسی غلط فہمی ہونے لگی تھی" پھر کسی اور سے پوچھتے "پرسوں شام کو آپ ایک لڑکے کے ساتھ کار میں جا رہی تھیں ––– ؟"

"لڑکے کے ساتھ ؟" وہ بڑے تعجب کے ساتھ کہتی "لڑکا کہاں تھا، لڑکی تھی۔ میری چچا زاد بہن۔ بڑی آپا۔ وہ دوپٹہ کبھی سر پہ نہیں رکھتیں اور ان کے بال بھی تراشیدہ ہیں۔"

"میں بھی کیا ہوں ––– ؟" شیطان ایک ادا کے ساتھ کہتے "اور پھر ان دنوں لڑکوں اور لڑکیوں میں فرق کیسے معلوم ہوتا ہے۔ ایک سے چُست رنگین لباس، ایک وضع کے بنے ہوئے بال، ویسی ہی خوشبو کی لپٹیں، یہاں تک کہ ناموں سے بھی پتہ نہیں چلتا کہ رفعت، شوکت، حشمت اور طلعت میں لڑکے کون سے ہیں اور لڑکیاں کون سی۔"

جج صاحب کے ہاں بھی ان لڑکیوں کا ذکر آجاتا۔ ایک دفعہ بیگم نے پوچھا۔ کہ "تمہارے ساتھ وہ تین لڑکیاں کون ہوا کرتی ہیں ؟"

"جی وہ میری سہیلیاں ہیں۔" شیطان نے جواب دیا۔
جج صاحب نے بھی پوچھا "سُنا ہے کہ تم آج کل کچھ لڑکیوں کے ساتھ دیکھے جاتے ہو۔"

"جی ہاں! ابھی تک تو صرف تین لڑکیاں ہیں۔ شاید کچھ دنوں تک آدھ کا اضافہ ہو جائے۔"

"جب میں یورپ میں تھا تو میں بھی لڑکیوں کو ساتھ لے جایا کرتا تھا۔ لیکن ایک وقت میں صرف ایک لڑکی ہوتی تھی۔ تمہاری طرح ریوڑ لے کر نہیں نکلتا تھا۔"
پھر کچھ دیر سوچ کر بولے "یہ بتاؤ کہ تم اس ملک میں لڑکیوں سے دوستی کیونکر کر لیتے ہو؟"
شیطان بولے "جناب یہ گُر میں ہر ایک کو نہیں بتا سکتا۔ یہ استادی شاگردی کا معاملہ ہے۔"

"اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ آہم۔ وہ ذرا — تمہاری گھڑی میں کیا بجا ہے؟" وہ گلا صاف کرتے ہوئے بولے۔
حکومت آپا نے پہلے تو لڑکیوں کو دیکھا۔ پھر شیطان کی طرف دیکھ کر بڑی حقارت سے بولیں "جیسی روح ویسے فرشتے۔"
رضیہ کو علم تھا لیکن اُس نے کبھی ذکر تک نہیں کیا۔
کبھی رضیہ شیطان سے اچھی طرح باتیں کر لیتی تو وہ کئی دنوں تک یہ شعر بار بار

پڑھتے ؎

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

ہر اتوار کہ تینوں لڑکیوں کو علیحدہ علیحدہ یہ شعر سُنایا جاتا ؎

انجامِ محبت ہے ہر حال میں رُسوائی
کچھ اس کا سبب چپ ہے کچھ اس کا سبب باتیں

ایک دن شیطان کو نہایت شدید رومانی دورہ اٹھا اور انھوں نے عجب اُلٹی سیدھی حرکتیں کیں۔ پہلے تو جج صاحب کے سامنے اکبرؔ کا یہ شعر پڑھ دیا ؎

میں ہوا رخصت اُن سے اے اکبرؔ
وصل کے بعد تھینک یُو کہہ کر

ابھی وہ اچھی طرح خفا بھی نہ ہوئے تھے کہ بیگم کے سامنے بہک گئے۔ بیگم تیس سال پہلے کے قصے سُنا رہی تھیں کہ لڑکپن میں میں ایسی تھی۔ زیور اس طرح پہنا کرتی، شاعری کا بھی شوق تھا۔ یہ تھا وہ تھا۔

شیطان ایک ٹھنڈا سانس کھینچ کر بولے "کاش کہ میں آپ سے پہلے ملا ہوتا"

اس کے بعد رضیہ کا نمبر آیا۔ میں چھپ کر سُن رہا تھا۔ پہلے رضیہ کی تعریفیں ہوئیں۔ پھر لگے ہاتھوں اظہارِ محبت بھی کر ڈالا، اور بالکل وہی الفاظ دہرائے جنھیں رضیہ چند سال پہلے سُن چکی تھی۔

"میں محبت کے تمام معیاری طریقے آزما چکا۔ لیکن تم پر کوئی اثر نہیں ہوتا"

رضیہ حسبِ معمول ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی کہ موسم پہلے سے بہتر ہو گیا ہے فلمیں فضول سی لگی ہیں۔ اچھے گانے کہیں نہیں ملتے۔ جب شیطان کا اصرار بڑھا تو اس نے کہا کہ لڑکے آج کچھ کہتے ہیں اور محض چند برسوں میں بدل جاتے ہیں۔

"میں بھلا کیونکر بتا سکتا ہوں کہ اگلے سال میرے خیالات کیا ہوں گے۔ مستقبل کے متعلق تو صرف ملّی اللہ ہی پیشین گوئی کر سکتے ہیں۔ البتہ میرا ماضی تم جانتی ہی ہو۔ رہا حال۔ سو وہ تم پر عیاں ہے"

اس کے بعد انھوں نے رضیہ کا ہاتھ پکڑ کر پامسٹری کی اور لکیروں کی باتیں کر چکنے کے بعد کہا۔ "مگر یہ سارا ہاتھ تو میرا ہے"

"لیکن آپ مجھے بہت تھوڑا جانتے ہیں"

"میرے خیال میں میں تمھیں کافی جانتا ہوں۔ تم قبول صورت ہو، سگھڑ ہو، امورِ خانہ داری میں ماہر ہو، سلیقہ شعار ہو، پیتے کھاتے خاندان کی لڑکی ہو۔ تم سے بہتر لڑکیاں بھی میں نے دیکھی ہیں۔ مگر دُنیا میں رضیہ صرف ایک ہی ہے"

"اوّہ! مغرب کی اذان ہو رہی ہے" رضیہ بولی

"اور تمہارے نظریے مولویانہ ہیں۔ تم غلط ملک میں آگئیں۔ تمھیں کہیں اور ہونا چاہئے تھا۔ خیر اب بھی دیر نہیں ہوئی، جاؤ حج کرو، شرعی کپڑے پہنو، حافظ بنو۔ نمازیں پڑھو اذانیں دو۔

دوانہیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں"

شیطان بڑے خوش خوش ملے، پوچھا کیسے رہے؟ بولے۔ جو کچھ دل میں تھا کہہ دیا۔ پوچھا۔ ہاں ہوئی یا نا؟ بولے۔ یقیناً نا ہوئی۔

شیطان کی سالگرہ آئی۔ پک نک کا پروگرام بنا کہ شہر سے باہر دریا پر دن گذارا جائے۔ ان تینوں لڑکیوں کی تین اور سہیلیاں آرہی تھیں اس لئے شیطان بڑے مسرور تھے۔ ہم گراموفون ریکارڈ چھننے لگے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ "وائٹ میونک ووہن" والا ریکارڈ ضرور ساتھ لے چلیں۔

"کل وہاں تینوں چیزیں ہوں گی۔ موسیقی ہوگی خمار ہوگا اور لڑکیاں ہوں گی۔"

نوکر ہاتھ میں فہرست لئے حساب لگا رہا تھا "چار درجن سینڈوچز اور تین بڑے کیک۔"

"اور لڑکیاں ـــــ" شیطان آسمان کی طرف دیکھ کر بولے۔

"دو سیر مٹھائی، پندرہ انڈے اور تین درجن مالٹے ہوں گے۔" نوکر پنسل سے لکھتا جا رہا تھا۔

"ـــــ اور لڑکیاں ہوں گی۔" شیطان نے ٹھنڈا سانس لیا۔

صبح صبح ہم انھیں لینے گئے۔ تینوں نئی لڑکیاں بھی معنک نکلیں۔ ویسے انھوں نے بغیر فریم کی عینکیں لگا رکھی تھیں۔ سب لڑکیوں کے چہروں پہ بلا کا نکھار تھا غضب کی

تازگی تھی۔ چہرے خوب چمک رہے تھے۔ عینکیں بھی چمک رہی تھیں۔ آسمان پر بادل تھے۔ ہمارے پہنچتے پہنچتے ایک دو مرتبہ بارش ہوئی۔ پھر بڑی تیز دھوپ نکلی ہم کچھ بھیگے کچھ پسینہ آیا۔ اب جو غور سے انھیں دیکھتے ہیں تو عجب حلیہ بنا ہوا تھا سارا میک اپ اتر چکا تھا۔ پہلی مرتبہ ان کی اصلی شکلیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کریمہ کی ہلکی ہلکی مونچھیں نظر آ رہی تھیں۔ رحیمہ کے ہلکے ہلکے گل مچھے تھے جیسے تصویروں میں مغل بادشاہوں کے ہوتے ہیں۔ سفینہ بھویں اکھیڑتی تھی۔ چنانچہ اس کی خودساختہ بھووں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ نئی لڑکیوں کے چہروں پر بھی کئی ایسے نقوش ابھر آئے تھے جو پہلے پوشیدہ تھے۔ ہمارا گروہ کچھ سرکس سا معلوم ہو رہا تھا جس میں ہر نمبر اور سائز کی شخصیتیں موجود تھیں۔ لڑکیوں میں جس کی شکل بہت اچھی تھی وہ دبلی بہت تھی اور قد نہایت لمبا تھا۔ جس کی مسکراہٹ حسین تھی وہ فربہ بہت تھی۔ جو سمارٹ معلوم ہو رہی تھی وہ ویسے بخشی ہوئی تھی۔ جس کی باتیں بہت اچھی تھیں وہ بہت ہی چھوٹی تھی۔ غرضیکہ ایک لڑکی بھی نارمل نہیں تھی۔

ادھر شیطان بار بار مجھے تاکید کرتے کہ ہر ایک سے باتیں کرو، ہر ایک کی طرف باری باری متوجہ ہو۔ میں نے انھیں بتایا کہ اس طرح اپنی توجہ پانچ پر تقسیم کرکے برابر برابر بانٹنا کسی انسان کے لئے تو نہایت مشکل ہے۔ البتہ ایک حقہ یہ فرض بخوبی سرانجام دے سکتا ہے۔

ہم مچھلیاں پکڑنے بیٹھے لڑکیاں شور مچا رہی تھیں۔ کسی نے خاموش ہونے کو

کہا کہ کہیں مچھلیاں نہ بھاگ جائیں۔

"آپ ضرور شور مچائیے۔" شیطان نے دریا میں اپنے خدوخال دھوتے ہوئے کہا۔ "ان کمبختوں کو کسی طرح تو پتہ چلے کہ ہم انھیں پکڑنے آئے ہیں۔"

بارش کا ایک اور چھینٹا پڑا۔ ہم سب درختوں کی طرف بھاگے۔ شیطان صبح سے ایک نئی لڑکی کو بڑی عجیب طرح سے دیکھ رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ تھے۔

"یہ آج تو بالکل مون سون کی قسم کی بارش ہو رہی ہے۔" وہ بولی۔

"مون سون میں ہنی مون کیسا ہوتا ہوگا۔" شیطان کچھ اور نزدیک آ گئے۔ "چلئے وہاں چلیں۔ یہ درخت تو ٹپک رہا ہے۔ لائیے میں آپ کا بٹوہ تھام لوں بوجھل معلوم ہو رہا ہوگا۔"

اس نے بٹوہ دے دیا۔

"یہ درخت بھی لیک کر رہا ہے چلئے۔" شیطان نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ "شکریہ! مجھے اپنا ہاتھ بوجھل نہیں معلوم ہو رہا۔"

بارش رکی تو شیطان نے چیزیں گرم کرنے کے لئے لکڑیوں کا چولھا بنایا۔ جب آگ جلائی گئی تو چولھا بھی جل گیا اور کئی چیزیں بکھر گئیں۔ شیطان کو سالگرہ کی مبارک باد ملی۔ چھوٹے موٹے تحفے بھی ملے۔ وہ کہنے لگے کہ کل تک وہ صرف پچیس سال

کے تھے اور آج چھبیس سال کے ہو گئے۔ صرف ایک رات میں سال کا فرق پڑ گیا۔
یہ خوشی کا نہیں رونے کا مقام ہے۔ پھر اس نئی لڑکی کی طرف دیکھ کر بولے "میں دنیا
کی ہر چیز سے گریز کر سکتا ہوں سوائے ترغیب کے۔ گستاخی معاف آپ کی
شادی کب ہو رہی ہے؟"

"میری منگنی ہو چکی، میرے کزن کے ساتھ۔"

"وہ کیا کرتے ہیں؟"

"ان کے والد لکھ پتی ہیں۔"

"اوہو! تو کیا آپ نے محض دولت کے لئے ـــ"

"اوہ! ہاں میں نے محض دولت کے لئے ـــ اور پھر اس ملک میں رومانی، زبردستی کی، اپنی
پسند کی ـــ خواہ کیسی بھی ہوں سب شادیاں دو تین سال کے بعد ایک جیسی ہو جاتی ہیں۔"

"اور آپ شادی کب کر رہی ہیں؟" شیطان نے دوسری نئی لڑکی سے
پوچھا۔

"میں شاید کبھی نہیں کروں گی۔"

"کیوں؟"

"مجھے نوکروں، گھر کے حساب کتاب، دھوبیوں اور بچوں سے سخت
نفرت ہے۔"

"بچوں سے کیوں نفرت ہے؟"

" اس لئے کہ مجھے پالتو جانوروں اور پرندوں سے بھی نفرت ہے۔"
" اور آپ کی شادی کب ہو رہی ہے؟" کریمہ نے شیطان سے پوچھا۔
" ہاں ہاں! بتائیے کب ہو رہی ہے؟" سب ایک دم بولیں۔
" پہلے اپنے ایک کان میں اُنگلی ڈال لیجئے پھر بتاؤں گا۔"
" وہ کیوں؟"
" کیونکہ بات ایک کان سے سُنی جاتی ہے اور دوسرے سے اڑائی جاتی ہے"
" نہیں یہ تو ہم کسی کو بھی نہیں بتائیں گے۔"
دراصل جو راز شیطان انھیں بتاتے وہ چند دنوں میں ہر جگہ مشہور ہو جاتا ایک دفعہ شیطان نے غلطی سے لڑکی کی امّی کی جگہ ایک لڑکی کو یہ پیغام بھیج دیا کہ مجھے اپنی فرزندی میں قبول فرمائیے۔ لڑکی بے حد خفا ہوئی۔ شیطان نے یہ بات کریمہ کو بتائی اور تاکید کی کہ کسی اور کو مت بتانا، اس نے رحیمہ کو بتائی اور کہا کہ ہرگز کسی اور کو مت بتانا۔ چلتے چلتے یہ بات شیطان تک پہنچی اور جس عقل مند نے شیطان کو بتائی اس نے انہیں بھی تاکید کی کہ کسی اور کو مت بتانا۔
" میں مستقبل سے نہیں گھبراتا بلکہ مستقبل مجھ سے ڈرتا ہے۔" شیطان منہ پھلا کر بولے " مگر حقیقت یہ ہے کہ شادی کے بعد عاشق کی حالت نہایت خستہ ہو جاتی ہے۔ نانا فرنویس نے کہا ہے کہ عاشق پہلے بوسے کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ دوسرا بوسہ چھینتا ہے، تیسرے کے لئے منت سماجت کرتا ہے، چوتھا

قبول کرتا ہے۔ پانچواں، چھٹا، ساتواں، آٹھواں اور باقی کے سب بوسے برداشت کرتا ہے۔"

"بالکل غلط ہے۔" سفینہ بولی "اور رحیمہ وہ تمہارا کزن؟"

"میرا کزن کیوں ہوتا۔ تمہارا ہوگا۔"

"واہ ملنے تو وہ تم سے آیا کرتا ہے۔ کریمہ کے دونوں کزنوں کے ساتھ۔"

"تعجب ہے۔" ایک نئی لڑکی بولی۔ "کریمہ کا تیسرا کزن سفینہ کے کزن کو بھی کریمہ ہی کا کزن سمجھتا ہے اور وہ خود اسے یہی سمجھتا ہے۔"

"خواتین! خواتین!!" شیطان بولے۔ "ہم سب ایک دوسرے کے کزن ہیں۔ ہم حضرت آدم کی اولاد ہیں۔"

اتنے میں نوکر نے مژدہ سنایا کہ چائے کی پتیاں گھر رہ گئیں۔ شیطان نے نوکر کو تلاش میں ایک سمت روانہ کیا اور خود دوسری سمت نکلے۔ میں لکڑیاں چن رہا تھا۔ لڑکیاں گھاس پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ میرے کان ان کی طرف تھے۔ نئی لڑکی کہہ رہی تھی "یہ روفی بالکل بوہی ہے۔ خاک سجھائی نہیں دیتا۔ آج کریمہ دیر تک سامنے کھڑی ہوکر منہ چڑاتی رہی۔ انہیں پتہ ہی نہیں چلا۔ بس یونہی دیکھتے رہے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ سنی سنائی باتوں کا یقین نہیں کرتے اور چشم دید واقعات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اور جو یہ دوسرے صاحب ہیں کتنے عجیب سے ہیں بس اپنی ہی دنیا میں بستے ہیں۔"

"نہیں۔ عجیب تو نہیں ہیں۔" نئی لڑکی نمبر دو عجب انداز سے مسکرائی۔

"یہ سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ رونی کسی جج ورج کے ہاں جاتا ہے یہ بھی کسی مجسٹریٹ کے ہاں جاتا ہوگا۔ یہ سب اوّل نمبر کے ہرجائی اور طوطا چشم ہوتے ہیں ہر لڑکی سے فلرٹ کرنے کو تیار رہیں۔ بس کسی طرح موقع مل جائے۔ لیکن عاشق صرف اس پر ہوتے ہیں جو ان کی پہنچ سے باہر ہو۔ ان کا رویہ بالکل وہی ہوتا ہے کہ ووٹ دیتے وقت غلام محمد صاحب کا خیال رکھئے لیکن ووٹ میاں محمد حسین ہی کو دیجئے اور محبوب پر بھی تب تک عاشق رہتے ہیں جب تک وہ پہنچ سے باہر ہو۔ پھر جب شادی کا موڈ آتا ہے تو سب کو چھوڑ چھاڑ کر کسی دولتمند مشہور گھرانے میں پیغام بھجواتے ہیں اور ایسی بھیگی بلّی بن جاتے ہیں۔ جیسے پہلے کسی لڑکی سے بات تک نہیں کی۔"

"تم رونی کی برائیاں کیوں کرتی ہو۔ اگر یہ اتنا ہی بُرا ہے تو اس کے ساتھ کیوں پھرا کرتی ہو؟"

"اس لئے کہ یہ بے حد دلچسپ ہے۔ بس اس میں صرف یہی ایک خوبی ہے۔"

"اور وہ تمہارا کار والا، وہ گدیا، اور وہ تانگے والا۔۔۔؟"

"کار والا مغرور اور خود پسند سا ہے، اس کے ساتھ ہم صرف کار کی وجہ سے جاتی ہیں۔ ورنہ وہ ہمیں کچھ زیادہ پسند نہیں۔ اگر موڈ اچھا ہو تو وہ گویا بہت اچھا

رفیق بنتا ہے اور اگر اداس ہوں تو وہ تانگے والا خوب ہے۔ کم بخت اور بھی اداس کر دیتا ہے۔ وہ طالب علم بیوقوف ہے۔ ادھر ادھر کے کام خوشی کر دیتا ہے بازار سے چیزیں سستی خرید لاتا ہے۔"

شیطان چائے کی جگہ نہ جانے کس نشہ آور چیز کی پتیاں لے آئے۔ پی کر خمار سا چڑھ گیا۔ جب واپس روانہ ہوئے تو سب ایک دوسرے سے بیزار تھے شیطان بیزار بھی تھے اور تھکے ہوئے بھی۔

"میرے داہنے پاؤں میں درد ہو رہا ہے۔" سفینہ بولی۔

"میرے بھی داہنے پاؤں میں درد ہے۔" شیطان نے جواب دیا۔

"میرے کان میں کچھ عجیب سا ہوتا ہے۔" نئی لڑکی بولی۔

"میرے کان میں بھی بالکل ویسا ہی ہوتا ہے۔"

"میرے ـــ" رجبہ نے شروع کیا۔

"جی میرے بھی ـــ" شیطان جلدی سے بولے

گھر پہنچ کر میں نے شیطان سے کہا کہ یہ چھوٹے موٹے سیکنڈ ہینڈ معاشقے انہیں زیب نہیں دیتے۔ انھوں نے قصور وار رضیہ کو ٹھیرایا۔ ہر لڑکی پر وہ اس لئے عاشق ہو جاتے ہیں کہ انھیں رضیہ کی محبت ہی نہیں مل سکی۔ دراصل ہر معاشقے میں انھیں رضیہ ہی کی محبت جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے نہایت دلدوز انداز میں یہ شعر پڑھا ؎

تجھ سے چھٹ کر اوروں سے بھی جھوٹا سچا پیار کیا
وہ بھی تیرے عشق کے حیلے، یہ بھی تیرے غم کے بہانے

جج صاحب کے ولایت جانے کی افواہ خبر میں تبدیل ہو چکی تھی پھر کسی نے بتایا کہ وہ عنقریب پاسپورٹ بنوانے والے ہیں انھوں نے بڑی کار فروخت کر دی ہے۔ باہر سے کوئی نیا ماڈل لائیں گے بیگم کے لیے ایک نہایت چھوٹی سی کار خریدی گئی تھی جو دراصل اسسٹنٹ کار تھی۔ ننھے میاں ضد کرکے اسے سائیکل سٹینڈ پہ کھڑا کرتے۔ ان کا یہ بھی اصرار تھا کہ اس کار کے لیے ایک سائڈ کار بھی خریدی جائے شیطان کا دن بدن حال بُرا ہوتا جا رہا تھا۔ انھیں یقین ہو چلا تھا کہ جج صاحب جائیں نہ جائیں رضیہ ضرور ولایت جائے گی اور پھر وہیں رہ جائے گی! انھوں نے بڑی منتوں کے بعد مجھے سراغ لگانے بھیجا۔ بیگم کمرے صاف کروا رہی تھیں۔ "سارے روشن دین کھول دو۔ تاکہ گرد نکل جائے۔ یہ بوروں کی گدّی بھی اٹھاؤ اور خالی بوتلے کی سوڈبیں یہاں کیا کر رہی ہیں۔ یہ سب کچھ یہاں سے نکالو دیونک کھا گیا وہ لڑکا آیا تھی ابھی ——؟"

اور میں چپکے سے پردے کے پیچھے ہو گیا۔ رضیہ کے کمرے میں پہنچا "سنا ہے تم ولائت جا رہی ہو؟"

"ولایت تو نہیں عرب جانے کا ارادہ ہے۔"

"اور ہم؟ ہم یہیں رہ جائیں گیا؟"

"میرے مولا بلا لو مدینے مجھے گا یا کیجیے۔"

"اور عرب کے بعد کیا پروگرام ہوگا؟"

"نمازیں پڑھایا کروں گی، اذانیں دوں گی، وعظ کیا کروں گی۔"

"ارے! مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔" میں نے کہا

"یہ لڑکا کہاں چلا گیا؟" بیگم کی آواز آئی۔

"لٹھ کا مراقبے میں ہے۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

جب میں رات گئے شیطان کے کمرے میں پہنچا تو وہ اونگھ رہے تھے۔ جب اُن پر نیند کی غنودگی طاری ہوتی ہے تو وہ ہمیشہ سچ بولتے ہیں ان سے اگر سنجیدہ گفتگو کرنی ہو تو میں ہمیشہ یہی وقت چنتا ہوں۔

مجھے دیکھتے ہی انھوں نے تینوں لڑکیوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ شاید شام کو انھیں کزنوں کے ساتھ دیکھ آتے تھے یا اُن کی باتیں سُن آئے تھے۔

"لیکن اس کے باوجود ہم اُن سے راہ و رسم رکھیں گے مجھے تم سے بڑی شکایت ہے۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"عہد جو کر چکا تھا۔"

"خیر، رضیہ کی خبر سناؤ۔"

"وہ کہیں نہیں جا رہی۔"

"سچ مچ؟" انھوں نے آنکھیں ملیں اور جیب سے عینک نکالی۔ میں فوراً پہچان گیا۔

یہ وہی پرانی عینک تھی جو کھو گئی تھی۔

"ایک مرتبہ رضیہ ہی نے تو کہا تھا کہ آپ عینک کے بغیر اچھے معلوم ہوتے ہیں۔"

"اس نے تو یہ کہا تھا۔ کاش کہ آپ عینک کے بغیر اچھے معلوم ہوتے۔ تم نے اچھی طرح سُنا نہیں۔"

انھوں نے عینک صاف کر کے لگائی "لوگ کہتے ہیں کہ محبت نام ہے غلط فہمی کا کہ ایک لڑکی دوسری لڑکی سے مختلف ہے۔ مگر رضیہ کے لیے میرے دل میں وہی خیالات ہیں جو پچھلے ہفتے تھے۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ یہ کہیں سمندر پار نہ چلی جائے۔ یہاں کم از کم اسے دیکھ تو لیتے ہیں اور اب کہ بہار ختم ہو رہی ہے خوشیاں بھی ختم ہو رہی ہیں جب بہار ختم ہونے لگتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بڑھاپا آ رہا ہے۔"

"مگر تمہارا چہرہ تو۔"

"یہ چہرے کا نہیں دل کا بڑھاپا ہے۔" وہ سینے پر مکّہ مار کر بولے کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر آنکھیں موند لیں اور بڑبڑانے لگے "اور اگر میرے پاس کار ہوتی، تانگہ ہوتا، کرائے کی سائیکل ہوتی، میرے بال گھنگھریالے ہوتے۔ آنکھیں نشیلی ہوتیں تو وہ تینوں لڑکیاں مجھ پر عاشق ہو جاتیں لیکن اگر یہ ساری خوبیاں مجھ میں ہوتیں تو میں کسی بہتر لڑکی کو اپنے اوپر عاشق کرواتا۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں۔ اگر یہ جھوٹ بولتی رہی ہیں تو میں کون سا سچ بولتا رہا ہوں۔ اگر انھوں نے فلرٹ کیا ہے تو میں نے بھی تو فلرٹ کیا

ہے۔ مجھے ان کی پرواہ کب تھی۔ بس ذرا افسوس ہے تو اس بات کا کہ مجھ سے زیادہ چست نکلیں اور جو سلوک میں ان سے آخیر میں کرتا وہ انھوں نے مجھ سے ذرا پہلے کر دیا۔ ہم لوگ کیسے عجیب ہیں۔ سیدھی سادی لڑکیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ صرف شوخ و شنگ لڑکیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ دراصل ہم خود چاہتے ہیں کہ وہ چالاک بن جائیں۔ جھوٹ بولنا سیکھ جائیں۔ ہم خود انھیں ایسا بناتے ہیں۔ یہ سارے حربے ہمارے سکھائے ہوتے ہیں اور جب وہ سب کچھ سیکھ جاتی ہیں تو ہم انھیں برا بھلا کہتے ہیں اور کچھ دنوں کے لیے پھر سیدھی سادی لڑکیوں کے قصیدے گانے لگتے ہیں"

مجھے علم تھا کہ بہار ختم ہو چکی ہے، شیطان کی کھوئی ہوئی عینک مل گئی ہے، ان کی غنودگی بھی کبھی کی دور ہو چکی ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ شاید سچ بول رہے تھے۔

# مُلکی پرندے اور دُوسرے جانور

## کوّا

کوا گرامر میں ہمیشہ مذکر استعمال ہوتا ہے۔

کوّا صبح صبح مُوڈ خراب کرنے میں مدد دیتا ہے، ایسا مُوڈ جو ویسے بھی کوئی خاص اچھا نہیں ہوتا۔ علی الصبح کوّے کا شور انسان کو مذہب کے قریب لاتا ہے اور نروان کی خواہش شدت سے پیدا ہوتی ہے۔

کوّا گا نہیں سکتا اور کوشش بھی نہیں کرتا۔ وہ کائیں کائیں کرتا ہے، کائیں کے کیا معنی ہیں؟ میرے خیال میں تو اس کا کوئی مطلب نہیں۔

کوّے کالے ہوتے ہیں، برفانی علاقوں میں سفید یا سفیدی مائل کوّا نہیں پایا جاتا۔ کوّا سیاہ کیوں ہوتا ہے؟ اس کا جواب بہت مشکل ہے۔

پہاڑی کوّا ڈیڑھ فٹ لمبا اور وزنی ہوتا ہے۔ میدان کے باشندے اس سے کہیں چھوٹے اور مختصر کوّے پر قانع ہیں۔ کوّے خوبصورت نہیں ہوتے لیکن پہاڑی کوّا تو باقاعدہ بدنما ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ معمولی کوّے سے جسم میں زیادہ ہوتا ہے۔

کوّے کا بچپن گھونسلے میں گذرتا ہے جہاں اہم واقعات کی خبریں دلدیرہ پہنچتی ہیں اگر وہ سیانا ہو تو بقیہ عمر وہیں گذار دے لیکن سوشل بننے کی تمنا اسے آبادی میں کھینچ لاتی ہے۔ جو کوّا ایک مرتبہ شہر میں آجاتے وہ ہرگز پہلا سا کوّا نہیں رہتا۔

کوّے کی نظر بڑی تیز ہوتی ہے۔ جن چیزوں کو وہ نہیں دیکھتا وہ قابل نہیں ہوتیں کہ انہیں دیکھا جائے۔ کوّا بے چین رہتا ہے اور جگہ جگہ اڑ کر جاتا ہے، وہ جانتا ہے کہ زندگی بے حد مختصر ہے، چنانچہ وہ سب کچھ دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ کون نہیں چاہتا۔

کبھی کبھی کوّے ایک دوسرے میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگتے ہیں دراصل ایک کوّا دوسرے کوّے کو اس نظر سے نہیں دیکھتا جس سے ہم دیکھتے ہیں۔ دوسرے پرندوں کی طرح کوّوں کے جوڑے کو کبھی چہلیں کرتے نہیں دیکھا گیا، کوّا کبھی اپنا وقت ضائع نہیں کرتا۔ یا کرتا ہے؟ کوّے کو لوگ ہمیشہ غلط سمجھتے ہیں۔ سیاہ رنگ کی وجہ سے اسے پسند نہیں کیا جاتا۔ لوگ تو بس ظاہری رنگ و روپ پر جاتے ہیں۔ باطنی خوبیوں اور کیریکٹر کو کوئی نہیں دیکھتا۔ کوّا کوئی جان بوجھ کر تو سیاہ نہیں ہُوا۔ لوگ چڑیوں، مرغیوں اور کبوتروں کو دانہ ڈالتے وقت کوّوں کو بھگا دیتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ اس طرح نہ صرف کوّوں کے لاشعور میں کئی ناخوشگوار باتیں

بیٹھ جاتی ہیں بلکہ اُن کی ذہنی نشوونما پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ آخر کوّوں کے بھی تو حقوق ہیں۔

کوّا باورچی خانے کے پاس بہت مسرور رہتا ہے۔ ہر لحظے کے بعد کچھ اٹھا کر کسی اور کے لیے کہیں پھینک آتا ہے اور درخت پر بیٹھ کر سوچتا ہے کہ زندگی کتنی حسین ہے۔

کہیں بندوق چلے تو کوّے اسے اپنی ذاتی توہین سمجھتے ہیں اور دفعتاً لاکھوں کی تعداد میں کہیں سے آجاتے ہیں، اس قدر شور مچتا ہے کہ بندوق چلانے والا مہینوں پچھتاتا رہتا ہے۔

بارش ہوتی ہے تو کوّے نہاتے ہیں اور حفظانِ صحت کے اصولوں کا ذرا خیال نہیں رکھتے۔ کوّا سوچ بچار کے قریب نہیں پھٹکتا۔ اس کا عقیدہ ہے کہ زیادہ فکر کرنا اعصابی بنا دیتا ہے۔ کوّے سے ہم کئی سبق سیکھ سکتے ہیں۔

کوّا بڑی سنجیدگی سے اُڑتا ہے، بالکل چرخ کی سیدھ میں۔ کوّے اُڑ رہے ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ شرط لگا کر اُڑ رہے ہیں۔ کوّے فکرِ معاش میں دُور دُور نکل جاتے ہیں لیکن کبھی کھوئے نہیں جاتے۔ شام کے وقت کوئی دس ہزار کوّا کہیں سے واپس آجاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ غلط کوّے ہوں۔

کوّا اتنا غیر رومانی نہیں جتنا ہم اور آپ سمجھتے ہیں، شاعروں نے اکثر کوّے کو مخاطب کیا ہے۔ — کاگا رے جا ہمارو سندیس۔ کاگا رے جا رے جا رے۔

لیکن ہمیشہ کوّے کو کہیں دُور جانے کے لیے کہا گیا ہے کسی نے بھول کر بھی خوش آمدید نہیں کہا۔ بلکہ ایک شاعر تو یہاں تک کہہ گیا — کاگا سب تن کھائیو چُن چُن کھائیو ماس — یہاں میں کچھ نہیں کہوں گا۔ آپ جائیں اور آپ کا کاگا۔
اگر آپ کوّوں سے نالاں ہیں تو یہ مت بھولیے کہ کوّے بھی آپ سے نالاں ہیں۔

## بُلبل

بُلبل ایک روائتی پرندہ ہے جو ہر جگہ موجود ہے سوائے وہاں کے جہاں اسے ہونا چاہیئے۔
اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ نے چڑیا گھر میں یا باہر بلبل دیکھی ہے تو یقیناً کچھ اور دیکھ لیا ہے۔ ہم ہر خوش گلو پرندے کو بلبل سمجھتے ہیں، قصور ہمارا نہیں ہمارے ادب کا ہے۔
شاعروں نے نہ بلبل دیکھی ہے نہ اُسے سُنا ہے کیونکہ اصلی بُلبل اس ملک میں نہیں پائی جاتی۔ سُنا ہے کہ کوہ ہمالیہ کے دامن میں کہیں کہیں بلبل ملتی ہے لیکن کوہ ہمالیہ کے دامن میں شاعر نہیں ہوتے۔
سانیٹ وہ نظم ہے جسے محض بلبل کے لیے لکھا گیا ہو — خوش قسمتی سے بلبل ان پڑھ ہے۔

عام طور پر بلبل کو آہ وزاری کی دعوت دی جاتی ہے اور رونے پیٹنے کے لیے اکسایا جاتا ہے۔ بلبل کو ایسی باتیں بالکل پسند نہیں، ویسے بلبل ہونا کافی مضحکہ خیز ہونا ہوگا۔

بلبل اور گلاب کے پھول کی افواہ کسی شاعر نے اڑائی تھی جس نے رات گئے گلاب کی ٹہنی پر بلبل کو نالہ و شیون کرتے دیکھا تھا۔ کم از کم اس کا خیال تھا کہ وہ پرندہ بلبل ہے اور وہ چیز نالہ و شیون — رات کو عینک کے بغیر کچھ کا کچھ دکھائی دیتا ہے۔

بلبل پروں سمیت محض چند انچ لمبی ہوتی ہے یعنی اگر پروں کو نکال دیا جائے تو کچھ زیادہ بلبل نہیں بچتی۔

بلبل کی پرائیویٹ زندگی کے متعلق طرح طرح کی باتیں مشہور ہیں، بلبل رات کو کیوں گاتی ہے، پرندے جب رات کو گائیں تو ضرور کچھ مطلب ہوتا ہے وہ اتنی رات گئے باغ میں اکیلی کیوں جاتی ہے۔ بلبل کو چہچہاتے سن کر دور کہیں ایک اور بلبل چہچہانے لگتی ہے۔ پھر کوئی بلبل نہیں چہچہاتی وغیرہ — ہمارے ملک میں تو لوگ ایسی سکنڈ ہینڈ باتیں نہ جانتے ہیں۔ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر کسی چیز کا یقین نہ کیجیے۔

کبھی کبھی بلبل غلطیاں کرتی ہے لیکن اس سے فائدہ نہیں اٹھاتی، چنانچہ پھر غلطیاں کرتی ہے — سیاست میں تو یہ عام ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ بلبل کے گانے کی وجہ اس کی غمگین خانگی زندگی ہے جس کی

وجہ یہ ہر وقت کا گانا ہے۔ دراصل بلبل ہمیں محظوظ کرنے کے لیے ہرگز نہیں گاتی اُسے اپنے فکر ہی نہیں چھوڑتے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بلبل گاتے وقت بُل۔بُل۔بلبلبُل۔بُل کی سی آوازیں نکالتی ہے — یہ غلط ہے۔

بلبل پکّے راگ گاتی ہے یا کچّے؟ بہرحال اس سلسلے میں وہ بہت سے موسیقاروں سے بہتر ہے۔ ایک تو وہ گھنٹے بھر کا الاپ نہیں لیتی، بے سُری ہو جائے تو بہانے نہیں کرتی کہ ساز والے نکمے ہیں۔ آج گلا خراب ہے۔ آپ تنگ آ جائیں تو اُسے خاموش کرا سکتے ہیں — اور کیا چاہیے۔

جہاں تیتر، سبحان تیری قدرت، پپیہا پی کہاں، اور گیدڑ پدرم سلطان بود کہتا ہوا سنا گیا ہے۔ وہاں بلبل کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی مصرعے کے ایک حصے پر اٹک گئی ہو مثلاً۔ مانا کہ ہم پہ جور و جفا، جور و جفا، جور و جفا . . . یا تعریف اُس خدا کی، خدا کی، خدا کی . . . . . اور روئے بفرو خٹم بفرو خٹم بفرو خٹم — شاید اسی میں آرٹ ہو۔

ہو سکتا ہے کہ ہماری توقعات زیادہ ہوں لیکن یہ گانے کا ریکٹ اس نے خود شروع کیا تھا۔ بلبل کو شروع شروع میں قبول صورتی، گانے بجانے کے شوق اور نفاست پسندی نے بڑی شہرت پہنچائی کیونکہ یہ خصوصیات دوسرے پرندوں

میں یکجا نہیں ملتیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کی نوعیت جاتی رہی اور لوگوں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ ادھر بلبل پر نئی نئی تحریکوں اور جدید قدروں کا اتنا سا بھی اثر نہیں ہوا چنانچہ اب بلبل سو فیصدی رجعت پسند ہے۔ کچھ لوگ اس زمانے میں بھی بلبل کے نغموں، چاندنی راتوں اور پھولوں کے شائق ہیں۔ یہ لوگ حالاتِ حاضرہ اور جدید مسائل سے بے خبر ہیں اور سماج کے مفید رکن ہرگز نہیں بن سکتے، وقت ثابت کر دیگا کہ . . . وغیرہ وغیرہ۔

جیسے گرمیوں میں لوگ پہاڑ پر چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح پرندے بھی موسم کے لحاظ سے نقلِ وطن کرتے ہیں، بلبل کبھی سفر نہیں کرتی۔ اس کا خیال ہے کہ وہ پہلے ہی سے وہاں ہے جہاں اسے پہنچنا چاہیے تھا۔

ہمارے ادب کو دیکھتے ہوئے بھی بلبل نے اگر اس ملک کا رُخ کیا تو نتائج کی ذمّہ دار خود ہوگی۔

## بھینس

بھینس موٹی اور خوش طبع ہوتی ہے۔

بھینسوں کی قسمیں نہیں ہوتیں وہ سب ایک جیسی ہوتی ہیں بھینس کا وجود بہت سے انسانوں کے لیے باعثِ مسرت ہے۔ ایسے انسانوں کی زندگی میں بھینس کے علاوہ مسرتیں بس گنی گنائی ہوتی ہیں۔

بھینس کا اہم عنصر چوپایہ گائے دنیا بھر میں موجود ہے لیکن بھینس کا فخر صرف ہمیں ہی

نصیب ہے۔ نسبت میں گانے کے وزن پر سُر اگائے ہوتی ہے، سُر اُبھیتس کہیں نہیں ہوتی۔

جغرافیہ دان کہتے ہیں کہ افریقہ میں بھینس سے ملتی جُلتی کوئی چیز ہرن ہوتی ہے مگر وہ دودھ نہیں دیتی۔ جغرافیہ دان اتنا نہیں سمجھتے کہ جو چیز دودھ نہ دے بھلا وہ بھینس جیسی کیونکر ہو سکتی ہے۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بھینس اتنی ہی بے وقوف ہے جتنی دکھائی دیتی ہے یا اس سے زیادہ۔ کیا بھینسیں ایک دوسرے سے محبت کرتی ہیں؟ غالباً نہیں۔ محبت اندھی ہوتی ہے مگر اتنی اندھی نہیں۔

بھینس کے بچے شکل صورت میں ننھیال اور ددھیال دونوں پر جاتے ہیں، لہٰذا فریقین ایک دوسرے پر تنقید نہیں کر سکتے۔

بھینس سے ہماری محبت بہت پرانی ہے، بھینس ہمارے بغیر رہ لے لیکن ہم بھینس کے بغیر ایک دن نہیں رہ سکتے۔ آج کل یہ شکایت عام ہے کہ لوگوں کو کوٹھی ملتی ہے تو ایسی جس میں گیراج تک نہیں ہوتا جہاں بھینس باندھی جا سکے۔

جس گھر میں بھینس ہو اور بھینس کہاں نہیں ہے؟ وہاں اندرون حویلی سب کے سب بھینس کے چکنے اونٹے ہوتے دودھ کے لمبے لمبے گلاس چڑھاتے ہیں پھر خمار چڑھتا ہے، کائنات اور اس کا کھیل بے معنی معلوم ہونے لگتا ہے۔ ایک اور دنیا کے خواب نظر آتے ہیں۔ رہ گئی یہ دنیا، سو یہ دنیا تو بابا ہے بابا!

کئی بھینسیں اتنی بھدّی نہیں ہوتیں، مگر کچھ ہوتی ہی ہیں۔ دُور سے یہ پتہ چلانا مشکل ہو جاتا ہے کہ بھینس اس طرف آ رہی ہے یا اُس طرف جا رہی ہے۔ رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر ۔ والا شعر یاد آ جاتا ہے۔

بھینس اگر ورزش کرتی اور غذا کا خیال رکھتی تو شاید چھریری ہو سکتی تھی لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بعض لوگ مکمل احتیاط کرنے پر بھی موٹے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

بھینس کا مشغلہ جگالی کرنا ہے یا تالاب میں لیٹے رہنا، وہ اکثر نیم باز آنکھوں سے اُفق کو تکتی رہتی ہے، لوگ قیاس آرائیاں کرتے ہیں کہ وہ کیا سوچتی ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں سوچتی۔ اگر بھینس سوچ سکتی تو رونا کس بات کا تھا۔

ڈارون کی تھیوری کے مطابق صدیوں سے ہر جانور اسی کوشش میں ہے کہ اپنے آپ کو بہتر بنا سکے۔ یہاں تک کہ بندر انسان بن گئے ہیں۔ بھینس نے محض سُستی کی وجہ سے اس تگ و دو میں حصہ نہیں لیا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ارتقائی دور ختم ہو چکا کیونکہ انسان بالکل نہیں سُدھر رہا۔ بھینس یہ سب نہ جانتی ہے نہ جاننا چاہتی ہے۔ اگر معلّمین اُسے نقشوں اور تصویروں کی مدد سے سمجھانا چاہیں تب بھی بے سود ہو گا۔

بھینس کا حافظہ کمزور ہے، اسے کل کی بات آج یاد نہیں رہتی۔ اس لحاظ سے وہ انسان سے زیادہ خوش نصیب ہے۔

اگر بھینس کی کمر میں پتھر یا لٹھ آ لگے تو پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھتی، ذرا سی کھال ہلا دیتی

ہے بس ۔ اسے فلسفۂ عدم تشدّد کہتے ہیں۔

بھینسے کو بالکل نکمّا سمجھا جاتا ہے۔ اسے ہل میں جوتنے کی سکیم ناکامیاب ثابت ہوئی۔ کیونکہ وہ دائمی طور پر تھکا ہُوا اور ازلی سُست ہے ۔ اس نے بچپن میں بھینس کا دُودھ پیا تھا۔

کبھی کبھی بھینسا چہرے کی جھرّیوں کو دیکھ کر چونک اُٹھتا ہے اور سینگ کٹا کر کٹڑوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ حرکت کون نہیں کرتا۔

بھینس کے سامنے بین بجائی جائے تو نتیجہ تسلّی بخش نہیں نکلتا، بھینس کو بین سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

کبھی کبھی مجھ پر مُوڈ آتے ہیں جب میں گائے بکری وغیرہ کو بھی بھینس جیسا سمجھنے لگتا ہوں۔

## اُلّو

اُلّو بُردبار اور دانشمند ہے لیکن پھر اُلّو ہے۔

وہ کھنڈروں میں رہتا ہے۔ لیکن کھنڈر میں رہنے کی وجوہات دوسری ہیں۔ اُلّو کا ذکر پُرانے بادشاہوں نے اپنے روزنامچوں میں اکثر کیا ہے لیکن اس سے اُلّو کی پوزیشن بہتر نہیں ہو سکی۔

اُلّو کی بیس قسمیں بتائی جاتی ہیں میرے خیال میں پانچ چھ قسمیں کافی تھیں ویسے

الوؤں کی عادتیں آپس میں اس قدر ملتی جلتی ہیں۔ ایک الّو کو دیکھ لینا تمام الوؤں کو دیکھ لینے کے مترادف ہے۔

الّو کو وہی پسند کر سکتا ہے جو فطرت کا ضرورت سے زیادہ مدّاح ہو۔

روزمرّہ کے الّو کو بوم کہا جاتا ہے۔ اس سے بڑے کو چغد یا چغد سے بڑا الّو ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔

پالتو الّو وہ لوگ رکھتے ہیں جو اس قسم کی چیزوں کو پالنے کے عادی ہوں۔

الّو کی شکل و صورت میں اصلاح کی بہت کچھ گنجائش ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک الّو دوسرے الّو کو کیونکر بھا جاتا ہے۔

دن بھر الّو آرام کرتا ہے اور رات بھر ہُو ہُو کرتا ہے اس میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے؟ — میرا قیاس اتنا ہی صحیح ہے جتنا کہ آپ کا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ الّو تو ہی تُو کا وظیفہ پڑھتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو وہ اُن خود پسندوں سے ہزار درجہ بہتر ہے جو ہر وقت میں ہی میں کا ورد کرتے رہتے ہیں۔

شوخ اور باتونی پرندوں میں الّو کا مرتبہ بہت بلند ہے کیونکہ وہ چپ چاپ رہتا ہے اور غالباً حسِ مزاح سے محروم ہے۔ بہت سے لوگ محض اس لیے ذی فہم سمجھے جاتے ہیں کہ وہ کبھی نہیں مسکراتے۔

الّو یہ انتظار نہیں کرتے کہ کوئی ان کا تعارف کرائے۔ دیکھتے دیکھتے یوں بے تکلف ہو جاتے ہیں جیسے ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔ شریکِ حیات منتخب

کرتے وقت اُلّو طبیعت، شکل و صورت اور خاندان کا خیال نہیں رکھتے۔ تبھی وہ صدیوں سے ویسے کے ویسے ہیں۔

مادہ ننھے اُلّوؤں کی بڑی دیکھ بھال کرتی ہے مگر جونہی وہ ذرا بڑے ہوتے اور ان کی شکل اپنے اباسے ملنے لگی انھیں باہر نکال دیتی ہے۔

اُلّو کو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ یہ سب بے سُود ہے۔

اُلّو دوسرے پرندوں سے میل جول کو اچھا نہیں سمجھتا۔ وہ اپنا وقت اور زیادہ اُلّو بننے میں صرف کرتا ہے ——آپ کام سو مہا کام—— اُلّو کا مقولہ ہے

اُلّو کا محبوب مشغلہ رات بھر بھیانک آوازیں نکال کر پبلک کو ڈرانا ہے، وہ جانتا ہے کہ پبلک کیا چاہتی ہے۔ ہمارے ملک کی مثالی توہم پرستی میں اُلّو نے قابلِ تقلید حصّہ لیا ہے۔ بہت سے لوگ اپنی ناکامیوں کا سبب اس غریب اُلّو کو بتاتے ہیں جو مکان کے پچھواڑے درخت پر رہتا ہے۔ اُلّو کی نحوست ہوتی ہے مگر اتنی نہیں۔

اُلّو اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ اچھے تو وہ ہوتے ہیں جو دور جنگلوں میں رہتے ہیں۔ اُلّوؤں کو بُرا بھلا کہتے وقت یہ مت بھولیے کہ انھوں نے اُلّو بننے کی انتہا تھوڑا ہی کی تھی۔

ماہرین غور کرتے رہتے ہیں کہ اُلّو ہمیشہ تنہا کیوں نکلتا ہے، اُلّوؤں کا پٹھا

باہر کیوں نہیں نکلتا۔ ماہرین کو یہ بھی ڈر ہے کہ اُلو دن بدن کم ہوتے جا رہے ہیں کہیں نایاب نہ ہو جائیں۔ انھیں فکر نہیں کرنا چاہئے۔ ایسی چیزیں کبھی نہیں گھٹتیں، یہ ہمیشہ رہنے کے لئے آئی ہیں

ویسے اُلوؤں کے بغیر گذارا ہو سکتا ہے۔ مگر وہ بات نہیں رہے گی۔

اُلو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگے تو اس کی نیت آپ کو پریشان کرنے کی نہیں ہوگی۔ آپ بھی تو اسے گھور رہے ہیں۔ ذرا سی دیر میں وہ زبان ہلائے بغیر آپ کو ہم خیال بنائے گا — اسے ہپناٹزم کہتے ہیں۔

اُلو کی تلاش میں آپ کو زیادہ دُور نہیں جانا پڑے گا۔ اُلو آپ کے قیاس سے کہیں قریب ہے۔ انسان کو ناشکرا نہیں ہونا چاہئے۔ دُنیا میں اُلو سے زیادہ بُری چیزیں بھی ہیں — دو اُلو۔

اُلو اس بات کا ثبوت ہے کہ اگر قدرت ایک مرتبہ کچھ ٹھان لے تو پورا کر کے رہتی ہے۔

اس ساری لے دے کے باوجود اُلو کی زندگی کسی نہ کسی طرح گذر ہی جاتی ہے

## بلّی

بلّیاں سلطنتِ برطانیہ کے مختلف حصّوں میں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ بلّیوں پر کبھی سُورج غروب نہیں ہوتا۔

بلّیوں کی کئی قسمیں بتائی گئی ہیں۔ جو لوگ بلّیوں کی قسمیں گنتے رہتے ہیں۔ ان کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ بلّیاں پالنے والوں کو یہ وہم ہو جاتا ہے کہ بلّی انھیں خواہ مخواہ چاہتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ بلّی کے قیام وطعام کا بندوبست کرتے ہیں —— کاش کہ ایسا ہی ہوتا۔

بلّیاں دو ہفتے کی عمر میں ناز و انداز دکھانا شروع کر دیتی ہیں بغیر کسی ٹریننگ کے۔ سُنا ہے کہ کچھ بلّیاں دوسری بلّیوں سے خوبصورت ہوتی ہیں۔ بعض لوگ سیامی بلّی کو حسین سمجھتے ہیں (ایسے لوگ کسی چیز کو بھی حسین سمجھنے لگیں گے) انگورا کی بلّی کی جسامت اور خدوخال کتّے سے زیادہ ملتے ہیں۔ ویسے ایرانی بلّی ایک اچھی آل راؤنڈ بلّی کہی جا سکتی ہے۔

ایران میں ایرانی بلّیوں پر غیر ملکی بلّیوں کو ترجیح دی جاتی ہے —— سودیشی بدیشی کا سوال ہر جگہ ہے۔

ایرانی بلّی بھی تماشہ ہے، کبھی گربۂ مسکین بن جاتی ہے اور کبھی نہ بنی کہ چوں گربہ عاجز شود —— شاید ایرانیوں نے اپنی بلّی کو نہیں سمجھا، یا شاید سمجھ لیا ہے۔

بلّیاں میاؤں میاؤں کرتی ہیں، قنوطی بلّی می ی ی آ آ ؤ ؤ ں کہتی ہے تاکہ ہر ایک سُن لے۔ جب بلّی زیرِ لب بڑبڑانا شروع کر دے اور تنہائی میں دیر تک بڑبڑاتی رہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ زندگی کے بہترین دن گذار چکی ہے۔

گرمیوں میں بلّیاں پنکھے کے نیچے سے نہیں ہلتیں، سردیوں میں بن ٹھن کر ربن بندھوا کر

دُھوپ سینکتی ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی کا مقصد یہی ہے۔ بلی کا بورڈ وا ہن نوعمر لڑکے لڑکیوں کے لیئے مُہلک ہے۔ اُنھیں یقین ہو جاتا ہے کہ جو کچھ بلی کے لئے مفید ہے وہ سب کے لیئے مفید ہوگا۔

لوگ پوچھتے ہیں کہ بلیاں اتنی مغرور اور خود غرض کیوں ہوتی ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر آپ کو محنت کئے بغیر ایسی مرغن غذا ملتی رہے جس میں پروٹین اور وٹامن ضرورت سے زیادہ ہوں تو آپ کا رویّہ کیا ہوگا؟

بلی دوسرے کا نکتۂ نظر نہیں سمجھتی۔ اگر اسے بتایا جائے کہ ہم دُنیا میں دوسروں کی مدد کرنے آئے ہیں تو اس کا پہلا سوال یہ ہوگا کہ دوسرے یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔

سال بھر میں بلی سدھائی جا سکتی ہے، مگر سال بھر کی مشقت کا نتیجہ صرف ایک سدھائی ہوئی بلی ہوگا۔ جہاں بقیہ چوپائے دودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہیں وہاں بلی دودھ پینے والے جانوروں سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر غلطی سے دُودھ کھلا رہ جائے تو آپ کی سدھائی ہوئی بلی پی جائے گی۔ اگر دودھ کو بند کر کے قفل لگا دیا جائے تب بھی پی جائے گی، کیونکر — ؟ یہ ایک راز ہے جو بلیوں تک محدود ہے شکی لوگ بلیوں پر اعتبار نہیں کرتے، بلّیاں کیا کریں۔ ان پر ایسا وقت بھی آتا ہے جب انہیں خود اپنے آپ پر اعتبار نہیں رہتا۔

بلی کو بلانے کے لئے پُوس پُوس، مانو مانو، یا پُسی پُسی جیسے مہمل اور غیر مہذب

کلمات استعمال کیئے جاتے ہیں اور بلی پھر بھی نہیں آتی، کبھی کوئی بلی خواہ مخواہ ساتھ ہو لیتی ہے جہاں جاؤ پیچھا کرتی ہے۔ایسے موقعوں پر سوائے صبر و شکر کے اور کوئی چارہ نہیں۔

بلیاں پیار سے پنجے مارتی ہیں اور کبھی چند وجوہات کی بنا پر "غیر بلی" نہیں سمجھتے کاٹ بھی لیتی ہیں ___ شکر ہے کہ بلی کے کاٹے کا علاج آسان ہے، اس کا کاٹا پاگل نہیں ہوتا۔

بلیاں آپس میں لڑتی ہیں تو ناخنوں سے ایک دوسرے کا منہ نوچ لیتی ہیں اور مہینوں ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہتی رہتی ہیں۔

بلی اور کتے کی رقابت مشہور ہے، بلی برداشت نہیں کر سکتی کہ انسان کا کوئی وفادار دوست ہو، بلی میں برداشت بہت کم ہوتی ہے۔

بلی اپنی کمر کو خم دے کر بہت اُونچا کر لیتی ہیں اور دیر تک کیئے رکھتی ہیں، اس کی وجہ تو وہی جانتی ہوں گی ۔مگر وہ جو کچھ کرتی ہیں اکثر غلط ہوتا ہے ___ ممکن ہے اس طرح وہ گیئر بدلتی ہوں۔

جب بلی چاند کی طرف دیکھ کر بُری طرح رونے لگے تو رونے کا رُخ آپ کی طرف یا میری طرف نہیں۔یہ سب کسی اور بلی کے لئے ہے۔

چند بلیاں گھر میں سارے چوہوں کو ختم کر سکتی ہیں، چوہے تو دفع ہو جائیں گے ___ مگر بلیاں رہ جائیں گی۔بلیاں دن بھر میک اپ کرتی رہتی ہیں، ان کی جلد پہ طرح

طرح کے ڈیزائن ہوتے ہیں۔ موٹی بلیاں اپنے جسم پر لمبائی میں سیدھی دھاریاں بنالیں تو ان کا مٹاپا چھپ سکتا ہے، وہ چھریری اور کیبوٹ معلوم ہوں گی۔

بلیاں دوپہر کو سو جاتی ہیں، وہ رات تک انتظار نہیں کر سکتیں بعض اوقات بظاہر سوتی ہوئی بلی اِدھر اُدھر دیکھ کر چپکے سے باہر نکل جاتی ہے۔ اس سے باز پرس کی جائے تو خفا ہو جاتی ہے۔ بلی کی جگہ کوئی بھی ہو خفا ہو جائے گا۔ ایک ہی گھر میں سالہا سال گذارنے کے باوجود انسان اور بلی اجنبی رہتے ہیں ــــ زندگی کتنی عجیب ہے۔

بلی سامنے سے گذر جائے تو لوگ خوشخبری کا انتظار کرتے ہیں۔ میں یہی سمجھتا ہوں کہ جیسے میں کسی کام جا رہا تھا اسی طرح بلی بھی کہیں جا رہی ہوگی۔

اندھیرے میں کالی بلّی کا نظر آجانا خوش قسمتی سمجھا جاتا ہے ــــ پتہ نہیں بدقسمتی کیا ہوتی ہوگی۔

خیر جو کچھ بھی ہو ہم سب کی تقدیر میں بلی لکھی ہے۔ اپنی بلی سے بچنا محال ہے۔ کوئی دلیر ہو یا بزدل، عقلمند ہو یا احمق، کسی نہ کسی دن ایک بلّی اسے آلے گی ــ ویسے ایرانیوں کا اصول ہے کہ گُربہ کشتن روزِ اوّل۔

میں گھنٹوں سوچتا رہتا ہوں کہ میں بلیوں سے دور رہتا تو بہتر تھا۔

# سفرنامہ جہاز باد سندھی کا

بسم اللہ، دیباچۂ فسانہ نغمہ زنی عندلیب خانہ، رنگین ترانہ، راست براست، بلا کم و کاست، یعنی تذکرۂ جہاز باد سندھی عفی عنہٗ۔

اے صاحبو! خدا آپ کا بھلا کرے۔ مدت مدید و عرصہ بعید کا ذکر ہے کہ ایک سہ پہر کو ایک نوجوانِ نحیف و نزار (کہ جسے نوجوان سمجھنا نری خوش فہمی تھی) کافی ہاؤس کے دروازے پر زندگی سے بالکل بیزار کھڑا تھا۔ نام اس دراز قد کا جہاز باد تھا۔ تخلص سندھی اور لقب خورد۔ حلیہ اس کا فاقہ زدہ تھا اور سر کے بال ماڈرن خواتین کے بالوں سے بھی لمبے تھے۔ ناک پر ایک شکستہ عینک زندگی کے دن توڑ رہی تھی۔ شیو اس نے ہفتے بھر سے نہیں کروایا تھا۔ بغل میں اس کے کاغذوں کا ایک پلندہ تھا۔ پوشاک اس کی ایسی تھی کہ گمان تک نہ ہوتا کہ اس نے پوشاک کو پہن رکھا ہے

معلوم ہوتا تھا کہ پوشاک ہے جو اسے پہنے ہوئے ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ نوجوان انٹلکچوئل طبقے سے متعلق تھا۔۔۔!

اس نے اپنی سائیکل سنبھالی، ملازم کو اگلے روز بخشیش دینے کا وعدہ کیا اور مال روڈ پر ہوا ہو گیا۔ چوک کے سپاہیوں کو پیچھے چھوڑ تا کہیں کا کہیں جا پہنچا ایک عالی شان محل کے سامنے اُسے کچھ عجیب سی فیلنگ ہوئی جیسے خیالات کی روانی میں دفعتہً الجھن پیدا ہو گئی ہو، چونک کر دیکھا تو پچھلے پہیے میں پنکچر ہو چکا تھا۔ اتوار کا دن تھا اور دکانیں بند تھیں۔ یہاں تک کہ وہ حضرات جو ایک پمپ اور پنکچر لگانے کا ذرا سا سامان لے کر سائیکل ورکس کھول لیتے ہیں اور پروپرائٹر کہلاتے ہیں غائب غلّا ہو چکے تھے۔

اتنے میں محل کے دروازے سے ایک شخص ہاتھ میں کارآمد شے تھامے نمودار ہُوا۔ اسے دیکھ کر جہاز باد کی عینک مسرّت سے چمک اُٹھی، اس نے بڑھ کر پمپ مانگا۔ اس شخص نے دے دیا۔ جہاز باد نے اسے کھینچا، مروڑا، کھولنے کی کوشش کی لیکن ناکامیاب رہا، بس پہ وہ مردِ توانا زیرِ مونچھ مسکرایا (کہ اس کا چہرہ ایک جوڑی سیاہ گھنی اور عمدہ مونچھوں سے مزیّن تھا) اور بولا۔۔۔ اے مردِ نادان مزید کوشش عبث ہے کیونکہ یہ پمپ نہیں ڈنڈا ہے۔

جہاز باد نے سائیکل ایک طرف رکھ دی اور محل کی جانب متوجہ ہُوا، دروازے پر بورڈ پڑھا تو عینک کے شیشے صاف کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، لکھّا تھا۔۔۔

'جہاز بادسندھی کلاں۔"

ذرا قریب گیا تو مرغانِ نواسنج کی زمزمہ پردازی دل کو لبھانے لگی، ہزار و طوطی کی صدا آنے لگی، انواع و اقسام کی خوشبوؤں سے دماغ طبلۂ عطار بن گیا۔ ذرا سی دیر میں یہ طبلہ بجنے لگا: ریڈیو پر نغمۂ دلربا اور رباب کی آوازِ خوش کانوں میں آئی۔ طعمۂ لذیذ کی خوشبو آتی تھی۔ بادۂ خوشگوار کی صراحی قلقل کی صدا سُناتی تھی۔ دیکھا کہ احبابِ بذلہ سنج اور خاتونانِ ذی مرتبہ رنگ رلیاں مناتی ہیں، ہمجولیاں قہقہے لگاتی ہیں۔

جہاز باد سوچنے لگا کہ صرف خورد اور کلاں کا فرق ہے، مگر کوئی مجھ سا بے نصیب، بدطالع، بدبخت ہے، کوئی صاحبِ تاج و تخت ہے۔ اس مکان کے مکین پر بڑی عنایت ہے اور مجھ گنہ گار پر یہ عتاب۔ یہ کسی شاہِ فلک بارگاہ کا ایوانِ سپہرِ توآمان ہے، یا روضۂ رمضان ہے، کہیں حُور ہے تو کہیں غلمان ہے۔

ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسی مردِ قوی موچھ نے آکر پیغام دیا ہے کہ صاحبِ مکان نے فرمایا ہے کہ ہمارا سلام بولو۔ جہاز باد خورد نے کہا — وعلیکم السّلام اور رُخصت مانگی کا قصد کیا۔ مگر وہ مردِ قوی ہیکل کہنے لگا کہ صاحبِ خانہ یاد فرماتے ہیں۔ جہاز باد سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو صاحبِ مکان کوئی ماہرِ نفسیات ہے جس نے اتنی دُور سے میرا تجزیۂ نفسی کر کے خیالات بھانپ لئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس موچھ مچھندر نے ہاتھ پکڑا اور اندر لے گیا۔

جہاں شاندار دعوت منعقد تھی۔ حیرت ہوئی کہ یا الٰہی اتنی خوبرو اور گلبدن حسینانِ پُرفن شوخ و شنگ رشکِ گُل رخانِ فرنگ کیونکر ایک مقام پر جمع ہیں۔

جہاز باد سندھی کلاں بڑے تپاک سے ملا اور گویا ہوا — "اے معزز اجنبی حضرت دیکھنے میں تو آپ انٹلکچوئل معلوم ہوتے ہیں۔"

جہاز باد خورد نے اثبات میں سر ہلایا۔ جہاز باد کلاں کی باچھیں کھل گئیں — "الحمدللہ — یہ خاکسار بھی کبھی انٹلکچوئل تھا۔ یہ سب شہزادیاں اور شہزادے ایسے ہیں جو انٹلکچوئل ہیں۔ ہونے والے ہیں یا کبھی تھے — آپ ان سے ملئے۔"

سب خوب بغلگیر ہو ہو کر ملے، اگرچہ جہاز باد خورد گدگدی سے بہت ڈرتا تھا وہ عید کے روز چھپتا پھرتا، تاہم ایک موہوم سی اُمید پر اس نے بغلگیر ہونا شروع کر دیا۔ لیکن جب شہزادیوں کا نمبر آیا اور اس نے سُرخ لباس والی حسین شہزادی سے بغلگیر ہونے کی کوشش کی تو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ وہ فوراً دو قدم پیچھے ہٹ کر بولی — "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی —" جب دونوں جہاز بادوں نے ایک دوسرے کا نام سنا تو کمال درجہ محظوظ بھی ہوئے اور محفوظ بھی۔

جہاز باد کلاں نے خورد کو ایک چھوٹا پیگ دینا چاہا تو وہ معذرت خواہی کرتے ہوئے گویا ہوا — "یا پیرو مُرشد ابھی سورج نظر آتا ہے، غروب آفتاب سے پہلے وہسکی سے گریز کرنا چاہیئے۔ البتہ بیئر وقت کی چیز ہے —"

جہاز باد کلاں یہ تعزیرسُن کر دم بخود رہ گیا، عش عش کرنا چاہتا تھا لیکن

شہزادیوں کی طرف دیکھ کر ارادہ ملتوی کر دیا اور یوں بولا۔ " اے بامذاق انسان بیئر کا گلاس نوشِ جان فرما اور بار بار دروازے کی طرف مت دیکھ، تیری سائیکل ہم نے مرمّت کے لئے بھیج دی ہے۔"

ہوا النّشانی کہہ کردہ جام جہاز باد خوردہ نے پیا اور دُوسرا انڈیلنے لگا، جہاز باد کلاں نے اس کی جانب شفقت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ " اے نوجوانِ سلیقہ شعار ہم خوش ہوئے۔ لیکن یہ مت بھولیو کہ یہ خدائے ذوالجلال کے ہاتھ میں ہے کہ ایک گدائے بے نوا کو چشم زدن میں صاحبِ دولت و جاہ کرے اور زرداروں سے مالدار کو ذرا سے اشارے سے تہہِ خاک و تباہ کر دے۔ تُو ضرور حیران ہو گا کہ یہ نعمتیں ہمیں کیونکر میسّر آئیں، یہ فرمانبردار بہرے جنھیں سُنائی بھی دیتا ہے یہ افرنگی بیئر جو غلط شدہ غم صحیح کرتی ہے، یہ پُر رونق محفلیں، یہ سب کچھ ہمیں یونہی نہیں ملا — ہم —"

" واحد متکلم صیغہ استعمال کیجئے" ۔ ایک طرف سے آواز آئی۔

" معاف کیجئے، تو اس کے لئے مجھے کیا کیا مصیبتیں اٹھانی پڑیں اس کا ذکر میں ابھی سُناؤں گا"۔

محفل میں یکلخت کھلبلی سی مچ گئی۔ کوئی گھڑی دیکھنے لگا۔ کسی کو ضروری کام یاد آ گیا۔ کسی نے کہا اباجان انتظار کر رہے ہوں گے، کوئی بولا یہ کہانی اتنی مرتبہ سُنی ہے کہ زبانی یاد ہو چکی ہے۔ جب سب جا چکے تو جہاز بادِ کلاں نے خوردہ کے لئے

چوتھا گلاس اُنڈیلا، کباب سامنے رکھے اور یوں کلام کیا ۔

## جہاز باد سندھی کا پہلا سفر

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا مے رود معمار کج

اے میرے معزز ہم نام تُو نے ان شہزادیوں کی مینا چشمی دیکھی، حیرت ہے کہ تجھے کوئی ضروری کام یاد نہ آیا، یہ تبیر پھُسپھُسی معلوم ہوتی ہے، نئی بوتل کھول اور خُدا کی قدرت کا تماشہ دیکھ۔"

" اے میرے محترم ہم نام، اِدھر اُدھر کی باتوں سے پرہیز فرما اور اپنا سفر بیان کر۔"

"یہ ان دنوں کا ذکر ہے" کلاں گویا ہُوا۔ "کہ جب یہ خاکسار نیا نیا جوان ہوا تھا۔ اُن دنوں جے۔ باد سندھی کہلاتا تھا۔ بعد میں جے۔ بی سندھی ہوگیا۔ اُس علاقے میں کئی اور جے۔ بی۔ سندھی بھی تھے چنانچہ کلاں کا اضافہ کیا۔ ناچیز کو فنونِ لطیفہ، فنونِ لطیفہ شناسی، فنونِ حرب و ضرب، فنونِ جمع تفریق میں خاصی شُدبُد تھی۔ موسیقی میں وہ مہارت تھی کہ شدھ سارنگ، شدھ کلیان، شدھ مکر دھوج سب بخوبی گا سکتا تھا۔ لیکن طبیعت میں اس بلا کی سادگی تھی کہ ایک بھیڑیے کو السیشن کتا سمجھ کر پکڑ لایا اور کئی دنوں تک ساتھ ساتھ لئے پھرا، جب غلطی کا احساس ہُوا تو ایک بھیڑ کے ہمراہ

اسے رخصت کیا، سیب کے درخت کو تبھی پہچان سکتا اگر اس میں سیب لگے ہوں، ورنہ پھلوں یا پھولوں کے بغیر پودے اور درخت میرے لئے یکساں تھے۔ نصیب دشمناں علیل ہوا تو طبیب نے ایک کاغذ پر کچھ لکھ دیا۔ حقیر نے گلے میں باندھ لیا اور شفا پائی، بعد میں پتہ چلا کہ وہ تعویذ نہ تھا، نسخہ تھا۔ ایک مرتبہ سُرمہ ملنے پر حکیم جی سے دریافت کیا کہ اسے کھانا کھانے سے پہلے استعمال کروں یا بعد میں۔ لُغت میں قیلولے کے معنے دیکھے تو ہکّا بکّا رہ گیا، برسوں دوپہر کے کھانے کے بعد سویا کیا لیکن کبھی احساس تک نہ ہوا کہ ایسی معمولی سی حرکت کے نتائج قیلولے کی شکل میں برآمد ہوتے ہیں کرتا ف جس کا حلق میں فلک شگاف گونج پیدا کرتا ہے۔ جب فارغ التعلیم ہوا یعنی تعلیم نے مجھ سے فراغت پائی تو چند جاں نثاروں نے سیاست کی طرف رغبت دلائی۔ فدوی نے رجوع کیا اور رات دوگنی دن چوگنی ترقی نصیب ہوئی۔ میری آتشیں تحریروں نے کئی جگہ لاٹھی چارج کرایا۔ متعدد مقامات پر جوتا چلا، کئی اخبارات ضبط ہو گئے۔ اس حیرت انگیز مقبولیت کی وجہ میرے دو جگری دوست تھے۔ جو بے حد معمولی صلے کے عوض یہ سب کچھ لکھ دیا کرتے۔ فلکِ کج رفتار کو میری شہرت ایک آنکھ نہ بھائی اور دفعتاً میری تحریریں تمام ہوئیں۔ چند ہی مہینوں میں خود غرض دنیا مجھے بھول گئی، محض میرے دوستوں کی وجہ سے ـــ"

"تو کیا آپ کے وہ دوست داعیٔ اجل کو لبیک کہہ اُٹھے ـــ؟"

"نہیں! ان میں سے ایک تو ضلعدار بن گیا اور دوسرا مجسٹریٹ درجہ سوئم۔ کچھ

دنوں کے لئے تو دنیا اندھیر معلوم ہوئی۔ پھر شاعری کا شوق چرایا، محروم تخلص کیا غزل میں ترنم کا یہ عالم تھا کہ ہر شعر کی دُرت لے پر بھی تین تالہ بج سکتا تھا اور ولمپت لے پر بھی۔ غزل کے لئے طبیعت غیر حاضر ہوتی تو آزاد نظم بڑی آزادی سے کہہ لیا کرتا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ محلسرا کے باہر جو ہیچمدان کے نام کا بورڈ لگا ہوا تھا وہ کسی ضرورت مند نے چرا لیا، دروازہ نئے بورڈ سے مرصع کیا گیا۔ مجھے بغرضِ تبدیلیٔ آب و ہوا خانیوال جانا پڑا، واپس لوٹا تو خطوط کا ایک پلندہ منتظر پایا، یہ سب تعزیت نامے تھے۔ حیران تھا کہ کس نے کس کی جانِ آفریں کس کے سپرد کی۔ جو بورڈ دیکھتا ہوں تو کاتب نے غلطی سے محروم کی مرحوم لکھ دیا تھا۔ اسی روز بورڈ بدلا۔ لیکن شہر بھر میں رسوا ہو چکا تھا۔ سندھی تخلص کرنے سے بھی کوئی فرق نہ پڑا شاعری ترک کرنا پڑی۔ پھر سوچا کہ اے مردِ باہمت شاعری گئی تو کیا ہوا اور بہت سے مفید مشغلے ہیں۔ اس ملک میں انسان کی اوسط عمر بیس بائیس سال ہے تو یہ عمر کبھی کی گذار چکا۔ اب اپنے آپ کو مرحوم ہی سمجھ اور پیری مریدی کی طرف رجوع کر، ایک دفعہ نام چمک اٹھا تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس ناچیز نے اس سلسلے میں بڑا مطالعہ کیا۔ بہاول پور اور سندھ کے تکیوں میں بیشتر وقت گذارا۔ قابل فقیروں سے ٹریننگ حاصل کی بھنگ سے بصیرت افروز ہوا۔ لیکن قسمت میں چکر لکھا تھا کہ کسی ایک لائن کو سٹک نہ کر سکا۔ ایک دن اتفاق سے آلڈس ہکسلے، ورجینیا وُلف، برٹرنڈ رسل کی کتابیں ایک کباڑیئے کے ہاں اتنی سستی مل گئیں کہ خریدنا

پڑیں۔ چونکہ خرید چکا تھا اس لئے ورق گردانی پہ مجبور ہو گیا، اچھا بھلا بیٹھا تھا، اچانک بشارت ہوئی کہ تُو انٹلکچوئل ہے۔ اگرچہ یہ دُرِ بے بہا خاکسار نے ورثے میں پایا تھا تاہم خاندانی انٹلکچوئل کہلاتے شرم آتی تھی۔ چنانچہ میں نے کافی ہاؤس جانا شروع کر دیا پوشاک، غذا، ورزش اور حلیئے سے لاپرواہ ہوتا چلا گیا۔ سب سے الگ تھلگ رہنے لگا۔ پڑوسیوں سے بات کرنا تو ایک طرف ان کی طرف دیکھنا بھی گناہ سمجھتا۔ قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ میری زندگی ایک انقلاب سے آشنا ہوئی۔ ایک چاندنی رات کو جب میں کافی ہاؤس سے لوٹا تو ایک پرندہ بالکل میرے سر کے اوپر سے گذر گیا، یہ واہمہ نہ تھا۔ تشویش ہوئی۔ کیونکہ مقامی پرندے بڑے سُست اور ڈرپوک تھے۔ اندھیرا ہونے کے بعد کبھی نظر نہ آتے۔ دل میں یہ شُبہ یقین پا گیا کہ ہو نہ ہو یہ پرندہ ہما تھا۔ اس مژدۂ جانفزا سے روح کو سرور حاصل ہوا۔ اور طبیعت کو کمال درجہ سکون۔ یوں معلوم ہونے لگا جیسے سب کچھ ساکن ہے۔ زندگی میں تسلی بخش راحت ہے، دُنیا میں امن ہے ـــ اور میں انٹلکچوئل ہوں!

اچانک ایک سائنس دان دوست نے بڑی بُری خبر سُنائی کہ میں ساکن ہرگز نہیں ہوں۔ ہر چوبیس گھنٹے کے بعد زمین کی گردش کی وجہ سے تین سو ساٹھ ڈگری گھوم جاتا ہوں۔ فضاؤں میں کئی سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے اڑا جا رہا ہوں۔ سُورج کے گرد ہر سال بیس کروڑ میل کی مسافت طے کرتا ہوں اور کہکشاں کی جانب ڈیڑھ سو میل فی سیکنڈ کی رفتار سے جھکا جا رہا ہوں ـــ ادھر کی گردش، اُدھر کی گردش، اس طرف

اس طرف، ہر طرف رواں دواں، میرے کانوں میں تیز ہوا سے شُوں شُوں ہونے لگی۔ چکّر پر چکّر آنے لگا۔ فوراً 'ٹھیکہ شراب دیسی' پر پہنچا (جہاں ہندوستانی شرفاء بیٹھ کر پی سکتے ہیں) جب باہر نکلا تو دُنیا تاریک تھی۔ دروازے پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا کروں اتنے میں شاہراہ پر ڈھول کی آواز سُنائی دی۔ ساتھ گھنٹی بج رہی تھی۔ دونوں کی ہم آہنگی اس قدر خوش الحان معلوم ہوئی کہ مُردہ جسم میں جان پڑ گئی۔ میں لاشعوری طور پر پیچھے ہو لیا۔ جب چونکا تو اپنے آپ کو اکھاڑے میں پایا۔ غیر انٹلکچوئل ہجوم کو دیکھ کر بہت گھبرایا۔ پہلوانوں نے طرح طرح کے پٹھے ساتھ بٹھائے ہوئے تھے۔ وہاں اپنے ماموں جان کو بھی دیکھا (کہ خطاب جس نے پہلوان السنہ کا پایا تھا) وہ ایک ہاتھ ہوا میں اٹھائے ایک ٹانگ پر ناچتا ہوا اکھاڑے کا طواف کر رہا تھا۔ اس کا پٹھا پیچھے پیچھے تھا۔ غالباً میں نے اپنے عمِ محترم کا ذکر نہیں کیا کہ گھر اس کا ایک بیسویں صدی کی امریکن طرز کی محلسرائے تھی جس کا نقشہ ملکِ فرنگ کے ایک ذی فہم زیرک کاریگر نے تیار کیا تھا۔ اس کے دروازے پر بیک وقت تین چار موٹریں (کہ اہلِ فرنگ کی صناعی و جادوگری کا حیرت انگیز ثبوت ہیں) کھڑی جھومتی تھیں۔ وہ احتشام، وہ دبدبہ وہ طمطراق تھا کہ انٹلکچوئل جب سامنے سے گذرتے تو مُنہ دوسری طرف پھیر لیتے ویسے یہ مردِ طرار ناپ تول کا پورا تھا۔ فنِ نرناز و طرازی میں اس کا دور دُور تک شہرہ تھا۔ اس کے دروازے پر محتاجوں اور ضرورت مندوں کا ہمیشہ اژدحام رہتا کیونکہ آٹے اور چینی کا راشن اس کے اختیار میں تھا۔

کشتیاں ختم ہوئیں تو ماموں جان کی نظر اس طرف پڑ گئی۔ اس نے گردن سے آ دبوچا۔ زور سے دھپ لگا کر بولا۔۔۔ سنا بے گیدی یہاں کہاں پھر رہا ہے کہ مقام تیرا کافی ہاؤس اور مریل نوجوانوں کی محفل ہے، ایسی جگہ آتے ہوئے اپنے تئیں شرم محسوس نہیں کرتا؟ یہ کہہ کر وہ تو پہلوانوں کے غول کے ساتھ سوئے ڈپو روانہ ہوا اور اس فقیر کو کمال خفت اٹھانی پڑی۔ سوچنے لگا یہی مردک کبھی تانگے کے گھوڑے کی طرح لاغر تھا۔ خدا کی شان کہ ڈپو ملتے ہی اس قدر توانا ہو گیا کہ فیل بھی دیکھے تو بغیر پانی ملنگے شرم سے ڈوب مرے، اور اس پہ ایسی گفتگو۔۔۔ واللہ، یہی جی چاہتا تھا کہ سڑک پہ دراز ہو جاؤں اور اپنے آپ کو جاں بحق تسلیم کروا لوں۔ یکایک ایک صدائے روح پرور سنائی دی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خوش پوشاک نوجوان (جو فقط ایک لنگوٹے سے مرصع تھا) ڈھول پہ رقصاں ہے۔ بس پہ اس خاکسار کے پاپوشوں کو حرکت ہوئی۔ یہ حرکت آہستہ آہستہ تمام جسم میں حلول کر گئی۔ یہاں تک کہ ضبط نہ رہا اور یہ حقیر اس قلندرِ خوش لباس کے پیچھے ہو لیا۔ آگے چل کر معلوم ہوا کہ ڈھول والے کی کمر پہ ایک بورڈ ہے۔ چشم زدن میں چشمہ (جو ماموں جان کے دھپ سے اتر گیا تھا) جیب سے نکالا۔ آہ سرد بھری جس سے شیشوں پر چند قطرے نمودار ہوئے قمیص سے عینک صاف کر کے ناک پہ رکھی تو آنکھوں کو وہ تقویت پہنچی کہ بیان جس کا احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ بعد از مطالعہ انکشاف ہوا کہ وہ ریڈیم ٹانک پلز کا اشتہار تھا۔

عمِ محترم کا وہ طعنہ جو اِس ناچیز کی صحت پر کھلّم کھلا حملہ تھا تیر کی طرح پیوست ہو چکا تھا۔ قصد انتقام کا یہ نیاز مند کر چکا تھا۔

ایک دن ماموں جان نے اپنی دکان پر کسی کو چینی دینے سے معذرت چاہی۔ کیونکہ حقیقتاً اتنی چینی بچ رہی تھی جو اُس کے احباب کے لئے درکار تھی۔ اس نے گاہک کو اپنی شیریں بیانی سے خوش کرنا چاہا لیکن وہ شخص کہ شرارت کرنے پر تُلا بیٹھا تھا کاغذ کا ایک پُرزہ دکھا کر دکان کی تلاشی لینے کا متلاشی ہوا۔ عین اس وقت جب وہ مفسد دکان کے اندر گیا عمِ محترم اپنی بیوک میں بیٹھ کر محلسرا پہنچا اور خواجہ سرا سے رختِ سفر بندھوا کر سرحد کا قصد کیا۔ لیکن سب انتظامات پہلے سے مکمّل ہو چکے تھے ماموں جان کو روک لیا گیا اور سرکاری مہمان خانے میں (کہ اس ملک میں جیل کہلاتا ہے) قیام و طعام کا بندوبست دو روز تک رہا۔ اتنی دیر میں بلند مرتبہ اور عالی مقام حضرات کی سفارشیں پہنچ چکی تھیں۔ چنانچہ جب اُسے قاضی صاحب کے سامنے لایا گیا تو انھوں نے فقط پہلوان السندھ کا خطاب واپس لے کر چھوڑ دیا۔

ماموں جان کو اس صدمے نے نڈھال کر دیا۔ کیونکہ اسے پہلوانی اور ریاست بے حد عزیز تھے۔ اس کی زندگی کا مقصد صرف یہ دو چیزیں تھیں۔ میں نے بہتیرا سمجھایا کہ پہلوان السندھ کوئی ایسا بڑا خطاب نہیں جس کے لئے جان ہلکان کر لی جائے آپ پہلوان الہند بن سکتے ہیں، جیسا کہ فاضلِ اجل علامہ اقبالؒ فرما گئے ہیں — ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں —

میرا ماموں اس پر پھڑک اٹھا اور کہنے لگا ــ" واہ واہ۔ مگر برخوردار اس کا اگلا مصرعہ کیا ہے؟ وہ غالباً میرے حق میں زیادہ مفید ہوگا"

"دوسرا مصرعہ اے محترم، عشق کے امتحانوں کے متعلق ہے۔"

" واہ، تو عشق کے امتحان بھی ہوتے ہیں۔ کون سی یونیورسٹی لیتی ہے؟"

میں نے اس مردِ جاہل سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ حق تو یہ ہے کہ گو یہ شخص عم اس نانشدنی کا تھا۔ بزرگوں کا ادب پاسِ حکمِ خداوندی ہے مگر جہالت اس کے چہرے پر ہُن کی طرح یُوں برستی تھی کہ اس ناچیز کو اس کے ساتھ چلنے میں شرم محسوس ہوتی۔

"عشق کے امتحانوں کے متعلق کیا فرما گئے ہیں علاّمہ؟" اس نے اصرار کیا۔

"یہ دوسرا مصرعہ اے عمِ محترم آپ جیسے پیرِ فرتوتوں کے لئے نہیں، مجھ جیسے نوجوانوں کے لئے ہے، بہتر ہوگا کہ آپ پہلے مصرعے کا ہی اپنے اوپر انطباق کریں"۔ میں نے سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

"مجھے ستاروں سے قطعاً دلچسپی نہیں" (وہ آہِ سرد کھینچ کر بولا) مگر دوسری چیز عشق بالکل میری لائن میں ہے اور برخوردار تو گستاخ ہوتا جا رہا ہے"۔

اس نے اپنی انگلی کا ٹھینگا بنا کر میرے سر کے مختصر سے گنج پر مارا، نہایت مترنم آواز نکلی جو کانوں کو تو بھلی معلوم ہوتی۔ لیکن خودداری نے لعن و ملامت شروع کر دی یہی خیال آتا تھا کہ ملک چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں۔ پلیٹ فارم ٹکٹ خرید کر سٹیشن پہنچا

معلوم ہُوا کہ صبح سے پہلے کوئی گاڑی نہیں جاتی۔ پھر سوچا کہ اے مردِ مجہول، کیوں اپنے ماموں سے ڈرتا پھرتا ہے، طاقتور بن اور اس کا مقابلہ کر۔ اس دن سے میں نے کافی ہاؤس جانا ترک کر دیا اور ساری کتابیں ایک بھٹیارن کے حوالے کیں کہ وہ بقدرِ ضرورت استعمال میں لاوے اور ریڈیم ٹانک پلز کھانے اور مگدر گھمانے میں زندگی بسر کرنے کا تہیہ کر لیا۔ ڈنٹر پیلنے کے بعد تین گولیاں کھانا، لنچ تک مینڈکیں نکالنا لنچ پر چار گولیاں۔ پھر ڈنٹر اور مگدر، رات کو پانچ گولیاں۔ ہفتہ گذرا ہوگا، یقین جانیے بدن سے شعاعیں نکلنے لگیں۔ اندھیری سے اندھیری رات میں بغیر روشنی کے چل پھر سکتا۔ طاقت کا ایک سمندر تھا کہ ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ آٹھویں دن خواہش پیدا ہوئی کہ شیر ببر پر سواری کی جائے۔ لنگوٹا کس کر چڑیا گھر پہنچا۔ مگر شیروں کو پنجروں میں دھاڑتے دیکھ کر اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی۔ اس کے بعد خیال ہُوا کہ کیوں نہ عمِ محترم کی خبر لی جائے۔ چنانچہ اُسی لنگوٹ میں ماموں کی محل سرا پر پہنچا۔ نوکر چاکر ڈر کر بھاگ گئے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ماموں بسترِ استراحت پر بصد خضوع و خشوع دعا مانگ رہا ہے۔ کہ اے باری تعالیٰ میرے اس نابکار بھانجے کو توفیق دے کہ کافی ہاؤس جانا ترک کر دے اور اپنی روزی خود کمانے لگے۔ مجھے بھی یہی توفیق دے۔ ہم سب کو یہی توفیق دے۔ میں اب بالکل سیدھا ہو گیا ہوں۔ تیری شان ہے کہ جس کی ڈیوڑھی پر میکارڈ اور کیڈی لک جھومتی تھیں وہاں اب گدھا تک نظر نہیں آتا۔ خداوند تعالیٰ کہیں مجھے کسی الکوحل کی بد دُعا تو نہیں لگی۔"

"بس بس اے مرد بدبخت اُٹھ! میں نے تیرے فیل تن ہونے کا راز پا لیا ہے اور خبردار جو کسی انٹلکچوئل کو بُرا بھلا کہا ہے تو، خبردار جو کسی کو بھی برا بھلا کہا ہے تو، کیا ہم سب ایک جیسے نہیں، سب برابر نہیں۔ میں برابر ہوں برنارڈ شا کے، برنارڈ شا برابر ہے کنفیوشس کے، کنفیوشس مساوی ہے ابن بطوطہ کے۔"

"اے عزیز از جان بھلے بچے، آج سے مجھے اپنا ساتھی سمجھ۔ تیرے حق میں جو دعا کی تھی۔ وہ میں واپس لیتا ہوں۔" اُس نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔

دفعتہً مجھے محسوس ہُوا کہ صحت کے ساتھ ساتھ میرے عقیدے بھی بدل چکے ہیں مجھے انٹلکچوئل بننا دوبھر دکھائی دینے لگا کہ اس طبقے میں رہنا بڑا مشکل ہے۔ انھیں لوگ سمجھتے نہیں، ہر وقت مذاق اڑاتے ہیں۔ سارا جیب خرچ طبیبوں کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ کیونکہ صحت اس طبقے کی نہایت خستہ ہوتی ہے۔ ملازمت کے لئے انٹرویو میں جاؤ، تو آسان سے سوالوں کے مشکل جواب سُن کر ممبروں کو احساسِ کمتری ہو جاتا ہے اور وہ خواہ مخواہ فیل کر دیتے ہیں۔ ویسے پبلک حلیہ دیکھ کر ہی ڈر جاتی ہے۔ الغرض ان لوگوں کو سوائے ہوا پھانکنے کے اور کچھ میسّر نہیں آتا اور ہوا میں غذائیت نہیں۔ سچ پوچھو تو ارادہ اس خاکسار نے اس روز بدلا جب عیدگاہ میں دو بزرگوں کو بغلگیر ہوتے دیکھا۔ دونوں بھینگے تھے مگر بلا کے انٹلکچوئل تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، ہاتھ پھیلائے، مسکرائے، زیرِ لب کلماتِ خوشگوار لائے اور ایک دوسرے کے برابر سے نکل گئے، جب غلطی کا احساس ہُوا تو نعرے بلند ہوئے ـــ

"کہاں چلے گئے؟"—"میں تو یہاں ہوں اور تم؟"—"یہ رہا۔"

مُڑے اور بغلگیر ہونے کے قصد سے واپس لوٹے۔ لیکن اس مرتبہ پھر نشانہ خطا گیا۔ تیسری مرتبہ بغلگیری پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

رات کو اس نیاز مند نے ایک خواب دیکھا کہ اپنے ایک انٹلکچوئل استاد سے بغلگیر ہوتے وقت جو کمر پہ ہاتھ پھیرتا ہوں تو چونک پڑا۔ ان کی دُم غائب تھی۔ جاگا تو عبث شرمندہ ہوا۔ اسی دن سے میں نے اس انٹلکچوئل پنے بلکہ Pseudo-intellectual پنے سے کنارہ کشی کی۔— بھئی تو سُن نہیں رہا ہے اُونگھ رہا ہے۔"

"نہیں تو—" جہاز باد خورد دفعتہً جاگا۔

"اچھا بتا میں کیا کہہ رہا تھا—؟"

"جہاد باد جندی، رہاز بہاد زندی، بہاز یاد نندی"—

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ تبیر کا اثر ہے—"

"ہرگز نہیں! یہ سفر ہی بہت لمبا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ پیدل طے کیا گیا تھا۔ اور یا ہمدم وہ پرندہ کون سا تھا جو آپ کے سرِ مبارک کے اُوپر سے گذرا؟"

"اے ہمدم نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پرندہ وہ بوم تھا، کیونکہ اس کے بعد بھی کئی مرتبہ وہ اس حقیر کے سر پر سے گزرا۔"

کہنا تمام پہلا سفر جہاز باد سندھی کلاں کا، رخصت ہونا جہاز باد سندھی خورد کا، ساتھ

وعدہ آنے کے اگلے روز، بغرض سماعت سفر دوم۔

اگلے روز جب محفل منعقد ہوئی تو اس میں صرف دو حضرات شامل تھے، خورد او کلاں۔ ہرچند کہ استادِ کلاں نے شہزادے شہزادیوں کا بے صبری سے انتظار کیا۔ بارہا ٹیلیفون کیا لیکن مایوسی ہوئی۔ ناچار چاء منگوائی، خورد چاء دیکھ کر نہایت غمگین ہُوا اور یہ مصرعہ زبان پر لایا — چاء را کن چاء در پیش — لیکن کلاں نے اُس کی بات سُنی اَن سُنی کر دی اور بولا —

## جہاز باد سندھی کا دُوسرا سفر

حسینوں سے فقط صاحب سلامت دُور کی اچھی
نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی

اے عزیز از جاں ہم نام ایک دن چوک میں میں نے ایک شخص کو ہجوم کے سامنے تقریر کرتے سُنا — وہ کہہ رہا تھا کہ — "سب لوگ برابر ہیں، سب مرد برابر ہیں، سب عورتیں برابر ہیں، سب بچے ایک سے ہیں۔ لہٰذا سب کو برابر حقوق ملنے چاہئیں۔ زندگی آسان ہو سکتی ہے، بس میں سفر کیجئے، ساڑھے چار آنے میں سیکنڈ شو دیکھئے، اندھیرا ہو جانے پر اندر جائیے اور روشنی ہونے سے پہلے باہر نکل آئیے، میونسپلٹی نے کہیں کہیں ریڈیو نصب کئے ہیں اور ان پر موسیقی (جو اسّی فیصدی فلمی ریکارڈوں پر مشتمل ہے) اور خبریں سُنی جا سکتی ہیں۔ بک سٹال پر کھڑے ہو کر

ذراسی دیر میں تازہ رسائل اور نئی کتب کا جائزہ لیا جا سکتا ہے، ایک لمبے سے اوورکوٹ سے سردیاں نکل سکتی ہیں اور دو رنگین بُش شرٹوں سے گرمیاں، ذراسی خوشامد سے بآسانی محبت کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ مت بھولئے کہ سب لڑکے ایک جیسے ہیں اور سب لڑکیاں ایک سی ہیں، مثال کے طور پر رُوس ہیں ---"

وہ رُوس کا ذکر زبان پر لایا تو مجھے شبہ سا ہوا، اگرچہ معلومات اس احقر کی رُوس کے بارے میں نہایت محدود ہیں تاہم بحث کرنی ہو تو گھنٹوں بول سکتا ہے، "اے ہم نامِ خورد و بیزار روس کے متعلق کیا؟"

"اے ہم نامِ کلاں معلومات تو میری بھی ایسی ویسی ہیں، اگرچہ میں نے گراؤچو مارکس کی لکھی ہوئی مشہور و معروف کتاب سرمایہ داری پڑھی ہے ---"

"نہیں، یہ کتاب کارل مارکس نے لکھی ہے ---"

"تو وہ بھی تو مارکس برادرز میں سے ہوگا --- مارکس برادرز کو ماشاء اللہ کون نہیں جانتا ---!"

"خیر، تو میں تقریر سُنتا رہا، اس نوجوان کے بعد ایک شہزادی نے تقریر شروع کر دی۔ خاکسار نے تقریر سے زیادہ شہزادی میں دلچسپی لی۔ معلوم ہوا کہ اس پارٹی میں چند شہزادیاں بھی ہیں۔ ان میں سے دو تین شہزادیاں تو واللہ خوب تھیں۔ ناچیز نے چشم و دل کو ان کی دید سے تر و تازہ پایا اور اپنے تئیں اس ٹولی میں شامل ہونے پر آمادہ پایا۔

لیکن پتہ چلا کہ شامل ہونا آسان نہیں، کافی چھان بین کے بعد یہ لوگ اپنے ساتھ

شریک کرتے ہیں۔ بڑی کوشش کے بعد میں نے ان کے سرپرست کا کھوج نکالا۔ کسی نے بتایا کہ ان کے بچے سبزی ہائے تازہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ طبیبوں کا اصرار ہے کہ سبزیاں بچوں کی بہبودی کے لیے ازحد اشد ہیں۔ اُدھر بچے ہیں کہ نباتات، جمادات اور معدنیات سب کچھ کھا جاتے ہیں لیکن سبزیوں کو چھوتے تک نہیں۔ میں نے ان حضرت سے مل کر اس مہم کا بیڑا اُٹھایا۔ چند گاجریں تکیوں کے نیچے رکھ دیں، کچھ ٹماٹر بالائے طاق رکھے، شلجم کتابوں کے پیچھے چھپا دیے۔ بچوں کو جب یہ چیزیں فرداً فرداً ملیں تو سمجھے کہ اُنھوں نے چُرائی ہیں، خوب سیر ہو کر کھائیں۔ اُن کے ابا نہایت خوش ہوئے اور گلہ اپنے پیارے کتے کا کرنے لگے جو علیل تھا مگر دوائی پینے سے احتراز کرتا۔ میں نے پہلے تو دوائی اس سگِ نابکار کے دہن میں انڈیلنا چاہی جس نے متواتر ناراضامندی کا اظہار کیا تو شیشی فرش پہ پٹخ دی۔ بس پہ اس سگِ ناعاقبت اندیش نے زبان سے ساری دوائی چاٹ لی اور کیفر کردار کو پہنچا۔ وہ حضرت کمال درجہ مہربان ہوئے اور بولے ——" اے مردِ عاقل! تو دولتِ نفسیات سے مالا مال معلوم ہوتا ہے، بتا کیا مانگتا ہے؟"

میں نے آرزو بیان کی کہ کاش کہ مستقل طور پہ آپ کی صحبت سے ذوق حاصل ہو۔ الحمدللہ کہ اس مردِ گرامی نے مجھے اپنی جماعت میں شریک فرمایا۔

ایک ایک دن عیش و کامرانی میں گذرتا۔ ہم سب ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ایک سگریٹ کا ٹین کھولتا سب اس پہ ٹوٹ پڑتے۔ اسی طرح ایک دوسرے

کے کپڑے، چیزیں، روپیہ، استعمال کرتے۔ ویسے ہم لباس اچھا پہنتے تھے لیکن جب کام پر جانا ہوتا تو نہایت سادہ اور کھردرا سا لباس ہوتا۔ ایک خاص قسم کے سستے کپڑے کا بنا ہوا، سر پہ ایک عجیب سی ٹوپی ہوتی، واسکٹ اور چپلیوں کا استعمال بھی ضروری تھا ہمارا کام آسان تھا۔ کتابیں اور کتابچے تقسیم کرنا، پوسٹر لگانا، خاص خاص جلسوں میں تقریر کرنا، جہاں کوئی کھیل تماشہ ہو، بہت سے لوگ جمع ہوں وہاں شور وغل مچا کر رنگ میں بھنگ ڈال دینا۔ اس کے لئے ہمیں معاوضہ ملتا تھا۔ ہمیں اپنی ٹولی کے ممبروں کے علاوہ ہر شخص سے للہی بغض تھا۔ مگر یہ خاکسار محض شہزادیوں کے لئے شریک ہوا تھا اس لئے زیادہ نہ سیکھ سکا اور ویسے کا ویسا رہا۔ آگ خشک و تر کو یکساں جلاتی ہے۔ شہزادیوں کے قرب نے خرمنِ صبر و شکیب پہ کچھ اچھا اثر نہیں کیا۔ یہ فقیر ان میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ شہزادیوں نے سردیوں میں تو خوب تبلیغ کی، گرمیاں آئیں تو تیز دھوپ سے ان کی رنگت سنولانے لگی، ہر جگہ پنکھوں اور برف کا خاطر خواہ انتظام نہ تھا۔ موٹر بھی کئی بار پنکچر ہوئی اور پیدل چلنا پڑا۔ شہزادیوں کو شکایت تھی کہ باشندوں کی تعداد کتنی زیادہ ہے ادھر ہم کتنے تھوڑے ہیں۔ لوگ ان پڑھ ہیں سمجھتے نہیں بلکہ اب تو لوگ ہم سے چڑنے لگے ہیں۔ بھلا اور شہزادیاں ہماری طرح خدمت کرنے کیوں نہیں نکلتیں۔ اس طرح تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ پھر ایک روز ہم نے سنا کہ ایک شہزادی نے خان بہادر قلندر بیگ سے شادی کرلی ہے۔ حالانکہ خان بہادر موصوف کی گذشتہ سے پیوستہ سب بیویاں صحیح سلامت تھیں۔ دوسری نے ایک رائے بہادر

گوچنا، جو سب کی رائے میں کافی بزرگ تھے۔ جن کی بیوی کے متعلق افواہیں اُڑ رہی تھیں کہ سرگباش ہو چکی ہیں یا ہونے والی ہیں۔ یہ تازہ شگوفہ جو پھولا تو یہ ناچیز ساری چوکڑی یک دم بھول لیکن پھر سوچا کہ شہزادیوں پہ بھروسہ کرنا دلیل حماقت ہے۔ ان کی استقامت کا دم بھرنا عین جہالت ہے، یکایک تیسری شہزادی نے ایک دولتمند زمیندار سے عقد کیا۔ جس نے فوراً دو مربعے بیچ کر ایک ریکارڈ خریدی، الغرض خزاں سے پہلے ساری شہزادیاں ٹھکانے لگیں۔ ان میں سے ایک بے وفا کو میں نے یہ لکھ کر بھیجا —

؎ جو کیا تھا وعدہ نکاح کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جواب آیا ؎

بہت دنوں کے تقابل نے تیرے پیدا کیا
وہ اک نکاح جو بظاہر نکاح سے کم ہے

ہم طرح طرح کی آزادیاں چاہتے تھے، سوچنے کی آزادی، جو جی میں آئے کرگزرنے کی آزادی۔ ایک آزادی نے اس خاکسار کو کمال ذلیل وخوار کیا، ہوا یوں کہ ایک روز میں نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ سربازار اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہا ہے، سب دیکھتے ہیں اور کوئی کچھ نہیں کہتا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ قریب جاکر نصیحت شروع کی ہی تھی کہ نوجوان نے ترچھا وار کرکے ایک میرے پاؤں پر بھی جڑ دی، دو مہینے ہسپتال میں پڑا رہا۔ قصور نہ میرا تھا نہ اس کا —— میں نے آزادیٔ گفتار دکھائی تھی اور اس نے آزادیٔ کردار۔

خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ایک عجیب خواب اس ناشدنی کو نظر آیا۔ ایک رات سویا

تو کیا دیکھتا ہوں کہ جیسے گھوڑے پر سوار ہوں اور گھوڑا جنگل میں سے گذر رہا ہے۔ یکایک آہ سُنائی دی۔ حیران ہو کر ادھر اُدھر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد آہ نمبر دو سُنی، دوسری بار حیران ہوا۔

"میں نے بھری ہے" گھوڑے نے بڑی سلیس اُردو میں کہا "اور میں کیوں نہ بھروں۔ میں بھی تو جاندار ہوں۔ مُنہ میں زبان رکھتا ہوں۔ تم انسانوں کے لئے تو حقوق مانگتے ہو۔ جانوروں نے کون سا گُناہ کیا ہے؟ ڈارون کی تھیوری کے مطابق ہم سب ارتقا کی مختلف منزلوں پر ہیں ہمارا ماخذ ایک ہے لہٰذا ہم سب ایک دوسرے کے کزن ہیں۔ اے میرے کزن میں تھک گیا ہوں۔ اب تم گھوڑے بنو اور میں سواری کروں گا"

چار و نا چار اس حقیر کو گھوڑا بننا پڑا۔ باری باری ہم نے سواری کی۔ جنگل سے باہر نکل کر خیال آیا کہ اگر دونوں ساتھ ساتھ پیدل چلتے تو بہتر تھا۔ رخصت ہونے وقت میں نے اپنے کزن سے دریافت کیا کہ اگر وہ انسان بننا چاہے تو کسی ماہر نفسیات سے مل کر آٹو سجیشن کا انتظام کرایا جائے۔ لیکن وہ نہ مانا۔ بولا ان دنوں تانگے کے گھوڑوں کو چھوڑ کر بقیہ گھوڑوں کی پوزیشن انسان کی پوزیشن سے بدرجہا بہتر ہے۔

صبح جاگا تو بڑا پریشان ہوا۔ اس گفتگو کا یہ اثر ہوا کہ تانگے میں بیٹھنے سے احتراز کرنے لگا اور کوئی سواری میسر نہ تھی، نقل و حرکت محال ہو گئی، سائیکل چلا چلا کر برا حال ہوا تو عقدے ہر نئے پڑے۔ ادھر شہزادے بھی تتر بتر ہو گئے۔ کچھ رجواڑوں میں جا بسے، ایک دو

ابکڑ بن گئے ۔ باقی کے ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ ایک رہ گیا تھا۔ اسے بروقت یہ وہم رہنے لگا کہ ؎

شاید کہ پولیس خفیہ باشد

وہ بھی سُنا کہ نائب تحصیلدار بن گیا ۔۔۔ اس کے ساتھ میرا دوسرا سفر تمام ہوا، عزیز القدر! ایسی نگاہوں سے الماریوں کی طرف مت دیکھ کہ موم بھی پتھر بن جائے ۔ مجھے احساس ہے کہ سُورج غروب ہو چکا ہے ۔ آج دیسی شراب منگائی ہے ۔ کہ چلّو میں اُلّو کرتی ہے "

اگلے روز جب خاتونِ شب نے چادرِ سیاہ میں رُخِ انور چھپایا اور شاہِ خاورِ زرّیں رنگ سپہر پر جلوہ فرمایا ۔۔۔ (یعنی جب صبح ہوئی) ۔۔۔ تو دونوں جہاز بادوں کو آرام کرسیوں پر سوتا پایا کہ ساتھ ان کے چند خرگوش بھی خوابیدہ تھے ۔ آنکھ کھلنے پر غنچۂ صبح کھلکھلایا، مرغانِ خوش الحان کی زمزمہ سنجی سے کانوں نے لطفِ مزید پایا ۔ جہاز باد کلاں نے فرمایا اور زبان پر یہ کلمے لایا ۔۔۔

" اے مردِ نیک طینت ! بادۂ دیسی نہایت تیز نکلا، اب تک حالت خستہ ہے ۔ آج اچھی طرح اس شعر کے معنے سمجھ میں آتے ہیں ؎

جو آج پی ہو تو ساقی حرام شے پی ہو
یہ کل کی پی ہوئی مے کا خمار باقی ہے

یہ بتا کہ تیرے عزیز و اقربا میرا انتظار تو نہ کرتے ہوں گے، شاید تھانے میں پوچھنے

گئے ہوں"۔

"میں خدا کے فضل و کرم اور آپ کی دعا سے ناکتخدا ہوں۔" خورد نے شرما کر کہا۔

"تو ملا ہاتھ: میں بھی ناخدا — یعنی ناکتخدا ہوں، تو پھر سناؤں تیسرا سفر۔"؟

"ذرا صبر فرمائیے، سمندِ کلام کو زیرِ لگام لائیے۔"

اتنے میں ملازم نے مژدۂ جانفزا سنایا کہ چھوٹا حاضری تیار ہے، جہاز بادسندھی کرکلاں ضبط نہ کر سکا اور یوں گویا ہوا۔

## جہاز بادسندھی کا تیسرا سفر

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا
تانکنا جھانکنا کبھو نہ گیا

اے مردِ مخلص! اس موسم گرما گذارنے ملتان کے مرغزاروں میں گیا۔ وہ سرزمین جو رنگین مزاجوں کے لیے عشرت افزا گلشن اور درویشوں کے لئے دلکش خلوت کدہ ہے، جب کچھ عرصہ خوش وقت ہو کر واپس لوٹا تو ایک نیا نام سننے میں آیا جس سے کان قطعی طور پر ناآشنا تھے — نام تھا ترقی پسندی۔

معلوم ہوا کہ میری غیر حاضری میں ایسی خوشگوار ہوا چلی کہ بچہ بچہ ترقی پسند بن گیا۔ شاعری ترقی پسند ہوئی، ادب ترقی پسند بنا، سارا ملک ترقی پسندی کے گن گا رہا تھا۔ یہ

غلام بہت خوش ہؤا، ترقی کون نہیں چاہتا، بہت سے احباب جو ملازم تھے ترقی کے لئے مدّتوں سے کوشاں تھے۔ یہاں تک کہ کئی مرتبہ بیش قیمت تحفے تحائف بھی دے چکے تھے۔

نوجوان تو اس تحریک کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ ترقی پسندی کو اپنے نام کے ساتھ بطور ڈگری استعمال کرنے لگے۔ تعارف کراتے وقت ذکر کیا جاتا کہ فلاں ترقی پسند ہے یا نہیں۔

ادھر ترقی پسند ادب کا رکیٹ بڑے زوروں پر تھا۔ یہاں تک کہ پبلشرز اور ایڈیٹروں نے حدبندی مقرر کر دی اور ترقی پسند رسالوں اخباروں میں صرف ترقی پسند چیزیں ہی چھپ سکتیں۔

اس فدوی نے بڑے شوق سے اس نئے ادب کا مطالعہ کیا اور اسے بجد عام فہم پایا۔ ہر کتاب دوسری کتاب سے ملتی تھی۔ تمام افسانے ایک جیسے تھے۔ ساری غزلیں ایک سی تھیں۔ تھوڑے سے مطالعے کے بعد اتنی خود اعتمادی آگئی کہ افسانے کا آغاز پڑھ کر انجام بتا سکتا تھا، غزل کا مطلع سُن کر پیشین گوئی کر سکتا کہ بقیہ اشعار میں کیا ہوگا۔ لوگ بڑی سرعت سے ادیب اور شاعر بن رہے تھے۔ جن حضرات کو میں سڑکوں پر سارا دن گھومتے یا کافی ہاؤس میں گپیں ہانکتے دیکھا کرتا اب اس نئی دنیائے ادب میں نام پیدا کر چکے تھے۔

یہ حقیر شاعری تو کر چکا تھا لہٰذا ادیب بننے کا شوق چرایا۔ چنانچہ اسی دُھن سے

ساز ملا کر اسی لَے میں الاپنا شروع کر دیا۔ میری چیزوں پہ ترقی پسند حلقوں میں تو واہ واہ ہوئی۔ لیکن کچھ لوگ خواہ مخواہ لٹھ لے کر پیچھے پڑ گئے۔ معلوم ہوا کہ ان دنوں دو مختلف کیمپ بن گئے ہیں جو ایک دوسرے کے سامنے مورچہ باندھے منتظر رہتے ہیں۔ میں کچھ حیران ہوا اور ایک بہت بڑے ترقی پسند سے ملا، پوچھا کہ کیا یہ ضروری ہے کہ لکھنے کے لئے کسی ایک کیمپ میں رہا جائے۔

اس نے بتایا کہ یہ بے حد ضروری ہے ۔

میں نے کہا۔ "لیکن ان دونوں کیمپوں میں ہر وقت تُو تُو میں میں ہوتی رہتی ہے یہ مجھے پسند نہیں، کیا کوئی غیر جانبدار رہ کر نہیں لکھ سکتا؟"

وہ بولا۔ "اگر آپ غیر جانبدار رہنا چاہتے ہیں تو لکھنا چھوڑ دیجئے۔"

چنانچہ یہ حقیر نقاد بن گیا۔ اس میں بھی ایک راز مضمر تھا جو ابھی بتاؤں گا۔ ترقی پسندی کا فلسفہ کچھ مشکل نہ تھا۔ اپنے جیسے لوگوں کی سدا تعریفیں کرنا، جو لوگ لکھنے لکھانے کے علاوہ روزی کمانے کے لئے محنت کرتے ہیں، انھیں ادب کا دشمن قرار دینا۔

افسانہ، مقالہ، غزل — سب کے لئے سانچے موجود تھے۔ چنانچہ ترقی پسندی کا لیبل لگانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ صرف اُن مسائل پر قلم اٹھایا جائے جن پر اس تحریک کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ تنقید کرتے وقت نہ میں پلاٹ کو جانچتا، نہ مصنف کے پیغام کو،

نہ پیغام کی افادیت کو، ہر چیز میں وہی جانے پہچانے موضوع، وہی مقررہ ترکیبیں اور الفاظ ڈھونڈتا، اگر یہ مل جاتے تو ترقی پسندی کا ٹھپہ لگا دیتا ورنہ مصنف کو گمراہ کرنے والا سرمایہ دار، تنزل پسند اور نہ جانے کیا کیا کہتا۔"

"آپ نے فرمایا تھا کہ نقاد بختے کی وجہ تسمیہ بیان کریں گے ۔۔" غورو نے بات کاٹی ۔۔

"ہاں، تو بات دراصل یہ تھی کہ اس عفی عنہ کو چند افسانہ نگار اور شاعر شہزادیاں پسند تھیں، ان میں سے دو ایک کو تو میں یونیورسٹی سے جانتا تھا اور کئی سال سے لگاتار ان پر فریفتہ تھا۔ لیکن انھوں نے میرا اتنا سا بھی نوٹس نہیں لیا۔ لکھتی وکھتی یہ ایسا ہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اگر ان کی تعریف کرنے لگوں تو شاید ملتفت ہو جائیں۔ موقعہ بھی تھا۔ چنانچہ میں نے ان کی تخلیقات کو سراہنا شروع کیا، ہر دوسرے تیسرے مہینے اپنے ٹھوس مضامین میں ان کی تعریفیں کرتا، لیکن تعجب ہوا کہ یہ مدح سرائی رائیگاں گئی۔ کسی سے پتہ کرایا تو معلوم ہوا کہ شہزادیوں نے ایک لفظ بھی نہیں پڑھا تھا۔ مجھے بحث یہ ہوا۔ ادھر ادھر پوچھنے پر انکشاف ہوا کہ انھوں نے کیا کسی نے بھی نہیں پڑھا۔ ایسے مضامین یہاں کوئی نہیں پڑھتا کیونکہ انھیں خشک اور ثقیل سمجھا جاتا ہے۔ ویسے بھی نقادوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے ۔۔"

"ان کیمپوں کا کیا بنا؟"

"بتاتا ہوں، سن ۔۔ یوں تو ہر تحریک کچھ عرصے کے لئے مقبول ہو جاتی ہے

لیکن اس نام سے خواہ مخواہ خوش فہمی ہوتی تھی کہ اب ہر چیز میں ترقی ہو گی، حالات سُدھر جائیں گے، انسان ترقی کرے گا، دُنیا بہتر بن جائے گی ـــ لیکن آہستہ آہستہ مایوسی چھانے لگی۔ ادب بالکل جرنلزم بن کر رہ گیا۔ آج کوئی بات ہوئی، اُسی ہفتے اُس پر نظم لکھ دی گئی یا افسانہ، اور اگلے مہینے کتاب۔ لوگوں کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اس تحریک کا پیرہن نرا کاغذی تھا۔ اس تحریک کا مقصد تخریب تھا۔ تعمیر مفقود تھی۔ یہ ہیرو نہیں تھے۔ پبلک اب تک غلط گھوڑوں پر Betting کرتی رہی تھی۔ ان کی زندگی عمل سے خالی تھی۔ ان کا نظریۂ حیات مریضانہ اور قنوطی تھا۔ یہ چاہتے تھے کہ ہر پڑھنے والے کو مالیخولیا ہو جائے۔ ادب کسی خاص طبقے کی میراث نہ ہُوا ہے نہ ہو گا۔ چنانچہ لوگ اس وقتی ہنگامے سے تنگ آ گئے اور ادب سے ایسے بدگمان ہوئے کہ انھوں نے فلمی رسالے پڑھنے شروع کر دیئے، فلمی رسالے تو فراری ادب میں بھی شامل نہیں ہیں ـــ ساتھ ہی ایک عجیب و غریب ادب نے جنم لیا ـــ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے متعدد حضرات نے تاریخی اور مذہبی ناول لکھنے شروع کر دیئے جو ہاتھوں ہاتھ بکے، معلوم ہوتا ہے کہ آپ بور ہو رہے ہیں ـــ"

"جی نہیں، بور تو نہیں ہو رہا ـــ" خورد جمائی لے کر بولا "فراری ادب پر مجھے ایک چشم دید واقعہ یاد آ گیا۔ طے ہُوا کہ ہمارے ضلعے کے جیل میں قیدیوں کو اخلاقی کتابیں پڑھائی جائیں۔ داروغۂ جیل اتفاق سے رجعت پسند تھا۔ سب کتابیں فراری ادب پر لے آیا، نتیجہ یہ نکلا کہ دو مہینوں کے اندر اندر سارے قیدی فرار ہو گئے۔"

"خیر، تو یہ کمترین بدستور ترقی پسند رہا، محض ایک ماہ پارہ کے عشق کی وجہ سے۔ اس بُت طناز کو میں نے مینا بازار میں دیکھا۔ میں اپنے دو سپینیل کتے لیے جا رہا تھا کہ خیال آیا کہ ذرا مینا بازار کا نظارہ کر لوں۔ ایک سٹال پر کچھ خریدنا چاہا لیکن دونوں ہاتھوں کو گھرا پایا۔ ایک حسینۂ پُر تمکین کو قریب پا کر کتوں کی زنجیریں اس کے ہاتھ میں تھما دیں۔ جب خرید سے فراغت ہوئی تو حسینۂ مذکور سے کتے طلب کئے، اس نے کمال بھولپن سے کہا ـــ "ایک کتا تو بلی کے پیچھے بھاگ گیا۔"

انگشت بدنداں سخت پریشان ہُوا اور سوال کیا کہ کیونکر بھاگ گیا۔

"یوں بھاگ گیا ـــ" اس نے دوسرا کتا بھگاتے ہوئے کہا۔

کتے تو دونوں مل گئے لیکن ادا یہ اس کی اس درجہ بھائی کہ بجز عاشق ہونے کے اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اختر شماری شروع کر دی۔ اس علاقے میں جتنے اختر حسن اختر حسین، حسن اختر، محمد اختر وغیرہ تھے سب گن ڈالے مگر افاقہ نہ ہُوا۔

آخر اپنی کزن کی مدد چاہی۔ وہ خالہ جانی بلائیں لے کر بولی ـــ "میں آج ہی اسے کلب میں بلاؤں گی۔" چنانچہ شام کو وہ ماہ جبین کلب میں آئی، اس ٹھسے سے کہ بھاری قرمزی غرارہ پہنے، عطر لگائے، زیور پہنے عجب بہار دکھاتا تھا۔ گلے میں ٹِکنی، چمپاکلی، مرتیوں کی مالا، دھگدھگی، کانوں میں پتے بالیاں، ہاتھوں میں حسین بند، الماس کے کڑے پاؤں میں سونے کے چھڑے، ناک میں ہیرے کی نتھ، انگلیوں میں جواہرات کی انگوٹھیاں، سر پہ چھپکا، اس فقیر نے دیکھتے ہی یہ شعر پڑھا ـــ

جان پڑ جاتی ہے زیوروں پہننے سے ترے
کہیں اُڑ جائے نہ جگنی تری جگنو ہو کر

لیکن میری کزن نے بڑے زور سے ہشت کر کے چُپ کرا دیا اور اس سے گویا ہوئی۔ کہ کلب میں بلانے کا تو فقط بہانہ تھا، اصل میں تمھیں ایک پیغام سُنانا تھا۔ میرا کزن جوانِ زیبا خرام خوبرو، گلگوں دیکھتے ہی آپ پر شیفتہ و دلدادہ ہوا، عشق کا بول بالا ہوا۔ وہ ہزار جان سے تمہارے گلِ رخسار کا عندلیبِ شیدا ہے، آہِ سرد اور دل میں درد سے عشق کا مرض پیدا ہے۔ ماشاء اللہ عجیب وغریب نوجوان ہے، عجب آن بان ہے، لاکھوں جوانوں میں انتخاب ہے، حُسن وخوبی میں اپنا آپ جواب ہے۔ تم دونوں کی خوب نبھے گی، گہری چھنے گی۔ وہ بھی کم سن، تم بھی جوان، وہ بھی نازک بدن، تم بھی دھان پان۔ وہ محوِ جادو آفرینی، تم سروِ چمن زارِ نازنینی —'

" اوہ! اتنی لمبی چوڑی تمہید کی کیا ضرورت تھی"— حسینہ نے بات کاٹی —
" والدین میری شادی کا تہیہ کر چکے ہیں تبھی مجھے پارٹیوں اور کلب وغیرہ میں جانے کی اجازت اتنی آسانی سے مل جاتی ہے۔ کئی اخباروں میں اشتہار بھی دئیے گئے ہیں۔ غالباً اگلے مہینے میرا سوئمبر رچایا جائے گا، اگر آپ کے کزن کو اتنا ہی ذوق وشوق ہے تو سوئمبر میں شرکت کرے —"

حسینہ کی یہ تقریر اس حقیر کو نہایت ترقی پسند معلوم ہوئی۔ اور اس نیاز مند نے اس کے ساتھ رُمبا ناچنا چاہا، زیوروں سے ایسی عجیب عجیب آوازیں آنے لگیں کہ اللہ

ترک کردیا۔ پھر سامبا ناچنے کی کوشش کی مگر ایک دوسرے کے ملبوسات آپس میں اُلجھ کر رہ گئے۔ چنانچہ رقص کی حسرت حسرت ہی رہی۔

سوئمبر قریب آیا تو میری کزن نے اخبار میں چھپا ہُوا اشتہار دکھایا جو ضرورتِ رشتہ، کے عام اشتہاروں سے ملتا جلتا تھا مگر ترقی پسندی کی عینک لگا کر پڑھا تو عبارت کا مفہوم کچھ یوں سمجھ میں آیا :-

## اِشتہار برائے پبلک

ہر خاص و عام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو صبح چھ بجے سے شہزادی دلیمہ جہاں کے سوئمبر کا ٹورنمنٹ شروع ہوگا اور مناسب اور معقول اُمیدواروں کو شہزادی پر عاشق ہونے کی اجازت ہوگی بشرطیکہ وہ مندرجہ ذیل شرائط پر پورے اُترتے ہوں :-

۱۔ کنوارپنے کا سرٹیفکیٹ جس پر صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر کے دستخط ہوں اور اُمیدوار کے والد کی سالانہ آمدنی اور جائداد کی تفصیل درج ہو۔

۲۔ تندرستی کا سرٹیفکیٹ جس پر سول سرجن صاحب بہادر کی تصدیق ہو۔

۳۔ دو معزز آدمیوں کے نام اور پتے، جو اُمیدوار کے چال چلن کی ضمانت دیں، اور اس کے رشتہ داروں میں سے نہ ہوں۔

۴۔ سرکاری خزانے میں پانچ روپیہ جمع کرانے کی رسید۔

۵۔ طلسماتی چیزیں مثلاً زمینداروں اور خان بہادروں کی سفارشیں ممنوع ہیں۔
۶۔ اُمیدوار ایک ہفتے کا راشن، بستر اور وفادار ملازم ہمراہ لائیں۔
۷۔ مہاجر کو ترجیح دی جائے گی۔
۸۔ کامیاب اُمیدوار کو شہزادی و لیمہ کے علاوہ جائداد کا تہائی حصہ بطورِ انعام ملے گا۔

نوٹ:۔ سب کو خبردار کیا جاتا ہے کہ خواہ مخواہ عاشق ہونے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ اس قسم کا اُمیدوار ایسی سزا کا مستحق ہوگا جو پچاس روپیہ جرمانہ اور تین ماہ کی قید تک ہو سکتی ہے۔

اس ناچیز نے اس شاندار ترقی پسند سپرٹ پر اظہارِ مسرت کیا اور دُعا مانگی کہ دُنیا کی ہر شہزادی کی شادی اسی طرح ہوا کرے۔ فوراً کاغذات مکمل کر کے گھوڑا منگایا، سیڑھی لگا کر سوار ہوا اور سوئے ٹورنمنٹ روانہ ہوا۔ مقابلہ نہایت شاندار رہا۔ طرح طرح کے امتحان لئے گئے۔ آئی کیو (I.Q.) بھی ٹسٹ کیا گیا۔ جو زیادہ ذہین تھے۔ انھیں نکال دیا گیا۔ اتفاق سے ایک حبشی بھی کہیں سے آن ٹپکا، اسے سزا دی گئی اور فہرست سے خارج کرتے وقت اس کے مُنہ پہ سفیدی مل کر شہر میں پھرایا گیا تاکہ سب کو عبرت ہو۔

چند رجعت پسند امیدواروں نے آتے ہی پہلا سوال یہ کیا کہ جائداد کا کون سا حصہ ملے گا، شمالی یا جنوبی۔ جواب ملنے پر وہ راتوں رات فرار ہو گئے کیونکہ وہ علاقہ نہری نہ تھا۔ وہاں ٹیوب ویل لگانے کی ضرورت تھی۔

خاکسار یہی فائینل جیت کر فائینل تک جا پہنچا۔ اتنے میں نہ جانے شہزادی کے ماموں کا لڑکا کہاں سے آمرا۔ یہ مردک کہ بیحد نحیف ونزار تھا ایک بہت بڑی جائداد کا تنہا وارث تھا (اور صحت اس کے باپ کی گرتی جا رہی تھی) — اس مردود کے مقابلے میں یہ ناچیز قدرے مُفلس تھا — مفلس عاشق کہلاتے و یسے بھی شرم محسوس ہوتی ہے مگر یہ سچ ہے کہ

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
آدمی کا وقار کھوتی ہے

اس کمبخت کے آجانے سے ٹورنمنٹ، کا رنگ ہی بدل گیا۔ نہایت سرمایہ دارانہ سوالات پوچھے جاتے۔ اُدھر شہزادی کی اماں نے برادرزادے کے لئے رو رو کر بُرا حال کرلیا۔ آخر وہ سب کے سب رجعت پسند ثابت ہوئے اور فیصلہ اس ملعون کے حق میں کیا گیا۔

ٹورنمنٹ کے نتیجے کی خبر وحشتناک سنتے ہی موم جامۂ صبر چاک ہُوا، ماتمی لباس پہنے اس حال میں تھا کہ نہ سر پہ جُوتا تھا نہ پاؤں میں پگڑی۔ لیکن شہزادی کے والد نے اس حقیر کو خلافِ توقع مبارکباد دی اور کہا کہ لڑکی کو اس کی والدہ نے بیحد بگاڑ رکھا ہے۔ شاید تُو نے بیگم کو نہیں دیکھا جو دراصل — بے غم — ہے۔ لڑکی بھی چند سال کے بعد ویسی ہی لحیم وشحیم بن جائے گی۔ اگرچہ مجھے مٹاپا مرغوب نہیں لیکن وائے نادانی کیا بتاؤں کہ — ع میں اسیرِ دامِ فریبی رہا ہوں، — اے نوجوان تُو گھاٹے میں نہیں رہا — (اس کے بعد ترنم سے بولے) ؎

تم بھی بیاہ کرو تو جانو
ہم دُکھیوں کی فریادوں کو

اس بیان سے اس نیاز مند کی تسلّی تو نہ ہوئی۔ لیکن یہ یقین ہو گیا کہ شہزادیاں اس ملک کی ہر گز ترقی پسند نہیں ہیں۔"

"یا پیر و مُرشد ایک بات پوچھوں؟" خورد نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"دو پوچھیے"

"اب دو ہی پوچھوں گا۔ یہ بتائیے کہ کبھی آپ کو کسی سے سچ مُچ محبت ہوئی؟"

"ہاں ہوئی تھی۔ یہ شہزادی فارغ التحصیل بلکہ فارغ الضلع ہو چکی تھی۔ ہم دونوں جرنلزم کی کلاس میں ملتے، ہائیکورٹ کے پاس جو باغیچہ ہے، وہاں اکثر جایا کرتے۔ وہاں میں نے اسے کورٹ کرنا شروع کیا۔ اس کے رخِ روشن پہ ایک خال ہوتا۔ یہ خال کبھی تو پیشانی پہ ہوتا، کبھی رخسار پہ، تو کبھی ٹھوڑی پر، اور کسی روز سرے سے غائب ہوتا۔ میں حیرت سے یہ شعر زبان پر لایا ؎

مصحفِ رُخ پہ ترے خال نگہبان ہوا
یہ غلامِ حبشی حافظِ قرآن ہوا

اس پہ اس نے فوراً مطلع کیا کہ خال وہ مصنوعی تھا اور سرے سے محض زیبائش کی خاطر بنایا جاتا۔ میں نے جھٹ سُرخ ہونٹوں کی تعریف کی ؎

لالی ہیں آپ ہی لب سُرخیٔ پان دور رہے
نازکی کہتی ہے یہ بارِ گراں دور رہے

اُس پہ شہزادی نے عجب تمسخر سے فرمایا کہ یہ پان وان کی سُرخی نہیں میکس فیکٹر کی بڑھیا لپ سٹک ہے۔ اگرچہ اِس فقیر کو علم تھا کہ لپ سٹک کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ سٹک نہیں کرتی تاہم موضوع بدلنا پڑا اور پامسٹری کا ذکر چھیڑا۔ وہ بولی۔ میں جانتی ہوں آپ اس حیلے سے میری خوشامد کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے چوڑیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیا میں انھیں چھو سکتا ہوں؟"

وہ بولی۔ "آپ اسی بہانے سے میرا ہاتھ تھامنا چاہتے ہیں"۔

اس صاف گوئی پر یہ درویش باغ باغ ہو گیا۔ ماشاء اللہ کیا ترقی پسند محبوبہ تھی ــــ بے حد مسرت کا سامنا ہوا۔ سوچا کہ جب انجام مقررہ ہے تو فرار بزدلی میں شامل ہے ـــ

نباہ کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

چنانچہ میں نے اُسے شادی کے لئے کہہ دیا۔

بولی "آپ خراٹے تو نہیں لیتے؟" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اس پر وہ بولی ـــ "تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ جایئے اور میرے والدین کو منا لیجئے"۔

یہ جواب بھی ترقی پسند تھا اور اس فدوی کو پسند آیا۔ میں سیدھا اس کے والدین کے پاس پہنچا اور سوال کیا۔ انھوں نے پہلے تو اس کمترین کا شجرۂ نسب حضرت آدم تک دریافت کیا، پھر جملہ متعلقین کے متعلق طرح طرح کے سوالات پوچھتے رہے معلوم ہوتا تھا گویا تہمت لگا رہے ہیں۔ پھر بولے۔ اگر تم دونوں میں سے خدانخواستہ کسی کا انتقال ہو گیا تو لڑکی کے لئے کیا انتظام ہو گا، کوئی ذاتی ملکیت یا بیمے کی پالیسی ہے؟ پھر مہر کا قضیہ شروع ہوا، جیسے نیلامی ہو رہی ہو۔ میں نے عرض کیا کہ میرا ارادہ نیک ہے اور انشاء اللہ مہر کی ادائیگی تک نوبت ہی نہ پہنچے گی۔ آخر آپ اتنے لمبے چوڑے مہر کے لئے کیوں مُصر ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یقین ہے کہ یہ شادی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ وہ بولے۔ اگر مہر تھوڑا لکھا گیا تو دُنیا کے سامنے ہماری ناک کٹ جائے گی۔ خیر یہ حقیر مان گیا۔

وہ چاہتے تھے کہ پُرانی رسومات ساری ادا کی جائیں۔ میں معروض ہوا کہ ہجوم اکٹھا کر کے غل مچانا ایامِ جہالت کی رسم ہے۔ جب پبلسٹی کا یہی ایک طریقہ تھا کہ لوگوں کو بُلا کر دکھا دیا جاتا تھا کہ واقعی شادی ہوئی ہے تا کہ وہ سب بعد میں گواہ رہیں۔ اب تو فوراً اخبار میں تصویر آجاتی ہے اور پھر شور و غل سے یہ احقر بہت گھبراتا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ آتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں سچ مچ کچھ کر بیٹھا ہوں۔ لیکن وہ بدستور مُصر رہے۔

آخر یہ تجویز پیش کی کہ شادی دو حصّوں میں ہو۔ پہلے آپ مجھے فارغ کر دیں پھر میں

بلکہ سال بھر تک روشنیاں جلا کر خوب ڈھول بجائیں اور دعوت پر سارے ایشیا کو (مع ایشیائے کوچک کے) مدعو کر لیں۔

وہ کمال درجہ رجعت پسند نکلے کہ نہ مانے۔

اسی طرح وقت گذرتا گیا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ شہزادی کو دوبارہ بغور تو دیکھیو۔ دیکھا تو حلیہ بدل چکا تھا۔ بھنویں اکھیڑنا، بال ترشوانا، ناخن پالنا ـــــ ان خوبیوں کا مجھے پہلے علم نہ تھا۔ جوتوں اور میک اپ سے کسی روز بیحد لمبی معلوم ہوتی۔ گھر میں سادہ کپڑوں میں دیکھتا تو چھوٹی اور موٹی دکھائی دیتی۔ رنگ و روغن کی وجہ سے اصلی شکل دیکھنا محال تھا چنانچہ عشق و عاشقی کو بالائے انگیٹھی رکھا اور ان رجعت پسندوں کو ان کے حال پر چھوڑا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ کچھ تنزل پسند ایک ترقی پسند کو سرِ بازار پھول مار رہے تھے اور وہ خاموش کھڑا برداشت کر رہا تھا۔ میں کچھ دیر تو کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر ایک اچھا سا پتھر اٹھا کر کھینچ مارا۔ وہ بلبلا اٹھا اور بولا ـــ اے مردِ سخن فہم۔ یہ سب تو بے سمجھ ہیں نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں۔ تُو تو ترقی پسند ہے تجھ سے ہرگز یہ امید نہ تھی۔

اس واقعے کے بعد اُلجھن سی پیدا ہوگئی۔ کیسے ترقی پسند اور کہاں کی ترقی پسندی۔ لوگ جہاں تھے وہیں کے وہیں ہیں۔ کوئی کسی رُخ بھی ترقی نہیں کر رہا۔ ویسے میرے اور ترقی پسندی کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ ہی رہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو زیادہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی، شاید مجھے شہزادیوں کی وجہ سے کچھ چڑ سی ہوگئی تھی ـــ"

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

"اس کے بعد یہ ہوا کہ تنقید نگاری کی بدولت مجھے پگڑیاں اچھالنے میں خاصی مہارت ہو گئی۔ اُدھر فلمی پرچوں کی مانگ بڑھتی جا رہی تھی، چنانچہ یہ فقیر فلمی نقاد بن گیا اور فلمی ستاروں کے متعلق تازہ ترین افواہیں بہم پہنچانے لگا۔ کروڑوں پڑھنے والے میری رنگین تحریروں کا بڑی بے صبری سے انتظار کیا کرتے۔ فلمساز اور اداکار مجھ سے ڈرنے لگے۔ کئی حسیناؤں سے اسی بہانے دوستی ہو گئی، ترقی پسند اور رجعت پسند، دونوں مجھ پر رشک کرنے لگے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر خاک ہوا، ڈھول ہوا" جہازِ بادِ کلاں نے جھلا کر کہا۔

"ابھی کتنا سفر باقی ہے؟"

"تو بڑا بے صبر ہے، اچھا لے، سفر یہیں ختم ہوا۔ یونہی طبیعت بدمزہ کر دی اگلی مرتبہ جب فرصت ہو تب آئیو۔"

سرِ شام جہاز باد خورد آن دھمکا اور بولا۔

"صبح جو کچھ ہوا۔ اس کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔ سزا کے طور پر تیسرا سفر دوبارہ سننے کو تیار ہوں۔"

جہاز بادِ کلاں مسکرا کر بولا۔ "ہم معاف کرتے ہیں اور چوتھا سفر پہلی مرتبہ سناتے ہیں۔"

# جہاز باد سندھی کا چوتھا سفر

" فصلِ بہار آئی پیو صوفیو شراب
بس ہو چکی نماز مصلا اٹھائیے

اے رفیقِ دیرینہ! ایک رات کا ذکر ہے کہ میں نے کُتّے کو مارنے کے لئے ایک وزنی سی کتاب اُٹھائی، کتّا دور جا چکا تھا لہٰذا ورق گردانی کرنے لگا اور پڑھتے پڑھتے سوگیا۔ علی الصبح جو اٹھا تو اپنے آپ کو پرولتاری پایا، سوچا کہ شاید مشیتِ ایزدی اسی میں ہے کہ پرولتاری بنوں اور نام پاؤں —"

" اے ہمدمِ طوطی گفتار، لفظ پرولتاری سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

" یہ ایک انگریزی لفظ کا نعم البدل ہے اردو میں۔ ڈکشنری دیکھو، بہت کچھ معلوم ہوگا۔ پرولتاری بننا آسان کام نہیں، بڑی ہمت چاہیئے۔ دن رات بھاری بھاری کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے، لیکچروں میں جانا پڑتا ہے، پریکٹیکل الگ ہوتے ہیں۔ بہت جلد زندگی نے یہ کورس مکمل کر لیا۔ زندگی میں کئی تبدیلیاں آگئیں۔ اٹھنا بیٹھنا صرف پرولتاریوں ہی ہوتا۔ بڑی طویل بحثیں ہوا کرتیں۔ پرولتاری ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ہمیں مذہب، جنس اور دیگر اہم مسائل پر جدید ترین نظریوں کا اظہار کرنے کی پوری آزادی تھی۔ ہماری انوکھی اور بصیرت افروز باتیں سُن کر عوام چونک پڑتے۔ ہر مذہب کو ہم تضیعِ اوقات سمجھتے، انسانی رویے کے عالمگیر قوانین ہمارے لیے مہمل اور لغو تھے۔ ہر انسان، ہر اصول

ہر بیان کو ہم نہ صرف شبہ کی نظر سے دیکھتے بلکہ منٹوں میں دھجیاں اڑا دیتے۔ عجب دن تھے وہ بھی ۔۔۔ ! کیا رُعب تھا، کیا دبدبہ تھا۔۔۔ سڑک پر پرولتاری چلتا تو لوگ ادھر اُدھر ہٹ کر راستہ دیتے، جھک جھک کر سلام کرتے۔ کیا مجال جو کوئی ہم سے بحث کر سکے، چند ہی فقروں کے بعد وہ یوں خاموش ہو جاتا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ بڑے سے بڑے ہجوم میں محض چند پرولتاریوں کی آمد قیامت برپا کر سکتی تھی۔۔۔

"بھاگ چلو یارو، پرولتاری آ گئے"۔۔۔ کا نعرہ لگا کر وہ ایسے بھاگتے کہ ٹوپیاں اور چھاتے چھوڑ جاتے۔

جہاں ہم نے مقامی بیابان کو آگے لگا رکھا تھا۔ وہاں مقامی لڑکیاں تھیں کہ سیدھے مُنہ بات نہ کرتی تھیں۔ وہ ہم سے بدگمان تھیں۔ ہم مذہب، دوستی، ایمان، فلسفۂ عشق ۔۔۔ کے پرخچے ضرور اڑاتے تھے لیکن یہ سب دکھاوے کے لیے تھا۔ کبھی کبھی ہمارے دل بھی محبت کی آگ سے سُلگنے لگتے۔ ضرورت پڑنے پر ہم خدا کا واسطہ دیا کرتے، مصیبت پڑتی تو دعائیں مانگتے، رہ گئی جنس، سو اس کے متعلق ہمارا تجربہ اتنا ہی تھا جتنا غیر پرولتاریوں کا، لیکن ہماری معلومات کا ماخذ فرائڈ، ڈی ایچ لارنس اور دیگر حضرات کی کتابیں تھیں۔ خیالات ان کے تھے بیان ہمارا تھا۔ اگرچہ ہم نے ان مصنفین کا حوالہ کبھی نہیں دیا اور ہاں ہمیں بتانا بھول گیا کہ پرولتاری ایک انقلاب بھی چاہتے تھے ۔۔۔"

"کیسا انقلاب؟"

"وکبھی ایک عالمگیر انقلاب تو کبھی ملکی یا غیر ملکی انقلاب — بعض اوقات ہم مقامی انقلاب پر ہی قناعت کر جاتے۔ بس انقلاب ہو، کہیں، کسی قسم کا، کسی سائز کا — چنانچہ ہم بار بار پبلک کو انقلاب کے لئے اُکساتے، ہم چاہتے تھے کہ ہنگامے بپا ہوں اور افراتفری مچے، دنگے فساد ہوں، تاکہ لوگوں پر ہماری اہمیت واضح ہو جائے۔ لیکن مجھے غصہ تھا تو اس پر کہ یہی لڑکیاں جو ہم سے ملنا اپنی ہتک سمجھتیں کلب میں وہ دھما چوکڑی مچاتیں کہ خدا کی پناہ۔ ایک خاص طبقے سے خوب چہلیں کرتیں — یہ حضرات بھی عجیب تھے، ویسے اچھے بھلے تھے لیکن اپنے آپ کو بیحد غمزدہ اور بدنصیب سمجھتے۔ اس کی وجہ اپنی بے جوڑ شادی بتاتے۔ حالانکہ ہر ایک ماشاءاللہ چھ چھ بچوں کا باپ تھا۔ ان کی ایک ہی رٹ تھی کہ ان کی ازدواجی زندگی نہایت غمناک ہے اور وہ بیوی سے تقریباً تقریباً علیحدہ ہو چکے ہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں کسی نے انہیں سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس بہانے وہ ہر لڑکی سے فلرٹ کرتے۔ چونکہ ان کے پاس کاریں تھیں اس لئے یہ بورژوا تھے۔"

"اس ناچیز کے چچا جان جو تعلقہ دار ہیں۔ کار رکھتے ہیں، کیا وہ بھی بورژوا ہیں؟" خورد نے پوچھا۔

"ضرور ہوں گے — تو یہ شادی شدہ بورژوا حضرات دن بھر کاروں میں لڑکیوں کو لئے لئے پھرتے، لطف یہ ہے کہ ان میں سے کوئی پینتالیس برس سے کم نہ تھا۔ پتہ نہیں انھیں اس میں کیا ملتا تھا؟"

"غالباً انھیں سنہ نیس انیس کے پرانے ماڈل پسند نہیں تھے،" اور سنئے

مسٹر یم لائینڈ ماڈل درحقیقت دیدہ زیب ہوتے ہیں۔" خود دسنے مؤدبانہ عرض کیا۔

مگر یہ نئے ماڈل ان کا خوب مذاق اڑاتے، ملتے ہی سوال ہوتا کہ آپ کی ننھی بچی کا اب کیا حال ہے؟ آپ کے لڑکے کا بخار اترا؟ بیوی کا کوئی خط آیا؟ بڑی لڑکی کی کب شادی ہو رہی ہے؟ دیکھئے ہمیں ضرور بلائیے، مگر یہ بورژوا تھے کہ۔"

"ویسے بورژوا ہوتا کیا ہے؟"

"بورژوا وہ ہے۔۔ (کلاں نے چہرے کے اظہار اور ہاتھوں کی جنبش سے بتانے کی کوشش کی) جو۔۔ جو۔۔ بالکل بورژوا ہو۔۔ سنا ہے کہ فرانس میں سوداگروں کا ایک طبقہ رہتا تھا اُسے بورژوا کے نام سے پکارتے تھے لیکن یہ کافی عرصے کا ذکر ہے۔۔"

"یا پیر و مرشد، ایوننگ اِن پیرس کی نیلی شیشی پر ایک لفظ بورژوا لکھا ہوتا ہے۔۔"

"اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس کے کئے میں دخل دینا سخت نادانی ہے۔ تو میں نے لڑکیوں سے ان بورژوا حضرات کی خوب برائیاں کیں اور انھیں بہت سمجھایا۔ یہ بھی کہا کہ یہ سب سرمایہ دار ہیں اور سماج کے دشمن ہیں۔ وہ ہنسنے لگیں کہ کار کو چھوڑ کر ان کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے بینک میں ان کا حساب صفر ہے بلکہ مقروض رہتے ہیں۔ میں نے بتایا کہ سرمایہ دار ہونے کے لئے سرمائے کی ضرورت نہیں۔ یہ سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے

جس پر غصّہ آتا ہے۔ وہ بولیں۔جب سرمایہ نہیں تو ذہنیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگرچہ میں خود پرولتاریت سے اکتا چکا تھا لیکن یہ گلے کا ڈھول تھا کچھ عرصہ بجانا پڑا۔ آخر ایک دن میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک ذلیل سی پرانی موٹر کہیں سے خریدی اور بورژوا بن گیا — دہنے بائیں ہر لڑکی سے فلرٹ کرنا شروع کیا اور ہرجائی کے نام سے شہرت پائی —"

"آہا تو آپ ہرجائی بھی رہ چکے ہیں — ملائیے ہاتھ، یہ ناچیز بھی ہرجائی رہ چکا ہے۔ آہ! سب سے بڑی ٹریجیڈی یہ ہے کہ زندگی بے حد مختصر ہے اور حسین چہرے تعداد میں اتنے زیادہ ہیں —"

"لیکن دو تین لڑکیاں تو سچ مچ پسند آگئیں اور ارادہ اس خاکسار کا شادی کرنے کا تھا۔"

"اُن سب سے؟" خورد چونک پڑا۔

"نہیں، ایک سے۔ لیکن معلوم ہوا کہ لڑکیوں کی توقعات بہت زیادہ ہیں۔ کورٹ شپ میں وہ صرف لڑکے کے نقائص معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ انھیں فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ ہونے والی ساس کس مزاج کی ہے۔ کنبے میں بہت زیادہ لوگ تو نہیں۔ لڑکے کی تنخواہ کا گریڈ کیا ہے اور یہ گریڈ اسے ملے گا بھی یا نہیں۔ مُربہ بننے کے کیا امکانات ہیں۔ شکی مزاج تو نہیں کہ ذرا دوسرے مرد سے بات کی اور خفا ہو گیا۔"

"پتہ نہیں — البتہ شادی کے متعلق سنجیدگی سے صرف ایک طبقہ سوچتا ہے۔

خاوندوں کا طبقہ۔ یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ حقیقی مسرت سے انسان تب تک آشنا نہیں ہوتا۔ جب تک اس کی شادی نہیں ہوتی۔ لیکن تب بہت دیر ہو چکتی ہے۔"

"یار تو بات مت کاٹ، چپ چاپ سنتا رہ۔ یہ لڑکیاں بیحد Material-istic تھیں، جوں جوں وقت گذرتا گیا۔ میں ہر چیز سے بیزار ہوتا گیا یہاں تک کہ شادی سے ڈرنے لگا۔ ان لوگوں سے بھی خوف کھاتا جو خسر بنتے بنتے بال بال بچ گئے۔ ہر رات سونے سے پہلے اس قسم کی دعا مانگتا کہ ... اے پروردگار میرے حال پر رحم فرما، رشیدہ کی کہیں شادی کر دے۔ نرگس بن غفور کی کہیں منگنی ہی ہو جائے، مس ریٹا معراج دین اور ڈوروتھی فتوحل کا بھی کہیں انتظام کرا دے۔"

"لیکن اس کا بور ہونے سے کیا تعلق ہے؟ کاش کہ موضوع بدل جائے" خورو جو اتنی دیر میں ڈکشنری دیکھ چکا تھا بولا۔

"بہت اچھا۔ اب اس سفر میں ایک چیز باقی رہ گئی ہے۔ تجھے یاد ہوگا کہ الف لیلہ کے سند باد کی ملاقات تسمہ پیر سے ہوئی تھی۔ جس کے چنگل سے بڑی مصیبتوں کے بعد نکلا تھا۔ میرا بھی ایک ایسے ہی مسخرے سے واسطہ پڑا۔ سفر سے لوٹتے وقت میں ایک بندرگاہ پر اترا۔ جہاں بندر ہی بندر رہتے۔ وہاں ایک انشورنس ایجنٹ میرے پیچھے لگ گیا۔ ایسا تعاقب کسی نے کسی کا نہ کیا ہوگا۔ چوبیس گھنٹوں میں وہ فقط تین چار گھنٹے مجھے چھوڑتا ورنہ ساتھ رہتا۔ اس سے دور رہنے

کے لئے میں نے کیا کیا جتن نہ کئے ، منت سماجت کی، ڈرایا دھمکایا، آخر تنگ آکر خودکشی کی دھمکی دی۔ تس پہ وہ بولا کہ میں بھی ساتھ خودکشی کروں گا اور پالیسی دینے کے لئے اگلے جہاں تک پیچھا نہ چھوڑوں گا۔ جب میں نے سچ مچ پستول دکھایا تو بولا۔ اے مردِ نیک خصلت اگر تو واقعی خودکشی کر رہا ہے تو پالیسی مفت لے لے لیکن وارث مجھے بنا جا۔ مجھے اتنا غصہ آیا کہ خودکشی کا ارادہ ترک کر دیا اور سیدھا کباڑی بازار میں الف لیلہ کا قدیم نسخہ مطالعہ کرنے گیا تا کہ کوئی ترکیب نکالوں۔ سندباد نے اُس مردِ نابکار کو انگوروں کی شراب پلا کر مدہوش کیا تھا۔ لہٰذا میں نے اسے بادۂ افرنگی پلایا۔ لیکن اثر اُلٹا ہُوا ، پی کر وہ اپنے تئیں ہوش میں نہ رہا ، کچھ دیر واہی تباہی بکتا رہا پھر اس حقیر کو خوب زد وکوب کیا بے حد حیران ہُوا کہ خود اپنے ہاتھوں اسیرِ دامِ بلا ہُوا ، خود گرفتارِ بحرِ ستم ہُوا۔

جب اگلے روز وہ مجھے سڑک پہ ملا تو شرما کر اس نے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا اس کے بعد جب کہیں ملتا خجل ہو کر رہ جاتا ۔ خیر اس طرح میری نجات ہوئی۔ لیکن الف لیلہ سے عقیدہ اُٹھ گیا ۔"

"گستاخی معاف"۔ خورد بولا "شروع سے اب تک جو واقعات آپ نے اب تک سُنائے ہیں بالکل الل ٹپ ہیں ، غالباً آپ کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ پتہ نہیں آپ ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کا یہ سفر بھی نہایت بے تکا رہا ۔"

"مگر تو نے مجھے بار بار ٹوکا بھی تو ہے۔ شاید ایک دن میں دو سفر سُن کر تو اکتا گیا

ہے۔ اب آئندہ مجھے ایک لفظ نہ سناؤں گا جب تک تُو ہونٹ سی لینے کا وعدہ نہ کرے۔"

"کس کے ہونٹ؟ آپ کے؟"

"نہیں اپنے۔"

اور وہ دونوں خنداں ہوئے، فرحاں ہو کر شک و شبہات دُور ہوئے دل صاف ہوئے اور جہاز باد کلاں کا چوتھا سفر تمام ہُوا۔

اگلے روز جب شاہبازِ نجوم نے آفتاب پہ جال پھینک کر شکار کیا، سپاہِ انوار کو شکست ہوئی، ظلمت کی حکمرانی ہوئی۔ تب جہاز بادِ خورد حاضر ہو کر بولا۔ "یا استادِ کلاں اپنا پانچواں سفر بیان کر کہ میں دو روز تک تیرے ہاں قیام کروں گا۔ اپنی گھڑی بھی کسی کو دے آیا ہوں اور دو بوتلیں ساتھ لایا ہوں۔ اب مجھے سماعت کے لیے تیار سمجھ۔"

جہاز بادِ کلاں نے یوں کلام کیا ـــ

## جہاز باد سندھی کا پانچواں سفر

ع "دل دُکھایا کسی گلچیں نے کوئی گُل توڑا
باغ سے نالۂ بُلبل کی صدا آتی ہے"

اس پر خورد پھر بول اُٹھا "بھائی ایک صلاح ہم دیں گے، وہ یہ کہ آئندہ آپ

ایسے اوٹ پٹانگ اور بے محل شعر کم از کم اپنے محل میں نہ پڑھا کریں۔ اب تک جو اشعار حضور نے پڑھے، ان کا قصے سے کوئی سروکار نہ تھا۔"

"اے نوجوانِ بلند بخت! اعتراض کرنا تیری سرشت میں ہے۔ یہ اشعار میں نے روایاتِ قدیم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پڑھے، پرانے زمانے میں دستور تھا کہ داستان گوئی اشعار کے بغیر نامکمل تھی۔ اسے محض رواداری سمجھ ـــ رواداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے ـــ"

"رواداری نہیں ـــ وفاداری بشرطِ استواری" خورد نے لقمہ دیا۔

"اچھا بابا وفاداری سہی۔ لیکن واسطہ ہے تجھے اپنے پیر کا ـــ اگر تیرا پیر ہے تو ـــ تو خاموش رہ ـــ آج کا سفر بالکل مختصر ہے اور غالباً آخری سفر ہوگا۔ لہٰذا آج کی رات سازِ ورد نہ چھیڑ۔

سن میں زیادہ دیر بورژوا نہ رہ سکا۔ لوگ اس لفظ کے نہ ہجے کر سکتے، نہ صحیح تلفظ کسی کو آتا تھا، بار بار معنے پوچھتے۔ ادھر میری کار بھی بک چکی تھی۔ سوچا کہ ذہنی ارتقاء کی منزلیں طے کرنے کی غرض سے یہ سفر شروع کئے تھے ورنہ کافی ہاؤس برا نہ تھا چنانچہ پھر باہر نکلنے کی ٹھانی۔ موسم گرما گذارنے کے لئے سانگلہ ہل کا رخ کیا۔ کہ اسی بہانے بڑے بڑے آدمیوں سے ملاقات ہو جائے گی۔ وہاں نہ جانے کیا ہوا کہ خیالات اس ناچیز کے دفعتہً بدل گئے۔ غالباً یہ اونچے طبقے کی صحبت کا اثر تھا کہ خاکسار منزلیں مارتا کہیں کا کہیں جا نکلا۔ آخر کار اس جگہ پہنچ گیا جہاں تو مجھے آج دیکھ رہا ہے۔ اب میں بالکل

بے نیاز ہوں، کسی کی پرواہ نہیں کرتا، مطلب ہو تو خیر ورنہ کسی کی مدد نہیں کرتا۔ کسی کو خط نہیں لکھتا۔ لوگوں سے تب ہی ملتا ہوں اگر کوئی کام ہو۔ بلا غرض کسی کو مدعو نہیں کرتا۔ نہ زیادہ سوچتا ہوں نہ محنت کرتا ہوں ـــ بھلا دنیا کے جھمیلے آج تک کسی سے ختم ہوئے ہیں جو میں اور تُو انہیں ختم کر سکیں گے۔ ہر قسم کی تقریر و تحریر سے اعتبار اُٹھ چکا ہے۔ پڑھنا، لکھنا، ملنا، جُلنا، یہ سب بیکار باتیں ہیں۔ شہزادیوں کی متواتر بے وفائی سے شادی میں بھی دلچسپی نہیں رہی۔ بچّوں کی سماجی حیثیت پالتو جانوروں پرندوں کی سی ہے، دو تین سال کھیلو پھر بڑے ہو جاتے ہیں اور ماں باپ کو بے وقوف سمجھنے لگتے ہیں۔ میرے پڑوسیوں نے میرے نظریوں کی استقامت میں بڑی مدد دی ہے۔ آ تجھے بھی قدرت کا تماشہ دکھاؤں ـــ"

یہ کہہ کر وہ خورد کو دریچے تک لے گیا۔ کواڑ کھولنے کی دیر تھی کہ دوسرے گھر سے چیخم دھاڑ سُنائی دی۔ کئی بچّے بڑی بھیانک آواز میں چلّا چلّا کر رو رہے تھے۔ خورد نے کانوں میں اُنگلیاں ڈالیں تو کلاں نے دریچہ بند کیا۔

"اے میرے دوست! جب کبھی مجھے گھر بسانے یا آئندہ نسل کے متعلق خیال آتا ہے تو فوراً یہ دریچہ کھول کر بیٹھ جاتا ہوں اور عبرت حاصل کرتا ہوں اور پھر اگلی نسل کی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ جس روز میں اس جہان سے رخصت ہوا، وعدہ کرتا ہوں کہ بچوں کو خاندان کا نام روشن کرتے دیکھنے دوبارہ ہرگز نہیں آؤں گا ـــ"

"اوہ! ـــ پچ ـــ پچ ـــ یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا" خورد نے اظہارِ

افسوس کیا۔

"اب میں Nihinalist ہوں، نی ہلسٹ!" کلاں نے اپنے سینے پر مکّوں کی بارش کرتے ہوئے کہا "خبردار جو اس لفظ کے معنی پوچھے ہیں تو — اور اے مرد جلد باز میرے پانچوں سفر تمام ہوئے۔ آئیڈیلی مجھے سات سفر کرنے چاہئیں تھے لیکن دنیا کے حالات کو مدّنظر رکھتے ہوئے پانچ کافی ہیں۔ ویسے بھی محسوس ہو رہا ہے کہ ذہنی تنگ و دو میں اپنی منزل میں نے پالی ہے، میرا مقام مجھے ہاتھ آگیا ہے اور تُو جو یُوں بیوقوفوں کی طرح دیکھ رہا ہے اگر چاہے تو بقیہ دو سفر تُو کر آ۔ میری طرف سے اجازت ہے —"

"جی نہیں — ایسے ماحول اور ایسا محل چھوڑنے کو کس کا جی چاہتا ہے"۔

"یہ محل میرا کہاں ہے الاٹ شدہ ہے۔ شروع شروع میں خاکسار نے اخباروں رسالوں میں بڑے دردناک بیانات چھپوائے کہ میں ایک ادبی اکادمی کھولنا چاہتا ہوں پبلک نے زبانی حوصلہ افزائی تو بہت کی لیکن چندہ کسی نے نہ بھیجا، دراصل پبلک بڑی ہوشیار ہو گئی ہے، فوراً سمجھ جاتی ہے — (سرگوشیوں میں) اے رفیق تنہائی یہ اکادمی کا ریکٹ چل جاتا تو دولت کا ڈھیر لگ جاتا! دربرخوردار تیری پوسٹ وار پلین کیا ہے، نوکری کے لئے اپنا نام رجسٹر کروایا؟"

"نام رجسٹر تو نہیں کرایا لیکن جس محلّے میں رہتا ہوں وہاں چوہے بلّیاں اور کتّے بہت زیادہ ہیں، سوچ رہا ہوں کہ وہاں ایک چینی ریستوران کھول لوں —"

"اس سے تو یہ بہتر ہے کہ میرے ساتھ شرکت کر۔ تُو کافی فرمانبردار نوجوان نظر آتا ہے کہ کام تجھے کوئی خاص نہیں ہے۔ تیری بلند پیشانی کو دیکھ کر میرا موڈ یکلخت ادبی و علمی ہوگیا ہے ۔"

"یہ بلند پیشانی نہیں گنجے پن کی پہلی نشانی ہے۔"

"یہ گنجِ بے بہا تُو نے کیونکر پایا؟"

"ایک دو مرتبہ سول سروس کے مقابلے میں شرکت کی تھی۔"

"اخاہ! پھر تو تُو بُوہڑے نیم میں تولنے کے لائق ہے۔ پہلے اپنی ہیئتِ کذائی ٹھیک کر، حجامت کرا، عینک بدل، ہر ہفتے غسل کیا کر اور ہر روز شیو، کپڑوں کو دھلوا کر استری کرایا کر ۔"

"کہیں مجھے انٹلکچوئل اپنی برادری سے نہ نکال دیں ۔"

"تو کیا ہوا؟ خیال ہے کہ چند شرفاءِ ذی مرتبہ کو خوش کرنے کے لئے ایک بلند پائے کا معیاری رسالہ جاری کروں۔ ویسے کام دوسرے لوگ کریں گے لیکن نام ہمارا ہوگا۔ کیا ارادہ ہے ۔؟"

"خاکسار آمادہ ہے۔"

"اب جبکہ تُو نے سب کچھ سن لیا ہے بتا کہ تُو بھی کبھی ایسی کٹھن منزلوں سے گذرا، کبھی ایسی مصیبتیں تجھ پر بھی پڑیں ۔؟"

خورزو نے کلاں کا ہاتھ چوما اور آنکھوں میں آنسو لاکر بولا ۔ "آپ واقعی بڑے

بڑے مصائب سے دوچار ہوئے، صیدِ انتشار ہوئے۔ اب آپ حظ اُٹھائیں دل کھول کر کھائیں اور کھلائیں۔ خُدا کرے تمام عمر شاد رہو، فائزِ بمرام و بامراد رہو۔"

اس پر جہاز بادِ سندھی کلاں نے خورد کے سر پر دستِ شفقت پھیرا، اس کا رتبہ اور بھی بڑھایا۔ جب تک زندہ رہے دو جان اور دو قالب ہو کر رہے۔

خالقِ زمین و زمان، آفرینندۂ ہر دو جہان، کارسازِ مطلق، قادرِ برحق کا ہر حال میں شُکر ادا کرنا چاہیئے کہ بندوں کو کیسی کیسی مصیبتوں سے بچاتا ہے۔ گاڑھے وقت میں اُسی کا فضل آڑے آتا ہے۔

**نتیجہ** — پس اے پیارے بچو! نتیجہ اس کہانی سے یہ نکلا کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر کہانی سے نتیجہ نکلے۔

# دو نظمیں

## ۱۔ کون

کون ہے میری جواں سال امنگوں کا سہارا مرے ہمدم مرے دوست!
تجھ کو معلوم اگر ہے تو بتا
کس کے شب رنگ و معطّر گیسو
میرے بازو پہ بکھر جاتے ہیں؟
کس کے خوابیدہ شبستانوں میں
کیف آمیز اندھیرے لے کر
نیند کی دیوی، تکلّف کے بغیر
میری پلکوں، میری آنکھوں میں دبے پاؤں چلی آتی ہے

موزے جب گردشِ رفتار سے گھس جاتے ہیں
سوزنِ سادہ سے کون اُن کو رفو کرتا ہے ؟
میری بکھری ہوئی بوسیدہ کتابیں آخر
کون چُن دیتا ہے ترتیب سے الماری میں
سلوٹیں دیکھ کے ملبوس پہ خم کھائی ہوئی
استری کون کیا کرتا ہے ؟
آنکھ کس کی مرے بٹوے پہ جمی رہتی ہے
کون ہر ماہ چکا دیتا ہے دھوبی کا حساب ؟

جب کبھی زندگی درماندہ و واماندہ نظر آتی ہے
اور بن جاتی ہے اک خُوں بھرا جام
تلخیاں رُوح میں رچ جاتی ہیں
تہ بہ تہ ظلمتیں جم جاتی ہیں
زیست اور موت میں رہتا نہیں ننھا سا تفاوت باقی
ایسے لمحوں میں سدا
کون دیرینہ رفیق آ کے پکڑتا ہے مجھے بازو سے ؟
اور لاتا ہے سوئے بزم ، جہاں میرا لہو کھول کے نپ جاتا ہے

تُو بتا سکتا ہے کیا؟
ہاں ذرا میں بھی تو سُنوں
کیا کہا — ؟
تیرے گستاخ تبسّم پہ ہنسی آتی ہے
تیرا وجدان ابھی تک ہے بہت خام اے دوست!
کیا بتاؤں میں تجھے
وہ کوئی اور نہیں —
وہ تو میں خود ہوں — مری جاں، مرے ہمدم، میرے دوست!

## ۲۔ خرّاٹے

اُس نے خرّاٹے سُنے —
دفعتاً چونک پڑا، جاگ اُٹھا،
لبِ نازک پہ مچلتے تھے "رسیلے نغمے"
اور بیوی تھی کہ خوابیدہ تھی
فربہی تھی کہ جوانی کا سہارا لے کر
تہہ بہ تہہ جسم پہ اس طرح جمی جاتی تھی

جس طرح کیک کہ سمس کا ہو ـــ

اس نے خرّاٹے سُنے ـــ
مٹھیاں بھینچ کے یوں کہنے لگا
آج نیند آئی تھی دو روز کے بعد
کہ حسیں ہونٹوں کے "نغموں" نے سکوں چھین لیا
اور اب زندگی بھر دل کو نہ آئے گا قرار
کہ یہ "نغمے" کسی اندوہِ مسلسل کا پتہ دیتے ہیں،
ایسے جینے پہ خدا کی پھٹکار!

اس نے خرّاٹے سُنے
(اپنی بیوی کی لگاتار علالت کا خیال
یہ عیادت کا مسلسل بُحران
کہ کسی پل بھی سکوں مل نہ سکا
اور پھر اس پہ ستم وید وں طبیبوں کا نزول
حُسنِ بیمار ـــ مگر ویسا ہی بیمار رہا
جیسے صدیوں کا سماج )

اُس نے خراٹے سُنے ۔
اُٹھا آئینے میں صورت دیکھی
آنکھ کے گرد سیاہ حلقوں کو رقصاں پایا
سبزۂ خط تھا ہم آغوشِ ذقن
اپنی صورت سے ڈرا ۔
اور کیا جانیئے کیا سر میں سمائی وحشت
دل میں اک عزمِ جواں جاگ اُٹھا

اس نے خراٹے سُنے ۔
اور کچھ سوچ کے الماری کی جانب لپکا
اُسترا کانپتے ہاتھوں میں لیا ۔ کھولا ۔ پرکھ کر دیکھا
دھار تھی تیز کسی تیغِ مجاہد کی طرح
دیکھ کر بیوی کے مرمر سے گلو کی جانب
اس نے آئینے میں خود پر بھی نظر دوڑائی
اور سوچا کہ یہی موقعہ ہے ۔

اُس نے خراٹے سُنے ۔

کمرے سے جھانک کے باہر دیکھا
اک ہمہ گیر خموشی تھی فضا پر طاری
دُور اک کتا پڑا سوتا تھا
اس نے سوچا کہ یہی موقعہ ہے
اُسترا زور سے پکڑا، کانپا —
اور پھر شیو بنانے لگا جلدی جلدی۔

# ٹیکسلا سے پہلے اور ٹیکسلا کے بعد

خالد نے ولائت سے آ کر مقصود گھوڑے کو ہوم سِک کر دیا۔

خالد کے آنے پر کرکٹ کا ایک میچ ہوا۔ جس میں ایک طرف خواتین تھیں اور دوسری طرف حضرات۔ حضرات کو برقعے پہننے پڑے۔ ماڈرن قسم کے مصری ترکی یا اصلی بغدادی برقعے نہیں بلکہ پرانی وضع کے شٹل کاک نما برقعے جنھیں پہن کر باہر والوں کو اندرونِ برقعہ کی خبر نہ ہو اور اندر سے مقامی حالات کا کچھ پتہ نہ چلے۔ بولنگ کرتے وقت بھی برقعوں کے دھڑ بند رہتے اور گیند کے پیچھے بھاگتے وقت بھی۔ لوگوں کو شاید پہلی مرتبہ احساس ہوا، کہ برقعے پہننا کیا معنی رکھتا ہے۔ حضرات نے الجھ کر خوب نٹوں کے تماشے دکھائے۔ میں سکور گن رہا تھا اور شیطان بیٹھے ٹڈنگ کر رہے تھے۔ وہ اس قسم کی تقریبوں

پر ہمیشہ نثنگ کیا کرتے ہیں، اپنی محبوبہ کے لئے۔ کبھی سویٹر بُن رہے ہیں کبھی جرابیں۔
آشوب چشمی صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ وہ جنرل گارڈن پر تنقید کر رہے تھے
حبشیوں پر بحث ہو رہی تھی۔ میں حبشیوں کا طرفدار تھا کیونکہ وہ افریقہ میں رہتے ہیں۔
اس روز بالکل معمولی سی صبح طلوع ہوئی۔ روزمرہ کی طرح جمائیاں لیتا سورج نکلا۔ پرندے
بھی اُنہی پُرانے سُروں میں چہچہاتے ریڈیو پر حسبِ معمول سارنگی پر بھیرویں سُنائی گئی
— کسے پتہ تھا کہ یہ معمولی صبح ایک اہم دن میں تبدیل ہوا چاہتی ہے۔
خالد دو سال کے بعد لوٹے تھے۔ اب وہ پرانے خالد نہیں تھے جو ہر وقت
لائف کا رونا رویا کرتے "فلاں کی لائف بن گئی، فلاں نے فلاں کی لائف تباہ کر دی"
اب وہ مجسم آئن سٹائن کی تھیوری تھے۔
خالد کا شیطان سے تعارف کرایا گیا۔ خالد خاص غیر ملکی لہجے میں بولے —
"میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"
"پہلے آپ اپنے لئے کچھ کیجئے"۔ شیطان نے صابن کے جھاگ کی طرف اشارہ
کیا جو خالد کے چہرے پر لگا ہوا تھا۔
دونوں دور دور جا بیٹھے
"بیٹی، اب آ بھی جاؤ۔ اتنی دیر کر دی"۔ چشمی صاحب کار کی طرف دیکھ کر چلائے۔
"اتنی دیر سے کہہ تو رہی ہوں کہ بس ایک منٹ میں آئی"۔ ہم سب مڑ کر دیکھنے لگے
دروازہ کھلا اور کوئی چیز بلا ہاتھ میں لئے نکلی جو چند لمحوں کے لئے لڑکی سی معلوم ہوئی معلوم

ہوا کہ یہ حشمی صاحب کی دخترِ نیک اختر ہیں۔ ان کا نام انجم ہے اور محبوبہ شیطان ہیں۔

شیطان کی زندگی میں پہلے دو انجم آ چکی تھیں جنھیں تمیز کرنے کے لئے انجم خورد اور انجم کلاں کہا جاتا تھا۔

"اور یہ تیسری انجم؟"

"یہ انجم خورد بُرد ہے۔" وہ بولے

میں نے انھیں بتایا کہ اب تو شاید ہی آس پاس کے علاقے میں کوئی انجم باقی رہی ہو۔ کتنا اچھا ہو کہ اگر اس قسم کا اشتہار دے دیا جائے :-

"کیا آپ انجم ہیں؟

اگر ہیں تو مزید وقت ضائع مت کیجئے۔ فوراً مندرجہ ذیل پتے پر خط و کتابت کیجئے جو صیغۂ راز میں رکھی جائے گی۔"

حشمی صاحب کے عزیزوں سے تعارف ہوا۔

"یہ کلیم الدین عرف کالو ہیں۔"

"آداب عرض!"

"اور یہ بہاء الدین عرف جھوورو ہیں۔"

"آداب عرض!"

"اور آپ کی تعریف ——؟" ایک صاحب نے شیطان سے پوچھا۔ جو کالو اور جھوورو صاحب کے ساتھ کھڑے تھے۔

"انھیں ڈ بو سمجھ لیجیے۔"

چار بالکل ایک قسم کے حضرات سے مل کر شیطان نے کہا" مجھے آپ چاروں سے مل کر بہت خوشیاں ہوئیں۔"

میں نے انجم کے متعلق پوچھا اور عاشق ہونے کی وجہ تسمیہ دریافت کی۔ وہ بولے "میں انجم پر ہرگز عاشق نہ ہوتا اگر وہ رضیہ سے اس درجہ مشابہت نہ رکھتی۔" میں نے انھیں بتایا کہ رضیہ اور انجم میں صرف اس قدر مشابہت ہے کہ دونوں کی دو دو آنکھیں ہیں ایک ایک ناک اور دو دو کان ہیں۔ بس!

اب مردوں کی باری تھی۔ خواتین فیلڈ کرنے نکلیں۔ تالیوں کے شور میں دو حضرات برقعے پہن کر نکلے۔ تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ بھٹک گئے۔ ایک کا رُخ شمال مشرق کی طرف ہو گیا اور دوسرے کا شمال مغرب کی طرف۔ خواتین نے ان کی مدد کی اُنگلی پکڑ کر انھیں وکٹوں کے سامنے لایا گیا۔

پہلی گیند پر ایک صاحب نے برقعے کے اندر حیرت انگیز ہیٹ لگائی۔ دوسری گیند پر گیند بلا برقعہ سب آپس میں اُلجھ گئے۔ تیسری پر انھوں نے زور سے بلا اپنے گھٹنے پر دے مارا اور بجائے سامنے بھاگنے کے وکٹ کیپر کی طرف چل دیئے۔ آوازیں دے کر انھیں واپس بلایا گیا۔ ایک صاحب نے خواہ مخواہ اُچھلنا کودنا شروع کر دیا معلوم ہوا کہ برقعے میں بھڑ داخل ہو گئی ہے۔ برقعہ اتار کر بھڑ کو باہر نکالا گیا۔ انجم کو گھورتے رہنے کے باوجود مقصود گھوڑا اچھا کھیلا۔ پھر موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ مقصود گھوڑا بھاگ گیا بھاگتا

رک گیا اور سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ موٹر سائیکل کے چلے جانے کے بعد اسے پتہ چلا کہ وہ آؤٹ ہو چکا ہے۔

انجم نہ جانے کس بات پر کس سے خفا ہو رہی تھیں۔ خالد نے آگے بڑھ کر معافی مانگی۔

"معافی؟ معافی کس بات کی؟"

"پتہ نہیں ـــ لیکن چونکہ میں مرد ہوں اس لئے قصور لازمی طور پر میرا ہی ہوگا۔"

انجم شرمانے لگیں، دراصل ان کا ہاتھ چھل گیا تھا اور ڈاک کے ٹکٹ جتنے زنانہ رومال سے مالش کر رہی تھیں۔ شیطان بولے "اس پر تھوڑی سی سپرٹ لگا لو۔"

پھر انجم کے چہرے کو غور سے دیکھ کر بولے ـــ "اس پر تھوڑی سی سپرٹ ہرگز مت لگاؤ۔"

میں نے شیطان سے خالد کے متعلق رائے پوچھی۔ اس نے بتایا "یہ شخص اتنا چست ہے کہ ہاتھ میں کیمرہ لے کر خود اپنی تصویر اتار سکتا ہے۔"

"اور یہ لڑکی ـــ؟" شیطان نے بے صبری سے پوچھا

"اس کے سامنے ایک شاندار ماضی ہے۔" میں نے بتایا

"اور چشتی صاحب ـــ وہ بزرگ نما شخص؟" میں نے خالد سے پوچھا

"وہ شخص ـــ" خالد نے ہونٹ چبا کر کہا "ایسا ہے کہ اگر پنیر سے اس کا واسطہ پڑ جائے تو پنیر ہار مان لے اور دوبارہ دہی بن جائے۔"

اگلی صبح اخباروں میں چھپ گیا کہ خواتین نے حضرات کو تقریباً ڈیڑھ سو رنز سے شکستِ فاش دی۔

چشتی خاندان تین سو سال پرانا تھا۔ اس کا ثبوت افراد کے چہروں سے بھی ملتا تھا وہ کسی دوسرے ملک سے آئے تھے، اور وہاں کسی اور ملک سے۔ لوگ قیاس آرائیاں کرتے کہ بھلا وہ وہاں سے یہاں کیوں آئے۔ میرا خیال تھا کہ ایسے لوگ کسی ملک میں زیادہ دیر نہیں قیام کر سکتے مقامی باشندے تنگ آجاتے ہیں۔ وہ چشتی کیوں کہلاتے تھے؟ یہ ایک راز تھا۔

خاندان کے سارے افراد کی تعداد بائیس کے لگ بھگ تھی۔ لوگوں کی رائے تھی کہ وہ درجن بھر ہی کافی ہوتے۔ خاندان کے موجودہ سرکردہ ایک جہاندیدہ بزرگ تھے اور ان بزرگ کی سرکردہ چند جہاندیدہ خواتین تھیں۔

یوں دیکھنے میں وہ سب بڑے شرمیلے تھے۔ لیکن آپس میں ہرگز شرمیلے نہیں تھے۔ اس کا ثبوت ان متعدد شادیوں سے ملتا تھا جو چشتی خاندان میں ہوتی رہتیں۔ چشتی حضرات شروع شروع میں بڑے خلیق اور مہمان نواز ہوتے۔ لیکن بہت جلد سیکھ جاتے۔ چشتی بچے بڑے خوبصورت ہوتے لیکن پھر بڑے ہو جاتے۔ وہ بچے جنھیں آزادانہ تعلیم دی جاتی۔ کہ خود صلاحیتیں پیدا کر سکیں خلاف توقع نامعقول نکلتے اور وہ بچے جنھیں ڈرا دھمکا کر پڑھایا جاتا وہ بھی خلاف توقع نامعقول نکلتے۔ چنانچہ سارے چشتی بچے احمق تھے۔ بڑے چشتی اور

بھی زیادہ احمق تھے کیونکہ ان کا وزن زیادہ تھا۔

ویسے چشمیوں میں کچھ اتنی زیادہ برائیاں بھی نہ تھیں، مصیبت یہ تھی کہ اُن کی خوبیاں نہایت بیہودہ تھیں۔ شیطان کی عادت ہے کہ کسی نئی جگہ پہنچتے ہی اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں۔ سب سے عجیب و غریب کنبہ چن کر اس کے ساتھ ضرورت سے زیادہ سوشل ہو جاتے ہیں۔

جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ وہ انجم چشمی عرف نور چشمی پر عاشق ہونے کی کوشش کر رہے ہیں تو سارے دوست حیران ہوئے سوائے میرے۔ میں شیطان کی کسی بات پر حیران نہیں ہوتا۔

اُس خاندان میں سب سے نمایاں شخصیت آشوب صاحب کی تھی۔ یوں تو وہ شاعر بھی تھے لیکن اُن کی سب سے بڑی خوبی اُن کی باتیں تھیں۔ متواتر اَن تھک باتیں۔ مجموعی طور پر اُن کی آواز بُری نہیں تھی بس وہ اسے ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے کے عادی تھے۔ یہ استعمال فضول خرچی تک پہنچ چکا تھا۔ جب کبھی اُن کے ہاں فون کیا جاتا آشوب صاحب کی آواز بیک گراؤنڈ میں ضرور سُنائی دیتی۔

ان کے کمرے میں چھوٹی چھوٹی مونچھوں والے کئی حضرات ہر وقت بیٹھے رہتے۔ یہ حضرات آشوب صاحب کی طرح بیکار تھے۔ ان کا گزارہ بھی مکانوں اور دکانوں کے کرائے پر تھا۔ ان میں سے اکثر لوگ ایسے تھے جو کسی نہ کسی غرض سے آتے، قرض مانگنے اپنی مصیبتیں سُنانے، یا چشمی لڑکیوں کے رشتے کی درخواست کرنے۔

لیکن ہر ایک کو چشمی صاحب کی باتیں سننا پڑتیں۔ چنانچہ صبح شام، دن رات، گرمی سردی

ملاقاتیوں اور باتوں کا تانتا بندھا رہتا۔ افواہ تھی کہ اگر وہ باتیں نہ کریں تو انھیں مالیخولیا ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ مالیخولیا کو وہ ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ تبدیلیٔ گفتگو کی غرض سے پہاڑ پر گئے۔ وہاں خواتین زیادہ تھیں لہٰذا باتیں سننے والا کوئی نہ مل سکا۔ آشوب صاحب کو نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔

وہ طرح طرح کی مفید باتیں سناتے۔ مختلف شہروں کے زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم ٹمپریچر بتاتے۔ یہ بتاتے سلفا نائڈ دوائیاں مغلوں کے زمانے میں بھی استعمال ہوتی تھیں۔ بے خبری کے عالم میں ایکس رے اور ریڈیم اشوک کے وقتوں میں دریافت ہو چکا تھا لیکن باقاعدہ استعمال انگریزوں کے کہنے پر شروع ہوا ہے۔ اگر شیخ سعدی اپنی سیاحت کے دوران میں ایک جگہ نیوزی لینڈ کا لگا آتے تو جنوب مشرقی ایشیا کی تاریخ بلکہ جغرافیہ مختلف ہوتا۔ حقہ حضرت نوحؑ کے وقتوں کی چیز ہے۔ امرود میں وٹامن اے بی سے لے کر زیڈ تک ہوتے ہیں۔ ہنری ہشتم نے ہشت شادیاں کیں لیکن کامیاب ایک بھی نہ ہوئی۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے خواب بھی سناتے جو اکثر ان کے احباب کے متعلق ہوا کرتے۔ خوابوں میں زمین پھٹتی اور ان کا ایک دوست اندر سما جاتا۔ یا دیکھتے دیکھتے بجلی کڑکتی اور ان کے ایک دوست کے اوپر جا گرتی۔ یا ایک دیو آتا اور ان کے کسی دوست کو اٹھا کر دوڑ جاتا۔

جب وہ اپنے ڈراؤنے اور تباہ کن خواب چھوٹی چھوٹی مونچھوں والے حضرات کو سناتے تو ہمدردی کا اظہار بھی کرتے جاتے اور ایسی نگاہوں سے انھیں دیکھتے جیسے

اُن کی زندگی کے دن گنے گنلتے رہ گئے ہیں۔ اب اللہ ہی حافظ ہے۔

اُن کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے بہت دیر سے بیٹھا ہوں باتیں خواہ کتنی آہستگی سے کی جاتیں اُنھیں سُنائی دے جاتیں۔ بعض اوقات تو وہ خیالات تک کو سُن لیتے۔

لیکن شیطان کا رویّہ اُن کے ساتھ ازحد پرخوردارانہ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دونوں کے خیالات صدیوں سے یکساں رہیں۔ اُن کی ہر بات پر شیطان بڑی متانت سے جی ہاں کہتے۔ اکثر یہ جی ہاں فقرہ ختم ہونے سے پہلے کہہ دی جاتی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شیطان فرض کے سلسلے میں بہت کچھ برداشت کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے کہ اس طرح اُنھیں نور چشمی پر لگاتار عاشق رہنے کے موقعے ملتے رہتے ہیں۔ بقیہ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ محض مشق کر رہے ہیں۔ ان دنوں اور کسی سے واقفیت نہیں ہے اور وہ آؤٹ آف پریکٹس نہیں ہونا چاہتے۔ شیطان اس قسم کے تجربے کرنا کبھی بند نہیں کرتے جیسے خواتین اپنے کوٹ کے بٹن سردیوں میں کبھی بند نہیں کرتیں۔ مجھ سے وہ اکثر کہا کرتے "حالات اور بھی خراب ہو سکتے تھے۔ کیا ہوتا اگر میں اور تم چشمی ہوتے"۔

خالد اور شیطان کے درمیان کھنچاؤ یا تناؤ جو کچھ بھی تھا بدستور رہا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کتابی قسم کے آداب برتتے۔ تصنعات سے کام لیتے اور اکثر خاموش رہتے۔ آخر ایک روز شیطان بولے۔ "خالد صاحب! آپ نہایت نامعقول قسم کے انسان ہیں"۔

"رُونی صاحب، آپ نہایت بیہودہ شخص ہیں"۔ جواب ملا

اس کے بعد جو فقرے اِستعمال ہوئے وہ ناقابلِ اشاعت تھے۔

پھر شیطان نے آگے بڑھ کر خالد کو اِس زور سے گلے لگایا کہ اُن کی جیب میں رکھے ہوئے دو سگار چُور چُور ہو گئے۔ "بسم اللہ! بسم اللہ! ۔۔۔ دیکھئے اب بے تکلّف ہوتے ہیں ۔۔۔"

شیطان، انجُم کے رومان سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں تھے۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ زندگی میں انھیں ایک وسیع خلا محسوس ہوتا ہے ایسا خلا، جسے ایک رقیب ہی پُر کر سکتا ہے۔ کیا خبر تھی کہ زندگی میں ایسے دن بھی دیکھنے ہوں گے کہ رقیب کے بغیر محبّت کرنی پڑے گی۔ اس قسم کا یہ پہلا موقعہ تھا ۔۔۔ کاش کہیں سے آتا۔ کوئی رقیب ۔۔۔ محبّت کے سہانے افق پر آہستہ آہستہ جلوہ نما ہوتا، یا تاریکیوں سے دفعتہً آن کُودتا۔

اس سے پہلے بھی وہ رقیب کی خواہش کر چکے تھے۔ مجھ سے کہا۔ میں نے معذوری ظاہر کی کہ میرے حالات ایسے ہیں کہ کم از کم سال بھر مجھے ایسے مخصوں سے دُور رہنا پڑے گا۔ خالد سے پوچھا۔ وہ بولے، میں اس قدر تبدیل ہو چکا ہوں کہ مجھ میں اب رقیب بننے کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔

شروع شروع میں اُن کا معیار بلند تھا ۔۔۔ سرد آہ کھینچ کر کہتے "دنیا بھر کو رقیب ملتے ہیں۔ اگر نہیں تو ہماری ہی قسمت میں نہیں۔ کاش کسی طرح آتا، کوئی رقیب، کیسا ہی ہو۔ خوبصورت اور معمولی دماغ کا، یا معمولی شکل والا اور ذہین (آہستہ آہستہ

معیار بدل گیا) موٹا یا بھدا رقیب، باتونی، عینک لگانے والا یا منشی فاضل (آخر میں) زندہ ہو یا مُردہ —

اس سٹیج پہ مقصود گھوڑے کو لایا گیا۔

مقصود گھوڑا ہوسٹل میں امن اور چین سے دن گذار رہا تھا۔ وہ ہمیشہ سچ بولتا، بڑوں کا ادب کرتا، سگریٹ پیتا نہ کوئی اور چیز۔ ہر روز علی الصبح اٹھتا اور رات کو جلد سو جاتا — الغرض وہ نہایت اعلیٰ، پاکیزہ اور پھیکی زندگی بسر کر رہا تھا۔ دفعتہً اس کے ماموں جان کو چند ماہ کے لئے کہیں جانا پڑا۔ انھوں نے مقصود گھوڑے کو اپنی کوٹھی کا چوکیدار مقرر کیا اور ہدایات دیں کہ وہ کوٹھی میں منتقل ہو جائے۔ گھر کا خیال رکھے — یہ انتقال فوراً عمل میں لایا گیا۔

پہلا ہفتہ تو ہوسٹل کے انداز میں گزرا۔ پھر بڑے بڑے آراستہ و پیراستہ کمرے حریری پردے، ملائم قالین، گلدان میں سجے ہوئے معطر پھول، جذباتی قسم کی تصویریں، ریڈیو سے نکلتے ہوئے پُرسوز نغمے — مقصود گھوڑے کے اعصاب پہ سوار ہونے لگے۔

گھر، کار، تجوریاں — خدا کا دیا سب کچھ تھا لیکن مقصود گھوڑا خوش نہیں تھا، وہ دن بدن غمگین ہوتا گیا۔ آہیں بھرنے لگتا، کلاس میں بیٹھا بیٹھا ایسا کھو جاتا کہ پروفیسر بھی نہ پا سکتے۔ موقع بے موقع چاند کی طرف دیکھنے سے بھی نہ چوکتا۔ آخر ایک روز اس نے چاند پہ عجیب سی گفتگو شروع کر دی، زندگی کے بے تکے پن پہ — یہ کیا ستم ہے کہ

ہر روز مقررہ وقت پر اُٹھو، شیو کرتے وقت اپنا چہرہ دیکھو۔ وہی چہرہ جو بار بار دیکھا ہے، جسے دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے۔ ناشتہ کرو تو وہی چائے اور وہی ڈبل روٹی، کالج جاؤ تو وہی لڑکیاں، دوپہر کے کھانے کے بعد ریڈیو پر وہی ریکارڈ، اور ایک ضروری اعلان، رات کو رات کا کھانا ـــ زندگی میں کسی قدر جمود ہے۔ ایک دن دوسرے دن جیسا ہے، دوسرا تیسرے جیسا، تیسرا چوتھے جیسا، چوتھا ـــ

"تم اس جمود کو توڑتے کیوں نہیں۔" شیطان بولے ـــ "صبح اُٹھ کر رات کا کھانا کھایا کرو، پھر قیلولہ کرو، سہ پہر کو کالج جاؤ۔ وہاں غسل کرو اور سنگل روٹی کا ناشتہ، حجام سے شیو کراؤ اور حجام کا شیو خود کرو ـــ"

"آہ! تم مجھے سمجھے نہیں ـــ اس جمود کی وجہ تنہائی ہے۔" مقصود گھوڑا آسمان کی طرف دیکھ کر بولا ـــ ہم سمجھ چکے تھے۔

چنانچہ اُسی شام کو ایک نجومی آیا۔ ویسے ہمیں کسی نجومی کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ جس قسم کی زندگی ہم گزار رہے تھے۔ اس کے لئے نجوم بیکار تھا لیکن مقصود گھوڑے کی قسمت پوچھی گئی۔ نجومی نے شیشے کے گولے کو سامنے رکھ کر ایسی زبان میں باتیں شروع کیں جیسے برما، ملایا اور چین کے سننے والوں کے لئے ریڈیو پروگرام ہوتا ہے۔ پھر وہ عام فہم فقرے استعمال کرنے لگا ـــ "اب دھند صاف ہو رہی ہے۔ وہ سامنے امریکن کار جا رہی ہے وہ دیکھئے اس کا اگلا حصہ گزر رہا ہے ـــ اب درمیان کا حصہ گزرا ـــ اور اب آخری ـــ لیجئے پوری کار گزر گئی ـــ ریڈیو گرام کوٹھی کے سامنے آکر رُکی ـــ یہ کون اتر رہا ہے

یہ چہرے پر کیا الابلا پہنے ہوئے ہے۔ ٹانگے کا گھوڑا معلوم ہوتا ہے  اُوہ یہ تو سہرا باندھے ہوئے ہے۔ اب دھند چھا رہی ہے۔ جتنی دیر یہ دھند صاف ہو مجھے ایک سگرٹ دیجئے۔ اور یہ کون ہے  ایک لڑکی آئینے کے سامنے کھڑی بھویں اکھیڑ رہی ہے۔ سامنے ایک نوجوان اپنی مونچھیں بنا رہا ہے۔ اب وہ سرمے سے بھویں بنا رہی ہے۔ ارے! نوجوان تو یہی ہیں —" مقصود گھوڑے کی طرف اشارہ ہو گیا۔ (انجم بھویں اکھیڑتی تھی)

رات گئے وہی شخص شیطان سے پچیس روپے مانگنے آیا۔ شیشے کا وہ گولہ ٹوٹ گیا تھا۔

ہمیں کسی نے بتایا کہ حشمی بیمار ہیں، ہم عیادت کو گئے تو دیکھا کہ وہ بیحد زندہ ہیں اور گلیڈسٹون کو بُرا بھلا کہہ رہے ہیں۔ بیگم حشمی نے حسبِ معمول خالد کو نہیں پہچانا۔ خالد نے حسبِ معمول اُنھیں یاد دلایا کہ ایک چھوٹی سی کار میں وہ ایک روز بازار گئی تھیں جہاں اُنھوں نے مشین پر اپنا وزن بھی کیا تھا (وزن کے کارڈ پر قسمت یہ لکھی تھی۔ "آپ کا محبوب آپ کے لئے تڑپ رہا ہے") موٹر کی اگلی سیٹوں پر ایک تو ڈرائیور تھا اور ایک سفید قمیص پہنے ہوئے ایک شخص"— "ہاں یاد ہے۔"

"وہ شخص میں تھا—"

حشمی ڈاکٹروں کی برائیاں کرنے لگے — "پہلے اُنھوں نے میرے گلے کے غدود نکالے، پھر ٹانسل، پھر نصف سے زائد دانت پھر اپینڈکس، اگر اُن کی بسائی ہوتی

ہدایات پر عمل کرتا تو کبھی کا سدھار چکا ہوتا — اپنے رخصت شدہ اعضا سے ملنے۔"

"آپ مری کیوں نہیں جاتے ؟"

"کیا مطلب — ؟" چشمی چونک کر بولے۔

"جی میرا مطلب ہے کو وہ مری —"

"اوہ —"

جس وقت ریڈیو پر "خونِ دل پینے کو اور لختِ جگر کھانے کو" ہو رہا تھا تو خالد ایک موٹے تازے بچے کو للچاتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ بچے کو فوراً اندر بھجوا دیا گیا۔

"اس بچے کا نام کیا تھا ؟" خالد نے پوچھا۔

"لطیف"۔

"اور اس کا — ؟" خالد نے ایک نہایت ہونق بچے کی طرف اشارہ کیا

"شکیل"۔

"اور وہ — ؟" سامنے ایک بیوقوف سی بچی بیٹھی تھی۔

"فہمیدہ —"

"ہم لوگ نام رکھنے میں بہت جلدی کرتے ہیں۔ میرے خیال میں آٹھ دس سال کی عمر سے پہلے نام نہیں رکھنا چاہئے۔ اس کے بعد بچے کی شکل و صورت، حرکتیں وغیرہ دیکھ کر فیصلہ کیا جائے —"

"اور اتنی دیر تک ۔۔۔ اننے دنوں انھیں نمبروں سے پکارا جائے ۔؟" چشمی صاحب چڑکر بولے۔

"جی نہیں عارضی نام دے دیئے جائیں"

چشمی صاحب اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے جہاں چھوٹی چھوٹی مونچھوں والے کئی حضرات اُن کے منتظر تھے۔

اگر آپ کو کوئی ایسا انسان نظر آئے جو تندہی سے اپنے کام میں مشغول ہو، پھر ریل کی سیٹی یا موٹر سائیکل کی آواز سن کر اُسے دورہ سا پڑ جائے ۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آواز کی سمت میں ٹکٹکی باندھ کر دیر تک دیکھتا رہے تو سمجھ لیجیئے کہ آپ نے مقصود گھوڑے کو دیکھا ہے ۔ وہ نہایت کم گو اور خاموش طبیعت ہے اس لئے کہ اُسے باتیں کرنی نہیں آتیں ۔ آپ اس سے کوئی سوال کیجئے وہ آپ کو کسی اور سوال کا جواب دے گا۔ ضدی اتنا ہے کہ ہمیشہ اسی طرح کرے گا جس طرح اُس کا جی چاہے ۔ اگر اُسے منع کیا جائے تو کہیں اور جا کر اُسی طرح کرے گا۔ پہلے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ رقیق القلب ہے لیکن بعد میں معلوم ہوا ہے کہ رقیق القلب ہونا تو ایک طرف رہا اُسے اس لفظ کے ہجے تک نہیں آتے ۔ البتہ وہ قنوطی ضرور ہے ۔ قنوطی بھی ایسا کہ جب صبح صبح لوگوں کی گھڑیوں میں آٹھ بجتے ہیں تو اُس کی گھڑی میں شام کے آٹھ ہوتے ہیں۔

"پتہ نہیں" اور "ہو سکتا ہے" ۔۔۔ اس کا تکیہ کلام تھا یا تھے ۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ زبردست ڈپلومیٹ ہے لیکن شیطان کہتے تھے کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا

جنھیں سچ مچ کچھ بھی پتہ نہیں اور جن کے لئے واقعی سب کچھ ہو سکتا ہے جو دوگانہ تنکر کو وہ پیار بھرا گانا سمجھتے ہیں جسے ایک لڑکا اور ایک لڑکی مل کر گائیں۔

وہ پُرسوز گانے گایا کرتا۔ ہمیشہ کسی درخت یا پودے یا کسی چیز کی آڑ لے کر تاکہ اگر اس کی طرف کچھ پھینکا جائے تو اُسے نہ لگے۔ اس سوز کی وجہ کوئی ٹریجڈی تھی جو اس کی زندگی میں آئی۔ ٹریجڈی کی وجہ ایک لڑکی بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس حادثے کے بعد اس نے کسی لڑکی کی طرف نہیں دیکھا یا کم از کم زیادہ دیر تک نہیں دیکھا۔

ہمارا زیادہ وقت اس کی پُرتکلف کوٹھی میں گزرتا۔ اس کے ماموں کی کار کو لئے پھرتے۔ اس کی لائبریری کی ساری جاسوسی کتابیں ہمارے لئے تھیں۔ اس کے پیانو پر شیطان ایک عجیب و غریب راگنی بجاتے۔ خالد نے بتایا کہ وہ مصری اساوری تھی۔ انھوں نے صحراؤں میں بارہا ساربانوں کو یہی چیز گاتے سنا تھا۔ البتہ دور سے یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ کون گا رہا ہے! ساربان یا اونٹ یا دونوں؟

اس سارے شور و غل کے باوجود مقصود گھوڑا اُداس رہتا۔ کبھی وہ اپنے آپ کو ازلی کنوارا سمجھتا کبھی ابدی کنوارا۔ خالد مشورہ دیتے کہ فوراً شادی کر لو اس ملک میں کنوارا رہنا بہت مشکل ہے۔ جو یہاں پیدا ہوتا ہے اس کی ہتھیلی پر شادی کی لکیر سب سے پہلے آتی ہے۔ اگر تم سوشل ہوئے تو لوگ شبہ کریں گے کہ لفنگے ہو۔ اور اگر الگ تھلگ رہے تو تب بھی لوگ شبہ کریں گے کہ لفنگے ہو۔

مقصود گھوڑا دوسرے ملکوں کی مثال دیتا جہاں لاتعداد کنوارے اطمینان

اور چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

"وہاں کی بات اور ہے۔ ان لوگوں کے مشاغل بے شمار ہیں۔ بھلا تمہارا کیا مشغلہ ہے؟"

"میں ہاکی کھیلتا ہوں۔" حقیقت یہ تھی کہ وہ ہاکی نہیں کھیلتا تھا ہاکی اُسے کھیلتی تھی۔

"یہ کوئی مشغلہ نہیں، اور پھر وہاں لوگ اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ انہیں افواہیں سننے یا پھیلانے کی فرصت نہیں ہوتی۔ ادھر افواہیں ہماری زندگی کے چند گنے گنائے مشغلوں میں سب سے اہم ہیں۔ یہی ہماری محبوب ترین تفریح ہے۔ وہ لوگ کم گو ہیں۔ ان کے مرغے ایک دفعہ کاک اے ڈوڈل ڈوو کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں ہمارے مرغوں کی طرح دن رات ککڑوں کوں نہیں کرتے۔ مجال ہے کہ غیر ملکی اُلو دو تین دفعہ سے زیادہ ٹو وِٹ ٹو وُو کہے۔ ادھر سودیشی اُلو ہیں کہ رات بھر وہ ہاؤ ہو مچاتے ہیں کہ بس توبہ ہی بھلی۔ اور خوش طبعی کے لیے تو شادی بڑی ضروری ہے جب تک اپنی بیزاری، اپنا رنج و غم کسی اور کے بھی سر نہ منڈھا جائے زندگی کا لطف نہیں آتا۔ اگر تم نے دو تین برس اور اسی طرح گذار دیئے تو وہ وقت مری جان بہت دور نہیں ہے جب لوگ تم سے بھاگیں گے۔ دوست کترانے لگیں گے۔ ملک بھر میں ہر گھر تمہارے لیے آؤٹ آف باؤنڈز قرار دیا جائے گا۔ جہاں جاؤ گے علیک سلیک کے بعد یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ تمہاری تشریف آوری کا مقصد کیا ہے۔ بوڑھے ہو جاؤ گے

تو تمہارے بھتیجے اور بھانجے تمہاری جائداد کو بڑی محبت بھری نگاہوں سے دیکھیں گے۔ اور نہایت خلوص سے تمہارے انتقالِ پُرملال کی دعائیں مانگیں گے۔"

مقصود گھوڑا بہت گھبراتا۔ آخر اسی گھبراہٹ میں اُس نے اپنی زندگی کی ٹریجڈی سنادی، جو بالکل ویسی ہی تھی جیسی اکثر زندگیوں کی ٹریجیڈیاں ہوتی ہیں۔ بھلا وہ اپنی پہلی اور سچی محبت کو کیونکر بھول جاتا؛

"زندگی کی پہلی اور سچی محبت کا علاج زندگی کی دوسری سچی محبت ہے" خالد نے اُسے بتایا۔ آخر مقصود گھوڑے نے ہتھیار ڈال دیئے اور اپنے رشتہ داروں کو مطلع کر دیا کہ وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔

اس کے بعد مقصود گھوڑے کو اس مقابلے کا سامنا کرنا پڑا جو اس ملک میں تقریباً ہر نوجوان کو کرنا پڑتا ہے۔ اس کے مقابلے کے تین راؤنڈ ہوتے ہیں۔!

پہلے راؤنڈ میں مقصود گھوڑے کی کزن آئیں۔ چچا زاد، ماموں زاد اور پھوپھی زاد بہنیں، کنبے بھر کے شفقت بھرے فقرے، بزرگوں کی نصیحتیں اور اُلٹے سیدھے جذبات ایک دو لڑکیاں خاصی تھیں لیکن یہ راؤنڈ کفوں کا کنبوں کے ساتھ تھا۔ لہٰذا نہ کزنوں نے مقصود گھوڑے کی کوئی قدر کی اور نہ اُس نے اُن کی ہم نے اسے بتایا کہ ایسی شادیاں دیرپا نہیں ہوتیں فریقین بہت جلد بے پروا ہو جاتے ہیں۔ لڑکے اپنے لباس حجامت اور رویے کا خیال نہیں رکھتے۔ ادھر لڑکیاں موٹی ہو جاتی ہیں۔ یہ سب درست ہو گا جب لڑکیاں اور لڑکے اقتصادی طور پر آزاد ہو جائیں گے تب ایک دوسرے کو

جیتنے کے لیے رشتہ داری کی جگہ خوبیوں اور صلاحیتوں کی ضرورت ہو گی۔ مقابلہ دہرا ہوگا اس لیے انتخاب سے پہلے اپنے آپ کو اس قابل بنانا ہو گا۔ چونکہ اقتصادی آزادی میں ابھی کافی دیر ہے اس لیے مقصود گھوڑا پہلا راؤنڈ جیت گیا۔

دوسرے راؤنڈ میں دور کی رشتہ دار لڑکیاں آئیں۔ خالہ کی چچا زاد بہن کے نواسے کی چچی کی قسم کی لڑکیاں۔ شیطان فوراً پنسل لے کر حساب لگاتے۔ جواب ہمیشہ غلط نکلتا۔ لڑکی یا تو برخوردار ہوتی یا بے حد بزرگ۔ ایک لڑکی تو تحقیقات کے بعد پوتی نکلی۔ شیطان بولے "اس سے شادی تبھی کر سکتے ہو۔ جب تم خود اپنے پوتے ہو۔"

ادھر مقصود گھوڑے کو کوئی پوچھتا ہی نہ تھا۔ سب اُس کے والدین اور خاندان کی باتیں کیا کرتے۔ یہ راؤنڈ بھی مقصود گھوڑے کا رہا۔

تیسرے راؤنڈ میں "رشتے کی فوری ضرورت" کے عنوان سے اشتہار دیے گئے۔ جواب آئے لیکن اُن میں سے زیادہ ایسے تھے جو لڑکوں نے شرارتاً بھیجے تھے۔ اُن میں سے کئی کو تو ہم نے پہچان بھی لیا۔ وہ اس شغل کو بطورِ تفریح کیا کرتے اور اسی طرح قسم قسم کی تصویریں جمع کیا کرتے۔ بقیہ خطوط پر ہمیں شبہ ہو گیا۔

"یہ جو لوگ ہر وقت کہتے رہتے ہیں کہ اپنے ملک میں سب کچھ ہے پیارے ایسی اچھی لڑکیاں مل سکتی ہیں۔ کہاں ہیں وہ سب لڑکیاں۔" مقصود گھوڑا تیسرے راؤنڈ کی طوالت سے تنگ آکر بولا۔

"ویسے میں کئی حسین و جمیل لڑکیوں کو جانتا ہوں۔" شیطان بولے۔ "یہ دوسری

بات ہے کہ فی الحال وہ دوسروں کی بیویاں ہیں — اور —"

"لیکن —"

"جیب میں ٹوک رہا ہوں مت بولا کرو — دراصل ہم نے اشتہار غلط دیئے ہیں کہ خاوند کے لیے بیوی کی ضرورت ہے مقصود جیسا بیزار نفس اور صلح پسند انسان تو کسی عورت کی بیوی زیادہ اچھی طرح بن سکے گا۔"

ہم مقصود گھوڑے کو لے کر حشمی صاحب کے ہاں گئے۔ وہ قطب الدین ایبک پر خفا ہو رہے تھے کہ پولو جیسا خطرناک کھیل مارکوپولو جیسے انسان سے کیوں سیکھ لیا۔ مارکوپولو سے انھیں یہ گلہ تھا کہ یالا یالا چین کی طرف نکل گیا اور لاہور نہ آیا۔

تعارف ہوا۔ حشمی نے فرمایا کہ مقصود نامکمل سا نام ہے۔ اس کے ساتھ اور ناموں کی طرح کوئی اضافت ہونی چاہیے۔ بلبل زئی۔ جاٹ۔ تمانی قسم کی۔

"جی یہ آسپی ہیں" خالد بولے۔

"اسپی کون لوگ ہوتے ہیں؟"

"ان کا شجرہ ارپ ارسلان سے جا ملتا ہے۔"

"مجھے ارپ ارسلان بالکل ناپسند ہے۔ خاص طور پر اس کی سیاسی غلطیاں — اور برخوردار تم کیا کرتے ہو؟"

"جی ایم۔ اے کا آخری سال ہے۔"

اچھا تو طالب علم ہو اور تمھارے مشاغل کیا ہیں؟"

"ہاکی کھیلتا ہوں۔"

"یہ کوئی مشغلہ نہیں مشغلے اور ہوتے ہیں۔ دوسرے ملکوں کے ٹکٹ جمع کرنا۔ تتلیوں کے پر اکٹھے کرنا۔ میری لڑکی انجم نے طرح طرح کی تتلیاں پکڑی ہیں۔ پڑوس میں ایک بوڑھا انگریز رہتا ہے۔ وہ اپنے فرصت کے لمحات تتلیاں پکڑنے میں صرف کرتا ہے اور اس جیسا مسرور انسان میں نے نہیں دیکھا۔ انجم نے اسے دیکھ کر تتلیاں پکڑنی شروع کی تھیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انجم درجن بھر لڑکوں سے زیادہ عقلمند ہے۔ اُسے سب کچھ میں نے سکھایا ہے۔ اپنی زندگی میں میں نے کیا کچھ نہیں دیکھا۔ اگر اپنی سوانح عمری لکھوں تو امریکہ والے اس کی فلم بنانے کو تیار ہو جائیں اور یہ سب کچھ تقدیر سے ملا۔ یہ تقدیر ہی تھی کہ۔۔۔"

"تقدیر کی جگہ کوئی اور لفظ استعمال کیجیے۔۔۔ میں اس کا قائل نہیں۔۔۔"

خالد بولے۔

چشتی صاحب نے ایک لمبی تقریر کی جس میں تقدیر کے معنی اس کی اہمیت اور فوائد بتائے۔

خالد نے کہا، "شاید آپ کو یاد ہو۔ آپ کا ایک چھوٹی مونچھوں والا دوست آپ کے پاس خوشبوئیں لایا کرتا تھا۔ اُس نے خوشبوؤں کا نیا نیا کاروبار شروع کیا تھا وہ حوصلہ افزائی کا خواہاں تھا۔ آپ خوشبو سونگھ کر کہا کرتے کہ مجھے تو خاک پتہ نہیں چلتا۔ ایک مرتبہ آپ نے حنا درجہ خاص کے متعلق فرمایا تھا کہ شیشی سے تربوز کی بو آ رہی ہے۔

اُس نے خوشبوؤں کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ آخر اس قدر بیزار ہُوا کہ کاروبار چھوڑ کر بھاگ گیا۔ قصور اُس کی قسمت کا نہیں تھا آپ کے نزلے کا تھا جو آپ کو ہر وقت رہتا ہے اور آپ کچھ بھی نہیں سونگھ سکتے۔ پرانے زمانے میں ہماری فوجوں کے پاس مُڑی ہوئی تلوار کی جگہ سیدھی یورپین تلوار ہوتی تو آج حالات مختلف ہوتے۔ مُڑی ہوئی تلوار سے دشمن کو دھما دھم کوٹا جا سکتا ہے سیدھی تلوار والی چُستی اور پھُرتی ہرگز نہیں آتی۔"

چینی خفا ہونے لگے۔

"آپ بہت جلد خفا ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ بھی مجھے معلوم ہے شاید آپ نہیں جانتے کہ آپ کا کتا بے حد زود رنج اور چڑچڑا ہے، بات بات پر بھونکنے لگتا ہے۔ آپ کی بلی خود غرض اور ایذا پسند ہے، رات بھر دھاڑیں مار مار کر روتی ہے۔ کتے بلیاں ایک کنبے پر کس قدر اثر انداز ہوتے ہیں اس کا علم شاید آپ کو نہیں۔ پالتو جانوروں کی خصلت کنبے کے افراد کے تحت الشعور پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ایک تندرست کتا ایک خوش طبع بلی گھر کی مسرتوں میں اضافہ کرتی ہے۔ اسی طرح ذرا سی غلطی سے کئی زندگیاں تباہ ہو سکتی ہیں تعجب ہے کہ ہم لوگ اس طرف ذرا بھی توجہ نہیں دیتے۔ ذرا اپنے کتے بلی کو بلایئے تو سہی میں نے مشرقِ وسطیٰ میں جانوروں کا نجوم اور قیافہ شناسی سیکھی ہے۔"

کتا بلی لائے گئے۔ خالد نے دونوں کے پنجے دیکھے، پھر اُن کے ناموں کے

الفاظ کو کاغذ پر لکھ کر حساب لگایا اور افسوس میں سر ہلا دیا۔" کتّے پر زحل کا سایہ ہے۔ یہ شہرت کا خواہشمند ہے۔ اس گھر میں اسے شہرت نہیں ملے گی۔ چنانچہ یہ خونخوار بن جائے گا۔ بلّی کی قسمت کی لکیر غائب ہے۔ اس کا ستارہ گردش میں ہے۔ آپ ان دونوں کو کہیں دور بھجوا دیجیے۔ کل تک ایک تندرست کتّا اور ایک ہشاش بشاش بلّی آپ کے ہاں پہنچ جائے گی۔ پھر دیکھیے کتنا فرق پڑتا ہے اور یہ بہت سی خالی بوتلیں کیسی ہیں؟"

چشمی نے مشکل سی زبان میں ایک بیماری کا نام لیا جس سے جوڑوں میں درد ہو جاتا ہے۔ "یہ بیماری مجھے پیدائش سے ہے۔ اپنے جوڑوں کو باقاعدہ استعمال نہیں کر سکتا۔ آج تک کبھی تیز نہیں چل سکا۔ حسرت ہی رہی۔"

"مجھے بھی یہی بیماری تھی لیکن مشرقِ وسطیٰ کے ایک تیر بہدف نسخے نے اسے غارت کر دیا۔ دوائی کتّے بلّی کے ساتھ بھجوا دوں گا۔"

مقصود گھوڑے نے ایک چھوٹا سا جال خریدا اور بڑے جوش و خروش سے تتلیاں پکڑنی شروع کر دیں۔ اُدھر لوٹا ہوا انگریز نکلتا ادھر مقصود گھوڑا منتظر ہوتا۔ وہ آگے آگے یہ پیچھے پیچھے۔ گھنٹوں یہی شغل رہتا۔ اکثر یہ تعاقب بے سُود ثابت ہوتا۔ کبھی کبھار ایک دو تتلیاں جال میں آ جاتیں تو مقصود گھوڑا سوچنے بیٹھ جاتا کہ اب ان کا کیا کروں۔

میں نے صبح صبح عجیب و غریب نظارہ دیکھا۔ چشمی سرپٹ بھاگے جا رہے ہیں اور پیچھے پیچھے دہی خالد کا ارسال شدہ کتّا ہے۔ مجھے دیکھ کر کتّے نے بریکیں لگائیں اور فوراً رک گیا۔ چشمی دور تک ویسے ہی بھاگتے چلے گئے۔ آواز دے کر بلایا۔ انھوں نے شکریہ ادا کیا

اور شکایت کی کہ یہ حادثہ آج ساتویں مرتبہ ہوا ہے۔ جونہی وہ صبح باغ کا رُخ کرتے ہیں۔ یہ نامعقول کتا فوراً بھونکتا ہوا کاٹنے کو دوڑتا ہے اور دیر تک پیچھا کرتا ہے حتیٰ کہ کتا تھک جاتا ہے۔ ادھر وہ کمبخت بلّی دودھ اور بالائی کی دشمن بن گئی ہے۔ چاہے چار قفل لگا دو لیکن وہ کسی نہ کسی طرح چٹ کر جاتی ہے۔

"اور وہ آپ کے جوڑوں کا درد ——"

وہ کچھ دیر تک سوچتے رہے پھر بولے —"اُفوہ! یہ تو خیال ہی نہیں رہا کہ درد کی وجہ سے چلنا پھرنا محال ہونا چاہیے۔"

کیفے میں انجم کا مقصود گھوڑے سے تعارف کرایا گیا۔

شیطان بولے "تمہاری زلفیں حکم کے یکّے جیسی سیاہ ہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی سیاہ ہیں۔"

"آپ بہت اچھے معلوم ہو رہے ہیں۔"

"تم بھی کچھ ایسی بُری نہیں لگ رہیں۔"

شیطان اور انجم اس انداز سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ آس پاس بیٹھے ہوؤں کو گھر یاد آنے لگا۔ حالانکہ بیشتر لوگ ایسے تھے کہ اگر وہ گھر میں ہوتے تب بھی ایسا نظارہ میسر نہ آتا۔

مقصود گھوڑے سے دوسری مرتبہ تعارف کرایا گیا تو اس کی کار کا بھی ذکر ہوا۔ کار کا ذکر سنتے ہی انجم چونکیں۔

"کون سا ماڈل ہے؟" ماڈل بتانا تھا کہ وہ مقصود گھوڑے کے ساتھ جا بیٹھیں۔ الغرض پورے ساڑھے پانچ بجے انجم، مقصود گھوڑے کی زندگی میں داخل ہو گئیں وہ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے کار کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں وہ بھول گئے کہ وہاں کوئی اور بھی بیٹھا ہے۔ صرف مقصود گھوڑا اور انجم رہ گئے۔ اور کار

اگلی صبح مقصود گھوڑے نے شیو کرتے وقت برش کئی مرتبہ چائے کی پیالی میں ڈبویا اور گرم پانی کا پیالہ اٹھایا۔ پھونک مار کر صابن کے جھاگ ہٹائے اور چند گھونٹ بھرے۔ اسے کئی چرکے بھی لگے جن سے خون نکلنا اُسے یاد نہ رہا۔

کچھ عرصے کے بعد اس نے ڈرتے ڈرتے انجم کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ انجم نے سب کچھ سُن کر القیاً کہا اور بتایا کہ انھیں بھی اس سے سو فیصدی اتفاق ہے لیکن وہ ابھی فیصلہ نہیں کر سکتیں اور اگلے روز سہ پہر کو انھیں کار کی ضرورت ہو گی۔

مقصود گھوڑے کی زندگی میں انقلاب آگیا!

اب اس کا روزانہ پروگرام حسبِ ذیل تھا:۔

علی الصبح اٹھ کر تتلیاں پکڑنا، کالج، سہ پہر کو انجم سے اظہارِ محبت کر کے یہ جواب لینا کہ وہ ابھی فیصلہ نہیں کر سکتیں اور اگلے سہ پہر کو انھیں کار چاہیے پھر تتلیاں پکڑنا۔ شام کو سوچتے رہنا کہ پکڑی ہوئی تتلیوں سے کیا سلوک کیا جائے۔

خالد نے بتایا کہ کتنے نے چشتی صاحب کے جوڑوں کے درد کا مکمل علاج کر دیا ہے۔

بلکہ بھاگ بھاگ کر اب کتّے کے جوڑوں میں درد شروع ہو گیا ہے۔ بلّی نے دودھ اور بالائی پر ہلّہ بول کر چشتی خاندان کی تین ضرورت سے زیادہ موٹی خواتین کو دُبلا کر دیا ہے۔ اب وہ تینوں قدرے خوبصورت ہو گئی ہیں۔ اُن میں انجم بھی ہے۔ چشتی صاحب کے خواب ختم ہو چکے ہیں۔ اُن کے ہاضمے کا فتور بھی رفع ہو چکا ہے۔ خالد کی بھیجی ہوئی تیر بہدف دوائی دراصل ہاضمے کا مکسچر تھا۔

لیکن خالد اور چشتی کی زبردست ڈوئل ہوئی —

ہم چشتی کے ہاں چائے پر مدعو تھے۔ وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کی مدح سرائی کر رہے تھے۔ ان مخلص اور جاں نثار رفیقوں کو انھوں نے ایک ایک کر کے چُنا تھا اپنے عزیزوں کو ایک ایک کر کے سدھایا تھا۔ اب اُن کی زندگی کا سرمایہ یہی لوگ تھے۔ قسمت دغا دے سکتی تھی مگر یہ لوگ قابلِ اعتماد تھے۔ پھر انجم کی تعریفیں ہونے لگیں۔ مقصود گھوڑے نے فوراً تتلیوں کا ذکر چھیڑ دیا کہ ہر وقت تتلیاں پکڑتا ہے اور یہ مشغلہ اس کی زندگی میں متعدد خوشگوار زندگیاں لے آیا ہے مگر وہ بوڑھا انگریز تو یونہی بیوقوف سا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُسے اور کوئی کام ہی نہیں۔ اس عمر میں ایسا مشغلہ کتنا عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔

"وہ بے وقوف نہیں، آرٹسٹ ہے۔ وہ تتلیوں کے پروں سے ڈیزائن چن کر انگلستان کی ایک مشہور کپڑے کی فرم کو بھیجتا ہے۔ کمپنی نے اُسے صرف اسی لیے ملازم رکھا ہے —" خالد نے بتایا۔

"ممکن ہے یہ سب فراریت ہو۔ بھلا بوڑھوں کو رنگین چیزوں سے کیا واسطہ؟"
چشمی نے محض بحث شروع کرنے کے لیے کہا۔

"ہو سکتا ہے فراریت ہو۔ لیکن فراریت کہاں نہیں، مذہب، آرٹسٹ، موسیقی، — سب فراریت ہے۔ ہم بھوک سے فرار ہونے کے لیے کھانا کھاتے ہیں۔ ابدی تنہائی سے فرار ہو کر دوست بناتے ہیں، شادی کرتے ہیں، جانوروں کی طرح ریوڑوں میں رہنا ہم نے اسی سلسلے میں اختیار کیا اور پھر زندگی بھی تو فرار ہے — اُس حالت میں جو زندگی سے پہلے چھائی ہوئی تھی۔"

"زندگی کو تم فراریت بتاتے ہو — لاحول ولا — زندگی تو جد و جہد ہے مستقل جد و جہد — یہ عمل چاہتی ہے عمل اور فرار دو متضاد چیزیں ہیں۔ میری زندگی کو لو اس کا ایک ایک لمحہ میں نے خود ترتیب دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری اگلی زندگی بھی ایسی ہی اعلیٰ ہو گی۔"

"اگلی وگلی زندگی کچھ نہیں ہو گی۔ بس یہی ایک زندگی ہے۔ موت کے بعد بھی کچھ ہو گا جو پیدائش سے پہلے تھا یعنی نامعلوم۔ آپ کو اپنی پیدائش سے پہلے کا کوئی واقعہ یاد ہے؟ آپ چشمی ہیں۔ کیونکہ آپ اتفاق سے ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو چشمی کہلاتا تھا۔ آپ جاپانی بھی ہو سکتے تھے یا جنوبی امریکہ کے کسی ہوٹل میں ڈھول بجانے والے۔"

"ایسے خیالات تو صرف دہریوں کے ہو سکتے ہیں جنھیں مذہب سے کوئی سروکار نہ ہو۔" چشمی حقارت سے بولے۔

## مزید حماقتیں

"شاید آپ نے سنا ہوگا کہ ایٹم کی نئی تھیوری کے مطابق انسان زمین کا ایک بہت بڑا حصّہ تباہ کر سکتا ہے۔ اگر یوں ہو جائے تو چاند کی کشش پر اثر پڑے گا اور چاند اس نظام سے نکل کر کسی سیارے سے ٹکرائے گا یا کسی دوسرے نظام میں شامل ہو جائے گا۔ یعنی انسان چاہے تو نظامِ شمسی بدل سکتا ہے پھر نہ چاندنی راتیں ہوں گی اور نہ یہ چاند زدہ شاعری (آشوب چشمی بھی اسی قسم کے شاعر تھے) ممکن ہے نظامِ شمسی خود بدل جائے۔ کیونکہ سورج بڑی تیزی سے ٹھنڈا ہوتا جا رہا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ گیارہ کھرب سال تک بالکل سرد ہو جائے گا۔"

"اچھا!" چشمی کرسی سے اچھل پڑے۔ وہ ڈر گئے تھے۔ "کیا کہا کتنے عرصے میں؟"

"گیارہ کھرب سال۔"

"اوہ!" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ "میں سمجھا گیارہ ارب سال۔"

"اور پھر دنیا کے سب مذہب بخشش کا وعدہ کرتے ہیں۔ ان کروڑوں انسانوں کا کیا حشر ہوگا جو مذہب سے پہلے اس دنیا میں آباد تھے۔ یا وہ جو دنیا سے بے خبر دور دراز گوشوں میں رہتے ہیں جہاں مذہب نہیں پہنچا۔"

"لیکن تمام مذاہب کے قوانین ایک سے ہیں۔ نیکی، بدی، گناہ، سزا، ہر دماغ انھیں سمجھ سکتا ہے یہ ضروری تو نہیں کہ کسی کتاب میں لکھ کر پلش کیا جائے۔" چشمی بولے۔

"مگر دنیا کے مختلف حصوں میں حالات مختلف ہیں۔ اس کے کچھ حصے اس قدر سرد ہیں کہ وہاں پانی کی جگہ لوگ شراب پیتے ہیں۔ اگر وہ شراب نہ پئیں تو زندہ نہ رہ سکیں۔"

"شراب نوشی کسی حالت میں بھی جائز نہیں۔ میں نہیں مانتا۔ شراب کا صرف ایک مقصد ہے۔ خواہ گرمی ہو یا سردی۔ افریقہ ہو یا روس۔" حشمی اڑ گئے۔

"کل میں نے آپ کے فریجیڈیئر میں بیئر کی بوتلیں دیکھی تھیں۔ شاید اب تک وہیں ہوں۔ لائیے یہ تجربہ بھی ہو جائے۔" ڈرامہ سے تین گدھے لائے گئے۔ ایک بالٹی میں بیئر اور لیمونیڈ ڈال کر شینڈی بنائی گئی اور گدھوں کو پلائی گئی۔ ایک گدھا تو فوراً آؤٹ ہو گیا اور آنکھیں موند کر وہیں سو گیا۔ دوسرے نے خرمستیاں شروع کر دیں۔ نعرے لگاتے، دولتیاں جھاڑیں، کرسیوں کو پھلانگ گیا۔ گلدستے کھا گیا۔ تیسرا گدھا خاموش تھا، وہ نیم وا آنکھوں سے خلا میں تک رہا تھا کتابوں اور تصویروں کی طرف بڑی عجیب نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ آخر پیانو کے سامنے آکھڑا ہوا، وہاں سے ہٹنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ خالد کی فرمائش پر ایک جذباتی قسم کا نغمہ بجایا گیا تو گدھے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

حشمی صاحب طیش میں آ گئے، گدھوں کو باہر نکال دیا گیا۔ وہ گرج کر بولے "یہ نئی پود کس قدر گستاخ ہے۔ ہر چیز کا مذاق اڑاتی ہے۔ زندگی پر انھیں یقین نہیں، مذہب سے یہ منکر ہیں، خوابوں کے یہ قائل نہیں۔ کل کو کہہ دیں گے کہ روح پر بھی عقیدہ نہیں۔"

"آپ روح دکھا دیجیے تو یقین کر لیں گے۔" خالد نے کہا

"روح نظر کیونکر آ سکتی ہے؟"

"تو اس کی موجودگی ہی محسوس کرا دیجیے۔"

اُنھوں نے بتایا کہ پڑوس کی کوٹھی آسیب زدہ ہے۔ کبھی وہاں ایک بدنصیب عاشق کا انتقال ہو گیا تھا۔ ہر رات اُس کی روح نالہ و شیون کرتی ہے۔ صبح کاذب کے وقت تو ایسی دلدوز صدائیں آتی ہیں کہ آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ چشتی صاحب کے دائمی نزلے کی یہی وجہ ہے، وہ علی الصبح بلاناغہ روتے ہیں۔

رات بھر ہم جاگتے رہے۔ صبح کاذب کے وقت آوازیں آنی شروع ہوئیں تو چھت سے ہوتے ہوئے دوسری کوٹھی پر پہنچے۔ یہ آواز نالہ و شیون کی ہرگز نہیں تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی کسی کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ کچھ ڈر بھی لگا۔ سیڑھیاں اُتر کر دیکھتے ہیں کہ ایک صاحب ہاتھ میں پانی کا گلاس لیے غرارے کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ اُن کا گلا ہمیشہ خراب رہتا ہے۔ علی الصبح اُٹھ کر وہ نمکین پانی کے غرارے کرتے ہیں۔ اب کچھ افاقہ ہے۔

چشتی صاحب نے اعلان کر دیا کہ وہ آئندہ ہم لوگوں سے ہرگز بحث نہیں کریں گے۔ "تم لوگ نہ صرف گستاخ ہو بلکہ تمھاری بے معنی گفتگو سے میرے نظریے خراب ہو رہے ہیں۔"

وہ تینوں گدھے ہر شام کو چشتی صاحب کے مکان کے سامنے اکھٹے ہوتے۔ بڑی مشکل سے انھیں بھگایا جاتا۔ کئی دنوں تک ایسا ہوا۔

محبت مقصود گھوڑا کر رہا تھا اور شرم ہمیں آرہی تھی۔ انجم سے دل میں اُس کے لیے نہایت کارآمیز اور کارانگیز جذبات تھے پھر بھی مقصود گھوڑے کے رومان کی رفتار غیر تسلی بخش تھی۔

انجم کے بارے میں خالد کی رائے کچھ اتنی اچھی نہیں تھی۔ اگر وہ با مذاق ہوتی تو صبح صبح کبھی کبھی ایوننگ اِن پیرس نہ لگاتی، کاہل بھی تھی۔ ایک مرتبہ خالد سے ایک انار کٹوایا، چھلوایا، دانے نکلوائے، نمک چھڑکوایا، پھر جمائی لے کر بولی "اب آپ ہی اسے کھا بھی ڈالیے۔"

خالد اور حشمی ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ حشمی کو خالد کے نظریوں سے نفرت تھی۔ خالد انھیں نظریوں کا فلسفہ سمجھاتے کہ فضا میں ہر قسم کی ریڈیائی لہریں ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ مسرور، غمگین، دہشت انگیز، صلح آموز۔ یہ اپنی پسند ہے کہ ریڈیو کو کس طرح ٹیون کیا جائے۔ لیکن حشمی صاحب سمجھنے سے انکار کر دیتے۔ خالد کہتے کہ اس شخص کو دیکھ دیکھ کر مجھے بنی نوع انسان سے نفرت ہوتی جا رہی ہے:

کبھی کبھی شیطان کو رضیہ کی یاد ستاتی۔

"رضیہ چار سال پہلے کتنی سیدھی سادی تھی" — وہ کہا کرتے۔

"اور ہم چار سال پہلے کتنے سیدھے سادے تھے"۔ میں کہا کرتا۔

وہ رقیب والا پروگرام بھی التوا میں پڑا ہوا تھا۔ اس کی وجہ مقصود گھوڑے کی بے قدری تھی۔ اُدھر اس کا ایم۔ اے والا مسئلہ اقوام متحدہ کے مسائل کی طرح ادھورا پڑا تھا۔

وہ جمود جو مقصود گھوڑے کی زندگی سے نکلا شیطان کی زندگی میں داخل ہو گیا۔

بعض اوقات لوگوں کو چاء پر بلایا جانا، اس تقریب پر کہ کوئی خاص بات نہیں ہوتی۔ اسی قسم کی ایک تقریب پر انجم اپنی چند سہیلیاں لے کر آئیں اُن میں سے ایک فارسی کی سکالر تھیں شیطان کو ایران سے خواہ مخواہ دلچسپی رہی ہے۔ چنانچہ وہ ان خاتون سے دلچسپی کا اظہار کرنے لگے۔ ویسے وہ خود بھی ہر لڑکی میں دلچسپی رہی تھی۔

"اس طرح آگے آگے مت چلیے۔ لوگ سمجھیں گے کہ میں آپ کی بیوی ہوں"

انجم نے کہا اور شیطان اُن کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

"تمہاری معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے ایک سوال کر سکتا ہوں"

"کیجیے"

"یہ فارسی زدہ لڑکی کون ہے؟"

"کسی کی منگیتر ہے"

"اسے فارسی میں کہہ دیجیے کہ یہ دوسری منگیتروں کے لیے بُری مثال قائم کر رہی ہے"

"یہ اکیلے اکیلے کیا باتیں ہو رہی ہیں؟" مقصود گھوڑا لپک کر آیا۔

"کچھ نہیں، انجم کل گھڑ دوڑ پر جانا چاہتی ہیں" شیطان بولے

"تو پھر؟"

"میں نے کہہ دیا ہے کہ یہیں دوڑ لیں گے"

مقصود گھوڑے نے موقع ملتے ہی اپنی مخصوص گفتگو شروع کر دی۔

"تم پان بہت کھاتی ہو۔ کہیں عادت نہ پڑ جائے"

"دس سال سے کھا رہی ہوں۔ اب تک تمہیں عادت نہیں پڑی۔"

"انگیٹھی پر جو تمہارا فوٹو رکھا ہے نہایت خوبصورت ہے۔ تمہاری شکل سے بالکل نہیں ملتا۔"

"اس کے بعد اُس نے منگنی کی انگوٹھی کا ذکر کیا۔ انجم جلدی سے بولی۔" مجھے منگنی کی انگوٹھی بالکل پسند نہیں۔ یہ ایام جہالت کی یادگار ہے۔ پرانے زمانے میں منگنی کے بعد لڑکی کی گردن میں لوہے کا طوق پہنا دیتے تھے۔ مہذب ہونے پر صرف ایک کلائی میں ہتھکڑی پڑنے لگی۔ پھر چوڑی آئی اور اخیر میں انگوٹھی۔"

"یہ پھول لو گی؟"

انجم نے پھول سونگھے، خوشبو نہیں تھی۔ پھینک دیئے۔ ذرا سی دیر میں وہ شیطان سے کہہ رہی تھی۔ "جیسے پھول آپ لاتے ہیں کوئی نہیں لاتا۔"

شیطان کی عادت تھی کہ رنگ برنگے ولائتی پھولوں کو حنا، نرگس وغیرہ کی خوشبو میں بسا کر انجم کو دیا کرتے، جو سونگھتا حیران رہ جاتا۔

"اور جیسے خط میں لکھا تھا ویسے کوئی لکھتا ہے؟"

شیطان کے محبت نامے اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نرالے ہوا کرتے۔ ایک مرتبہ انھوں نے ایک لڑکی کو صرف یہ لکھ کر بھیجا۔۔

؟

جواب آیا۔۔

ایک محبت نامے کے اختتام پہ انگوٹھا لگا دیا۔ دوسرے میں لعبدادرگواہ شد بھی شامل کیا۔

خالد بڑے زور شور سے کتوں کی نفسیات پر بحث کر رہے تھے۔ غالباً انھوں نے کوئی غیر معمولی کتا دیکھ لیا تھا۔

"آپ نے یہ علم کہاں سیکھا؟" فارسی زدہ خاتون نے خالد کے قریب آکر پوچھا۔

"مصر میں!"

"اہرام مصر کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے"۔۔۔ وہ اور بھی قریب آگئیں۔

"مصر میں اب اُن کی وہ وقعت نہیں رہی جو پہلے تھی۔ ایک دو مرتبہ پولیس نے گولی بھی چلائی۔ اس جماعت کو اب ختم ہی سمجھئے۔"

"وہاں یہ علم کس زبان میں سکھاتے ہیں؟"

"فارسی میں۔"

خالد سے کریما بہ بخشائے برحالِ ما والے شعر کا ترجمہ کرایا گیا جسے خالد نے یوں کیا۔ کریما یہ بخشا جو تھا وہ برحالِ ما تھا اور ہستم اسیرے جو ہے وہ کمندِ ہوا ہے۔

ہمیں علم تھا کہ خالد انگلستان جاتے وقت ہوائی جہاز سے گئے تھے۔ واپسی بھی ہوائی جہاز سے ہوئی۔ مشرقِ وسطیٰ کے متعلق ان کی معلومات اتنی ہی تھیں جتنی اُن خاتون

کی میکسیکو کے بارے میں۔

اتنے میں اطلاع ملی کہ مقصود گھوڑا امتحان میں فیل ہو گیا۔ آہستہ آہستہ دھند سی چھانے لگی۔ ہر شے میں اس خبر کی آمیزش ہوتی گئی۔ بڑا سہانا سماں تھا۔ خنک ہوائیں چل رہی تھیں خوشگوار فیل شدہ دھوپ میں رنگین پھولوں کی خوشبوئیں مچلنے لگیں۔ ہم دیر تک وہیں بیٹھے طرح طرح کی باتیں کرتے رہے۔ پھر ہم نے فیل شدہ جامنی اور فیل شدہ حسین غروبِ آفتاب دیکھ کر لوٹے۔

چشتی صاحب کو یقین ہو گیا کہ مقصود گھوڑا دیو جانس کلبی سے بھی زیادہ نکمّا ہے۔ خالد اور شیطان خود تو گمراہ ہو چکے ہیں دوسروں کو بھی بھٹکا رہے ہیں۔ چشتی اپنے بچّوں کو ایسے دہشت پسندوں سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور محفوظ رکھنے لگے۔

مجھے کچھ دنوں کے لئے باہر جانا پڑا۔ لوٹا تو عجیب خبر سننے میں آئی۔ مقصود گھوڑے نے حیرت انگیز کارنامہ دکھایا۔ شہر بھر میں مقصود گھوڑے کا نام مشہور ہو چکا تھا۔

شہر سے باہر ایک سُرخ سا پتھریلا ٹیلہ تھا جس کے چاروں طرف پانی تھا۔ مشہور تھا کہ کسی قدیم آبادی کا کھنڈر رہا ہے۔ مقصود گھوڑے نے اُسی ٹیلے کو کھدوا کر ایک تاریخی شہر کے آثار برآمد کئے تھے۔ کھدائی میں طرح طرح کی چیزیں نکلیں۔ مٹی کے برتن، ٹوٹے ہوئے مجسّمے، مٹکے، زنگ آلودہ ہتھیار، منکوں کے ہار، گھسے ہوئے سکّے۔ ماہرین کا خیال تھا کہ یہ شہر حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے پہلے آباد تھا اور ٹیکسلا کا ہمعصر تھا۔ اپنے وقت میں ایشیائی تہذیب و تمدّن کا گہوارہ رہ چکا تھا۔

اخباروں میں مضامین نکلنے لگے۔ نامہ نگار مقصود گھوڑے کو ہر وقت گھیرے رکھتے۔ مقصود گھوڑا جہاں جاتا اُنگلیاں اُٹھتیں۔ وہ دیکھو ملک کا مائیہ ناز سپوت جا رہا ہے جس نے ایک قدیم شہر دریافت کیا ہے۔ شیطان نے اصرار کیا کہ مقصود گھوڑے کا نام بھی کوئی ماڈرن قسم کا رکھا جائے، لوگ رات کو عبدالکریم اور قطب الدین سوتے ہیں اور صبح اے۔ کے غزنوی اور کیو۔ ڈی بجمی ہو کر اُٹھتے ہیں۔ چنانچہ مقصود گھوڑے کا نام ایم۔ جی۔ اسپی رکھ دیا گیا۔ ہر روز طرح طرح کے دعوت نامے آنے۔ حضرت ایم جی۔ اسپی مدظلہ، کو مشاعروں کا صدر بنایا جاتا۔ پبلک جلسوں میں اُن سے درخواست کی جاتی کہ قدیم تہذیب پر تقریر فرمائیں۔ ایم۔ جی۔ اسپی زندہ باد کے نعروں سے شہر گونجنے لگتا۔ اسپی سائیکل ورکس، اسپی گھی سٹور اور اسپی لانڈری کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ ان سے شفاخانہ حیوانات کی افتتاحی رسم ادا کرائی گئی۔ رسالوں میں اس قسم کے مضامین نکلنے لگے۔ اسپی بطور سیاح (از خالد) خالد بطور ادیب (از رونی) رونی بطور دوست (از خالد) رونی بطور دوست (از اسپی) — اسپی بطور دوست (از رونی) — رونی بطور سیاح (از اسپی) خالد بطور انسان (از رونی)

جیتمی صاحب کا رویہ بدل چکا تھا۔ مقصود گھوڑے کی کاریہ انجم کی توجہ بھر ہونے لگی۔ جیتمی اور خالد نے نئے سرے سے بحثیں شروع کر دیں۔ جیتمی قبل از مسیح زمانے کے مداح تھے۔ اُن کی رائے میں وہ لوگ بہت آگے نکل چکے تھے۔ اُڑن کھٹولے ہوائی جہازوں سے کسی طرح کم نہ تھے بلکہ کچھ اُونچے ہی اڑتے تھے۔ موجودہ زمانے کی ساری

ایجادوں کا ذکر پرانی کتابوں میں آچکا ہے۔ اُن دنوں نجات حاصل کرنے کا بہت اچھا رواج تھا۔ جو زندگی کی الجھنوں سے تنگ آجاتا اُسے حکومت کی طرف سے ساری سہولتیں بیسر ہوتیں کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نروان حاصل کرلے۔

یہ مباحثے اکثر ناخوشگوار کلمات پر ختم ہوتے۔ ایک روز تو ہم خالد کو بمشکل گھسیٹ کر لائے۔ کھدائی سے جو عجیب سے اوزار برآمد ہوتے تھے چشتی کا خیال تھا کہ وہ ادویات کشید کرنے کے آلے تھے۔ خالد کہتے تھے کہ وہ بھنگ گھونٹنے کے اوزار تھے۔ چشتی نے خالد سے کہا کہ برخوردار تم وقت سے بہت پہلے دنیا میں آگئے ہو۔ خالد بولے۔ قبلہ آپ اپنے وقت کے بہت بعد تشریف لائے ہیں، دراصل آپ کا تعلق قبل از مسیح کے زمانے سے ہے۔

اُن دونوں کی صلح کرانے کے لئے ایک پک نک کیا گیا۔ جس میں شکار کا پروگرام بھی تھا۔ شیطان سے دو تیتر ہلاک کئے۔ ایک بڑا سا پرندہ خالد کے سامنے سے گزرا اُنھوں نے توڑے دار بندوق سے نشانہ لیا اور داغ دی لیکن کچھ نہ ہُوا۔ بندوق نہیں چلی۔ اتنا بڑا پرندہ یوں سامنے سے نکل جانے پر سب کو افسوس ہوا، توڑے دار بندوق کے موجد کے متعلق نہایت غیر مہذب فقرے استعمال کئے گئے۔ کوئی دس منٹ گذرے ہوں گے کہ زبردست دھماکا ہُوا۔ خالد کے کندھے پر رکھی ہوئی توڑے دار بندوق خود بخود چل گئی۔ اُدھر چشتی صاحب جو پیچھے پیچھے آرہے تھے دھم سے گرے۔ سب سمجھے کہ بندوق نے اپنا کام کردیا۔ لیکن چشتی صاحب صرف بیہوش ہوئے تھے۔ ہوش میں

آنے پر معلوم ہوا کہ بالکل بہرے ہو چکے ہیں۔ دھماکا اُن کے کان کے قریب ہوا تھا۔

انجم نے مقصود گھوڑے سے شکار کے متعلق پوچھا تو اس نے انگلیوں پر گنوا کر کہا۔ ایک ہرن، دو تیتر اور ایک چشمی صاحب!

ڈاکٹروں نے بتایا کہ فی الحال اُن کی سماعت بیکار ہو چکی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ بہرا پن عارضی ہو۔

کھدائی میں کسی پُرانی زبان میں لکھے ہوئے کتبے بھی نکلے جن کا ترجمہ ایک پروفیسر سے کرایا گیا۔ ایک کتبے میں لوگوں کو نصیحت کی گئی تھی کہ پہلے خوب گناہ کریں۔ پھر پچاس برس کی عمر میں توبہ کر کے عبادت شروع کر دیں تاکہ دنیا سے بھی واقفیت ہو جائے اور دین سے بھی۔ اسی قسم کی بہت سی مفید باتیں شیطان نے اخبار میں چھپوائیں۔ پڑھنے والوں نے اشتیاق ظاہر کیا کہ کھدائی سے جو تختیاں اور کتبے برآمد ہوں اُن سب کا ترجمہ کرایا جائے۔ چنانچہ شیطان کا ایک اور ترجمہ چھپا جو کچھ یوں تھا:۔

اِس عجوبۂ روزگار شہر کی داغ بیل یونانیوں نے ڈالی اور اصلی باشندوں میں بہت جلد گھل مل گئے چنانچہ بہت جلد یونانیوں کا نام و نشان تک نہ رہا۔ اِس شہر کا ماضی نہایت شاندار تھا چنانچہ باشندوں کی نگاہیں ہمیشہ ماضی کی طرف رہتیں — ماضیٔ بعید کی طرف اور زیادہ سے زیادہ ماضیٔ قریب کی طرف۔ زندگی کی مشکلات سامنے آتیں تو وہ پُرانی روایتوں کے ذکر سے اُن کا مقابلہ کرتے۔ نئی آبادیوں پر کھنڈروں کو ترجیح دیتے، کھنڈروں کو دیکھ کر

پرانی باتیں یاد آنے لگتیں اور دل کو کمال درجے کا سکون حاصل ہوتا۔ باشندوں کو رنج والم سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ دن رات غمگین اور بیزار رہتے، سست الوجود تھے اس لیئے اپنی زندگی سے مطمئن تھے۔ چوبیس گھنٹوں میں پچیس گھنٹے سوئے رہتے۔ یہ نیند عجیب تھی، چل پھر رہے ہیں، باتیں کر رہے ہیں مگر خوابیدہ ہیں چونکہ جذباتی تھے اس لیئے دوسروں سے خواہ مخواہ کی توقعات رکھتے۔ انسانوں سے توقعات، غیر مرئی چیزوں سے توقعات کوئی اُن کے لیئے کچھ کردے۔ کوئی کہیں سے آکر کچھ دے جائے۔ جب کچھ نہ بن پڑتا تو مذہب پہ اُتر آتے۔ باشندوں کو دعاؤں پر اس قدر عقیدہ تھا کہ کام وام چھوڑ کر بس دعائیں مانگتے رہتے۔ بارش، آندھی، زندگی، موت، گھڑدوڑ، سٹا، ہر چیز کے لیئے مختلف دعائیں تھیں اور دل کھول کر مانگی جاتی تھیں۔

یہ مضمون چھپا تو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ حسینی صاحب نے تو بہت ہی پسند فرمایا اور مشورہ دیا کہ شیطان اپنی تحقیقات جاری رکھیں۔ مزید معلومات فراہم کر کے "ٹیکسلا سے پہلے" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھیں، بہت ممکن ہے کہ انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری مل جائے۔ مشورہ معقول تھا کچھ دنوں کے بعد اسی سلسلے میں ایک اور ترجمہ چھپوایا گیا جو یوں تھا:-

آب و ہوا:- خوش قسمتی سے پہاڑوں کی ترائی میں خوب بھنگ اُگتی تھی لہٰذا

ہوائیں بھنگ کے بخارات سے بوجھل ہوتیں۔ یہی وجہ تھی کہ باشندوں کے ساتھ خوب مستی و قلندری برستی تھی۔

فنونِ لطیفہ :۔ قوالیاں، مشاعرے، کبڈی اور دیگر فنونِ لطیفہ زوروں پر تھے۔

صنعت و حرفت :۔ باریک ٹس کی دھوتیاں، نازک صراحیاں، اعلیٰ درجے کے تہمد، دیدہ زیب چلمیں دساور کو بھیجی جاتیں تھیں۔

غذا :۔ باشندوں کی خوراک نہایت صحت بخش تھی۔ غذا کا جزو سرخ مرچیں اور بناسپتی گھی تھا۔ ان دونوں میں کبھی چاول یا سبزی کی آمیزش کر دیتے کبھی گوشت کی تہمت لگا دیتے۔ خوراک کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آدھ گھنٹے کے اندر اندر خمار چڑھنے لگتا اور نیند آجاتی۔ جب آنکھ کھلتی تو چیخیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا۔ ان ہی مرچوں اور گھی کا اثر سیاست پر تھا۔ ان ہی کا دخل شاعری اور ادب میں تھا۔ موسیقی میں بھی یہی کارفرما تھیں

لباس :۔ ایسا اعلیٰ اور موزوں تھا کہ اچھا بھلا انسان پہن لے تو الف لیلےٰ کا کردار معلوم ہونے لگے۔ لباس کی سب سے خصوصیت یہ تھی کہ موسم کے تغیر و تبدل سے ہرگز نہیں بچاتا تھا۔ ہر وقت کی دھوپ سے چہرہ سنولا جاتا، پیشانی پر بل پڑ جاتے۔ اگلی نسل میں یہ تبدیلیاں مستقل ہو جاتیں۔

تہذیب و تمدن :۔ باشندے بڑے مہذب تھے، ہر وقت باتیں کرتے رہتے گفتگو کرتے وقت دل و دماغ کے مابین سلسلۂ آمد و رفت منقطع ہو جاتا اور یہ

بنہ نہ رہنا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔جب باتیں کرچکتے تو پھر باتیں شروع کر دیتے

تمدن: تمدنی لحاظ سے تین طبقے مشہور تھے:

پہلا طبقہ:۔ یہ لوگ موقعے کے مطابق ہر چیز کے طرفدار بھی تھے اور مخالف بھی۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی کہ مخالفین کو برابر برابر چھڑوا دیا جائے۔ اپنی رائے گول مول الفاظ میں دیتے کہ کہیں کوئی خفا نہ ہو جائے۔ اس طبقے کو ابن الوقت مدرسۂ فکر بھی کہا جاتا۔

دوسرا طبقہ:۔ اس جماعت کے ممبر یا تو گھروں سے بھاگے ہوئے تھے یا وہ تھے جو مدرسے میں بار بار فیل ہوئے۔ یہ SUCKERS کچھ نہیں کرتے تھے۔ کسی نے ایک دن بھی ایمانداری سے کام نہیں کیا تھا۔ چونکہ خود زندگی کے ہر شعبے میں ناکامیاب رہے۔ اس لئے دنیا بھر کے دشمن تھے۔ یہ طبقہ ایسا نظام چاہتا تھا جس میں محنت مشقت دوسرے لوگ کریں اور آسائشیں ان کو میسر ہوں۔ ان کا خیال تھا کہ چند ملک ایسے بھی ہیں جہاں حالات ان کی توقعات کے مطابق ہیں۔ لیکن انھیں سیاحت کا شوق تھا نہ کبھی گھر سے باہر نہیں گئے تھے۔ ان کی معلومات سُنی سُنائی باتوں یا غیر ملکی پراپیگنڈے پر مبنی ہوتیں کئی مرتبہ ان سے کہا گیا کہ دنیا بھر میں کہیں ایسا معاشی نظام نہیں ہے جس میں محنت مشقت سے جی چرانے والوں کی کھپت ہو سکے۔ اگر کوئی ایسی جگہ آپ کو معلوم ہے تو آپ وہاں چلے کیوں نہیں جاتے؟ لیکن یہ جہاں تھے وہیں

ڈٹے رہے۔ یہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ۔ لوگوں کو بتلاتے کہ اگر انسان کوشش کرے تو پینتیس روپے کچھ آنے ماہوار میں زندگی گذار سکتا ہے لیکن خود دن بھر زہریلے مضامین لکھتے یا قہوہ خانوں میں بحثیں کرتے۔ ان کو کسی پُراسرار طریقے سے غیبی امداد ملتی تھی۔

باشندوں کی زبوں حالی کا ذکر کرتے وقت انھیں کبھی احساس تک نہ ہوتا تھا کہ دیہاتی دیہات میں رہتے ہیں، شہروں میں نہیں۔ کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ گاؤں میں جا کر کسی کی مدد کرتا، کسی ناخواندہ کو پڑھاتا، کوئی تعمیری کام کرتا اور کچھ نہیں تو اپنے آپ کو ہی سماج کا مفید رُکن بناتا۔ ان کا خیال تھا کہ سارا قصور دوسروں کا ہے وہ خود فقط تماشائی ہیں اور کسی غلط ملک میں آپھنسے ہیں۔

ان کا محبوب مشغلہ مردوں کی پگڑیاں اور عورتوں کے دوپٹے اُچھالنا تھا۔ ایک اُچھالتا دوسرا اٹھا کر چمپت ہو جاتا۔

اُمّ مذہب سے پہلے یہ مذہب کے پرستار تھے۔ بعد میں دہریئے بن گئے۔

تیسرا طبقہ :- ان کو فرسودہ اور ندامت پسند گردانا جاتا، اتنی لے دے ہوئی مگر ان حضرات نے اپنے نظریئے نہیں بدلے۔ ان کے خلاف سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ یہ ہمیشہ اُلٹا گنتے تھے مثلاً چار سو قبل از مسیح سے تین سو قبل از مسیح تک۔ یہ چاہتے تھے کہ سب لوگ حضرت آدم اور امّاں حوا کی طرح زندگی بسر کیا کریں، ہر نئی چیز سے انھیں نفرت تھی۔ ہر جدید نظریے کے یہ جانی دشمن

تھے۔

ان لوگوں کی دھوپ گھڑیاں تک سست تھیں۔ وہ چلتے ہوئے پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے رہتے اور دوسرے کے کندھے پر کمان رکھ کر تیر چلانا ان کا شغل تھا۔

معاشرتی ترقی :۔ متعدد شہر کھود کھود کر نکالے گئے۔ آخر ایک مرتبہ ایک عجیب شہر برآمد ہوا۔ جس کے متعلق ماہرینِ آثارِ جدیدہ نے اندازہ لگایا کہ یہ شہر بیسویں صدی عیسوی سے تعلق رکھے گا کھدائی میں سب سے نمایاں چیز کتابیں اور رسالے تھے۔ اسٹائلے گٹ اپ، شاندار تصویریں، دلآویز سرورق، پروفیسروں نے ترجمہ شروع کیا۔ اس ادب میں نہ جانے کیا ایسی بات تھی کہ جو ترجمہ شروع کرتا اس پر وحشت سوار ہونے لگتی۔ کمرہ بند کر کے دھاڑیں مار مار کر روتا اور آخیر میں خودکشی کر لیتا۔ یا کپڑے پھاڑ کر ویرانوں میں نکل جاتا۔ حکومت نے فوراً شہر پر مٹی ڈلوا کر دبوا دیا۔ ساتھ ہی احکامات جاری کرا دیئے کہ آئندہ کوئی شخص کوئی شہر کھود کر نہ نکالے۔

اس مضمون کو بھی سراہا گیا۔

چشتی صاحب کے بہرے ہو جانے سے حالات ایک حد تک بدل گئے۔ کنبے کو کچھ دنوں تشویش رہی۔ لیکن پھر صبر کر لیا گیا اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ ان سے سب کترانے لگے۔ انھیں طرح طرح کے ناموں سے یاد کیا جانے لگا۔ بہرۂ بے بہرہ بحرالکاہل۔ چونکہ دوسروں کی گفتگو کا اندازہ انھیں صرف ہونٹوں کی جنبش سے ہو سکتا تھا

اس لیئے لوگ اُن کے سامنے بیٹھ کر اس طرح ہونٹ ہلاتے کہ آواز بالکل نہ نکلتی۔ بچوں کو موسیقی کا شوق چرایا۔ ایک طبلہ بجا رہا ہے، دوسرا شہنائی، تیسرا ڈھول، ساتھ ساتھ چشمی صاحب پر فقرے کسے جا رہے ہیں۔ دوست نظر بچا کر مذاق اڑاتے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں ان کا ایک بھی دوست نہیں تھا۔ کسی کے دل میں اُن کی عزت تھی نہ محبت۔ اُن کی زندگی کے سارے راز لوگوں پر عیاں تھے۔ آج تک جو قابلِ اعتراض حرکتیں انھوں نے کی تھیں ان کا سب کو علم تھا اور جو حرکتیں وہ آئندہ کرنا چاہتے تھے اُن کا بھی۔ بیگم چشمی ان کے اندازِ گفتگو اور باتوں کے اتار چڑھاؤ کی نقلیں اتارتیں۔ اُنھیں کاہل، سُست اور کام چور کہتیں۔ جوانی میں بھی کبھی نہیں مسکرائے۔ جب دیکھو منہ بنا ہوا ہے اور لوگوں پر تنقید ہو رہی ہے۔ دن بھر انگڑائیاں اور جمائیاں لیتے رہتے ہیں۔ نہ جانے ابھی کتنی دیر تک یہ عذاب باقی ہے۔

خبروں کا چشمی صاحب کو بے حد شوق تھا۔ پہلے انجم سے فرمائش ہوتی کہ ریڈیو کی خبریں سُن کر کسی کاغذ پر لکھ کر بتا دیا کریں۔ لیکن خبروں کے بارے میں انجم کا نظریہ مختلف تھا کہ اگر کتا آدمی کو کاٹ لے تو خبر نہیں لیکن اگر آدمی کتے کو کاٹ کھائے تو خبر ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ساری خبریں سن کر وہ نفی میں سر ہلا دیتیں۔

شیطان کی ڈیوٹی لگی۔ وہ خبریں لکھتے ضرور مگر ان میں اصلاح کرتے جاتے ــ ہانگ کانگ سے خبر آئی ہے کہ دس ہزار چینیوں نے سارے چینی کے برتن توڑ ڈالے۔ یوگوسلاویہ کے صدر یوگا کی مشق کر رہے ہیں۔ بقرعید کے موقع پر قربانی کی کھالوں

کے لئے اپیل کرتے ہوئے قاضی قدرت اللہ صاحب نے اپنی پوستین اتار کر یتیم خانے میں دے دی۔ یونان سے خبر آئی ہے۔ کہ دوسو باشندے یونانی دواخانوں میں علاج کرانے آرہے ہیں۔

لیکن مقصود گھوڑا نہایت سعادت مند ثابت ہوا۔ وہ ہر روز چشتی صاحب کے ہاں جاتا۔ اُن کے پاس دیر تک بیٹھا رہتا۔ جب اُن کی برائیاں کی جاتیں اور اُس کی رائے لی جاتی تو ہو سکتا ہے اور پتہ نہیں کہہ کر خاموش ہو جاتا۔

مقصود گھوڑا اور انجم اکٹھے دیکھے جانے لگے۔ پھر یکلخت شیطان انجم سے بدگمان ہو گئے۔ مقصود گھوڑے کے رومالوں میں سُرخی لگی ہوئی ملی اور یہ سرخی لپ سٹک کی تھی۔ اُس کی میز پر ایوننگ ان پیرس کی شیشیاں نظر آنے لگیں۔ یہ خوشبو شیطان انجم کو دیا کرتے۔ شیطان نے مقصود گھوڑے کو رقیب ضرور بنا یا تھا۔ صرف اس لئے کہ جو کچھ ہو سب کے سامنے ہو۔ اس لئے نہیں کہ وہ چھُپ چھُپ کر ایسی حرکتیں شروع کر دے۔ مقصود گھوڑے نے ایک کامریڈ کو ڈبل کراس کیا تھا۔ دونوں کی خوب لڑائی ہوئی۔ شیطان نے انجم سے بھی نہایت غیر شاعرانہ باتیں کیں۔ انجم نے کہا کہ مقصود گھوڑا انہیں آزاد شاعری سکھایا کرتا ہے لیکن وہ نہ مانے۔ انجم خفا ہو گئی اور اس نے تصویروں کے نگیٹیو مانگے جو شیطان نے اتاری تھیں۔ شیطان بولے۔ نگیٹو لے لو، پوزیٹو بھی لے لو۔ کیمرہ بھی لا دوں گا۔ شاید اُس میں کچھ لگا رہ گیا ہو، تم میری زندگی میں یوں آئیں جیسے نخلستان میں چپکے سے اونٹ آجائے۔ میں تمہیں رضیہ سے بہتر سمجھتا تھا لیکن اب پتہ چلا ہے

کہ ساری لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں ۔۔۔ بالکل ایک سی ۔ فرق ہے تو اتنا کہ کچھ شلوار قمیض پہنتی ہیں اور باقی کی غرارے ۔ خیر مجھے افسوس نہیں، کچھ تمھیں تجربہ تو ہو گیا ۔ وہ کیا کہا ہے شیکسپیئر یا ٹینی سن نے کہ محبت کرکے بھاگ جانا محبت نہ کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے ۔ یہ لو یہ شیشی، یہ عطر ایوننگ ان پیرس سے بدرجہا بہتر ہے ۔ اسے آخری تحفہ سمجھو، اُن سہانے اور ناقابلِ فراموش لمحوں کی یاد میں جو ہم نے ایک دوسرے سے دور رہ کر گذارے ۔

آخر مقصود گھوڑے کی زندگی کا سب سے اہم دن طلوع ہوا ۔ چند مشہور غیر ملکی سیاح جو پہاڑوں کی مہم کے سلسلے میں قریب سے گزر رہے تھے، مدعو کئے گئے ۔ اُن کے ہمراہ غیر ملکی اخباروں کے نامہ نگار بھی تھے ۔

اب صرف چند ہی دنوں میں ساری دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ ایک نوجوان نے بعد قدیم شہر برآمد کیا ہے ۔ ایم ۔ جی ۔ اسی کا نام بچے بچے کی زبان پر ہوگا ۔ بین الاقوامی شہرت مقصود گھوڑے کا انتظار کر رہی تھی ۔

سیاحوں نے کچی اینٹوں سے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے مکانوں کو دیکھا، تنگ گلیوں کا ملاحظہ کیا، اینٹوں کی ساخت، طرزِ تعمیر اور قرب و جوار کا جائزہ لے کر بتایا کہ یہ شہر ایک زرخیز وادی میں آباد تھا اور ایک عظیم شاہراہ پر واقع تھا ۔ اس کی تباہی کی وجہ یا تو کوئی زلزلہ ہو سکتی ہے اور یا آتش فشاں پہاڑ کا لاوا ۔ ایک بہت بڑے ہجوم کے سامنے کھدائی شروع ہوئی ۔ ایک مٹکا نکلا، سیاحوں نے محدب شیشے سے اس کا معائنہ

کیا اور بولے کہ یہ برتن دو ہزار سال پُرانا ہے۔ اس کے اندر کوئی چیز ہل رہی تھی۔ مٹی نکالی گئی تو ایک عجیب و غریب شے نکلی۔ بلیک اینڈ وائٹ سگرٹوں کا ڈبہ۔ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر سکندر اعظم کے حملے سے پہلے کی ایک زنگ آلودہ صندوقچی برآمد ہوئی جس میں زنگ آلودہ قفل لگا ہوا تھا۔ قفل سکندر اعظم کے حملے سے پہلے کا نہیں تھا کیونکہ اس پر میڈ اِن جاپان لکھا ہوا تھا۔

اگلے روز ایک نامہ نگار نے (جو مقصود گھوڑے کا وفادار دوست تھا) اخبار میں غیر ملکی سیّاحوں کے اس رویّے کی مذمّت کرتے ہوئے لکھا کہ ان کا فرض تھا کہ مزید تحقیقات کرتے۔ ممکن ہے کہ اس زمانے میں بھی اس قسم کے سگرٹ ہوں۔ شاید جاپان اُن دنوں بھی تجارتی ملک ہو۔

بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ کچھ عرصہ پہلے شیطان کو کباڑی بازار میں اکثر دیکھا جاتا تھا اور انھوں نے مقصود گھوڑے کے مالی سے بہت سے پرانے برتن بھی خریدے تھے۔ شیطان نے ہمیں بتایا کہ ایسے قدیم شہر تو وہ ایشیا میں جگہ جگہ دریافت کر سکتے ہیں

"ہماری موجودہ زمانے کی آبادیوں سے برتن، گھڑے اور روزمرّہ استعمال کی کچھ چیزیں چھے کر زمین میں دبا دو، اور پھر کھود کھود کر نکالتے جاؤ۔ دوسرے ملکوں کے لوگ فوراً انہیں نوادرات میں شامل کر لیں گے، ویسے اجنبیوں کے لئے تو مشرق کا بسا بسایا شہر بھی آثارِ قدیمہ سے تعلّق رکھتا ہے۔"

پھر عجب تماشا ہوا۔ چچی صاحب کو کسی نے ریڈیو کے پاس بیٹھے دیکھ لیا۔ گت پرُان کا

شرمناک رہا تھا۔ پھر یہ بھی دیکھا کہ جب تقریر شروع ہوئی تو انھوں نے فوراً اسٹیشن بدل دیا اور فلمی ریکارڈ سننے لگے۔ اس خبر سے گھر بھر میں سنسنی پھیل گئی۔ اگلے روز بیگم حشمی نے جان بوجھ کر حشمی صاحب کے پیچھے جا کر چائے کی ٹرے فرش پہ پٹخ دی تو وہ اچھل پڑے۔ سب کو معلوم ہو گیا کہ ان کا عارضی بہرا پن کبھی کا دور ہو چکا تھا۔ انھوں نے ساری باتیں بھی سن لی تھیں۔

ہم شام کو ان کے ہاں گئے تو وہ کنبے سمیت چائے پی رہے تھے، خاموشی طاری تھی، معلوم ہوا وہ اپنا وصیت نامہ دوبارہ ایڈٹ کرنا چاہتے ہیں۔ بیگم نے اس سارے عمل پر احتجاج کیا اور حشمی صاحب کے لئے درازیٔ عمر کی دعا مانگی۔ لیکن انھوں نے بات کاٹ کر کہا کہ ایسی بددعائیں انھیں نہیں چاہئیں۔ اب ان کی آنکھیں کھل چکی ہیں سب کچھ روشن ہو گیا ہے یہاں تک کہ انھوں نے اپنی عینک بھی اتار کر پھینک دی ہے۔ اب وہ قدرتی نظاروں میں دلچسپی لیا کریں گے۔ صبح صبح آج پہلی مرتبہ انھوں نے طلوعِ آفتاب دیکھا۔ اس قدر مسرت ہوئی کہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ عنقریب وہ سب کچھ تج دیں گے۔

"میں اس ماحول اور ان لوگوں میں ہرگز نہیں رہنا چاہتا۔ میں حج کرنے چلا جاؤں گا"

ہم نے انھیں بتایا کہ حج میں تو ابھی بہت دن ہیں۔

"اگر دن ہیں تب بھی میں چلا جاؤں گا۔ کل میں یہاں سے جا رہا ہوں۔"

انھوں نے ہمیں بتایا کہ وہ مقصود گھوڑے سے بہت خوش ہیں دعا لیا تکیہ کلام

کے سلسلے میں) رخصت ہوتے وقت خالد اُن سے دیر تک مصافحہ کرتے رہے۔ اُن کا ہاتھ بڑی گرمجوشی سے دباتے رہے۔ ہم نے اس خاص رویّے کی وجہ پوچھی۔ خالد بولے ــــ "میں نے ہاتھ دبایا تو بہت زور سے تھا لیکن کمبخت انگوٹھی اتری ہی نہیں ــ"

اگلے روز ڈاک گاڑی پہ لوگ ہار لے کر پہنچے، معلوم ہوا حشمی صاحب اس سے پہلی پسنجر ٹرین سے جا چکے تھے۔

دفعتہً مقصود گھوڑے کو دورہ اٹھا۔ فوراً ایک سونے کی انگوٹھی خرید لایا۔ شام کو جب انجم کے کالج سے آنے کا وقت ہوا تو نکڑ پر انتظار کرنے لگا۔ کچھ بھی ہو اب انگوٹھی انجم کی انگلی میں ہوگی۔ حشمی صاحب کی یہ آخری خواہش تھی۔ عین جب انجم کی سائیکل کے آنے کا وقت ہوا تو کہیں سے موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ مقصود گھوڑا درختوں سے میدان کی طرف بھاگا۔ کتنی ہی دیر موٹر سائیکل آس پاس کہیں چکر لگاتی رہی اور مقصود گھوڑا بڑے انہماک سے آواز سنتا رہا۔ جب اُسے ہوش آیا تو دیر ہو چکی تھی۔ اب انجم کے گھر جانا بے سود تھا۔ اگلے روز پھر قسمت آزمائی کے لیے لوٹا تو ایک تار منتظر ملا۔ تار میں ماموں کی آمد کی خبر تھی۔ شیطان نے مشورہ دیا کہ فوراً تجوریاں کھول کر دیکھی جائیں اگر کچھ مل گیا تو کوئی غلط سلط خبر اڑا دی جائے گی۔ خالد نے خاص غیر ملکی نسخوں سے قفل کھولے۔ یکے بعد دیگرے ساری تجوریاں دیکھی گئیں۔ سب میں کارتوس رکھے تھے۔ ہر قسم اور ہر سائز کے کارتوس۔

اگلی صبح ماموں جان تشریف لے آئے۔ شام کو مقصود گھوڑا ہوسٹل کے کمرے میں

بیٹھا اپنے امتحان کی تیاری میں مشغول تھا۔ اس کی تنہائی اور اس کے رومان انگیز خیالات سب منتقل ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ وہ انگوٹھی بھی جوہری کے ہاں منتقل ہو چکی تھی۔

شیطان کے کمرے میں ہم سب رضائیاں اوڑھے کھانا کھا رہے تھے، خالد کہہ رہے تھے ۔۔ "آپ لوگوں کی زندگی میں میری وجہ سے جو خوشگوار یا دوسری تبدیلیاں آئیں یا جو ابھی آئیں گی، اُن کی مجھے ذرا بھی پروا نہیں، کیونکہ میں اب ایسی جگہ جا رہا ہوں جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آیا ۔۔ میں اب بزنس کرنے جا رہا ہوں! ہو سکتا ہے کہ توڑے دار بندوق کا ذیرہ میں چلنا محض اتفاقی نہیں تھا! ہو سکتا ہے کہ مقصود گھوڑے کے ماموں کو کسی نے بہانہ کر کے باہر بھیج دیا ہو اور پھر قصداً واپس بُلا لیا ہو۔ ممکن ہے کہ مقصود گھوڑے کے رومالوں کی سُرخی پان کی سُرخی ہو۔ کیونکہ انجم کی لپ سٹک تقریباً سیاہ رنگ کی ہوتی ہے۔ شاید وہ عطر کی شیشیاں خود مقصود گھوڑے نے خریدی ہوں، ہو سکتا ہے کہ عین وقت پر جو موٹر سائیکل آئی اس پر کوئی دانش مند بیٹھا تھا ۔۔ سب کچھ ہو بھی سکتا ہے، اور نہیں بھی ہو سکتا ۔۔ بہرحال اب میں عنقریب بزنس مین کہلاؤں گا۔ اب میرے سامنے ایک شاندار زندگی ہے۔ آج سے کچھ عرصے کے بعد اگر آپ کو سیکنڈ کے ڈبے میں شرعی کوٹ اور تہمد نما پتلون پہنے کوئی ایسا شخص نظر آئے جس کی شکل مجھ سے ملتی ہو جو سگرٹ کو حقّے کے انداز میں پکڑ کر کش لگاتا ہو اور چٹکی بجا کر راکھ جھاڑتا ہو، چائے کو طشتری میں ڈال کر شوں شڑپ کر کے پیتا ہو، بعد میں ڈکار لیتا ہو ۔۔ تو اس سے ضرور ملئے۔ شاید وہ میں ہی ہوں گا۔ اگر میں ہُوا تو میری شادی بھی ہو چکی ہوگی۔ میں آپ کو زبردستی اپنے گھر لے جاؤں گا۔ مرغیوں کے

شور اور بکری کی مَیں مَیں سے واضح ہو گا کہ میں سیٹیل ہو چکا ہوں۔ آپ ایک فربہ خاتون سے بھی ملیں گے جو کسی زمانے میں اپنے کالج کی حسین ترین چھریری لڑکی تھیں، فلاسفی، انگلش یا کسی اور مضمون کی ایم۔ اے تھیں۔ ہم آپ کو بڑی بڑی اچھی اچھی باتیں سنائیں گے۔ اپنے رشتہ داروں کی ذرا ذرا سی شکائتیں، مقامی سیاست، مارکٹ کا اتار چڑھاؤ، الیکشنوں کے قصے، اپنے بچوں کے حالات، یہ بچہ بیمار تھا۔ یہ بچہ دانت نکال رہا ہے اسے نیلہ تھوتھا عرق گاؤزبان میں ملا کر پلاتے ہیں۔ ہم غروبِ آفتاب کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے رہیں گے چاند نکلا تو سردی کے خیال سے اندر چلے جائیں گے۔ ریڈیو لگایا تو میاں کی ملہار پر بازار کے بھاؤ کو ترجیح دیں گے۔ اگر آپ نے ہماری زندگی پر رشک یا ترس کھایا تو آپ اپنا وقت ضائع کریں گے۔ اسی زندگی کے لئے میں جی رہا ہوں۔ اسی کے لئے آپ جی رہے ہیں ہم سب جی رہے ہیں۔ فقط مجھے رُوفی کے اس مقالے اور ڈگری کا انتظار رہے گا۔ رُوفی تم اسے حشمی صاحب کی زبانی لکھنا۔"

شیطان نے اٹھ کر چکنے ہاتھوں سے کاغذ کا ایک پلندہ نکالا — "چالیس صفحے کا یہ شاندار مقالہ "ٹیکسلا سے پہلے" میں نے بڑی محنت سے حشمی صاحب کی زبانی ہی لکھا تھا اسے ڈگری کے لئے بھیجوں گا ضرور۔ اور بھیجوں گا بھی بغیر کسی کانٹ چھانٹ کے —"

"لیکن وہ اس کا عنوان — ٹیکسلا سے پہلے —"

"اب اس کا عنوان — "ٹیکسلا کے بعد" ہو گا —"

# زنانہ اردو خط وکتابت

## شوہر کو

سرتاجِ من سلامت

کورنشات بجا لاکر عرض کرتی ہوں کہ منی آرڈر ملا۔ یہ پڑھ کر کہ طبیعت اچھی نہیں ہے از حد تشویش ہے۔ لکھنے کی بات تو نہیں مگر مجھے بھی تقریباً دو ماہ سے ہر رات بدخوابی ہوتی ہے۔ آپ کے متعلق بُرے بُرے خواب نظر آتے ہیں خدا خیر کرے صبح کو صدقے کی قربانی دے دی جاتی ہے۔ اس پہ کافی خرچ ہو رہا ہے۔

آپ نے پوچھا ہے کہ میں رات کو کیا کھاتی ہوں۔ بھلا اس کا تعلق خوابوں سے کیا ہو سکتا ہے۔ وہی معمولی کھانا۔ البتہ سوتے وقت ایک سیر کڑھا ہوا دودھ، کچھ خشک میوہ اور آپ کا ارسال کردہ سوہن حلوہ۔ حلوہ اگر زیادہ دیر رکھا رہا تو خراب ہو جائے گا۔

سب سے پہلے آپ کے بتلائے ہوئے ضروری کام کے متعلق لکھ دوں کہ کہیں باتوں میں یاد نہ رہے، آپ نے تاکید فرمائی ہے کہ میں فوراً بیگم فرید سے مل کر مکان کی خرید کے سلسلے میں ان کا آخری جواب آپ کو لکھ دوں۔ کل اُن سے ملی تھی۔ شام کو تیار ہوئی تو ڈرائیور غائب تھا۔ یہ غفور دن بدن سست ہوتا جا رہا ہے عمر کے ساتھ ساتھ اس کی بینائی بھی کمزور ہونے لگی ہے۔ اس مرتبہ آتے وقت اس کے لئے ایک اچھی سی عینک لیتے آئیں ــــ گھنٹوں کے بعد آیا تو بہانے تراشنے لگا کہ تین دن سے کار مرمّت کے لئے گئی ہوئی ہے۔ چاروں ٹائر بیکار ہو چکے ہیں۔ ٹیوب پہلے سے چھلنی ہیں۔ یہ کار بھی جواب دیتی جا رہی ہے آپ کے آنے پر نئی کار لیں گے۔ اگر آپ کو ضرورت ہو تو اس کار کو منگا لیں، خیر تانگہ منگایا، راستے میں ایک جلوس ملا۔ بڑا غل غپاڑہ مچا ہوا تھا ایک گھنٹے ٹریفک بند رہا۔ معلوم ہوا کہ خان بہادر رحیم خاں کے صاحبزادے کی برات جا رہی ہے۔ برات نہایت شاندار تھی۔ تین آدمی اور دو گھوڑے زخمی ہوئے۔

راستے میں زینب بُوا مل گئیں۔ یہ ہماری دور کی رشتہ دار ہوتی ہیں۔ احمد چچا کے سسرال میں جو ٹھیکیدار صاحب ہیں نا اُن کی سوتیلی ماں کی سگی بھتیجی ہیں۔ آپ ہمیشہ زینب بُوا اور رحمت بُوا کو ملا دیتے ہیں، رحمت بُوا میری ننھیال سے ہیں۔ ماموں عابد کے ہم زلف کے تائے کی نواسی ہیں۔ رحمت بُوا بھی ملی تھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ کبھی باجی قدسیہ کو ساتھ لا کر ہمارے ہاں چند مہینے رہ جائیں۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے

باجی قدسیہ بھی اپنے عزیزوں میں سے ہیں ۔ یہ وہی ہیں جو تایا نعیم کے ساتھ ہماری شادی پر آئی تھیں ۔ تایا نعیم کی ساس ان کی دادی کی منہ بولی بہن تھیں بلکہ ایک دوسرے سے دوپٹہ بدل چکی تھیں ۔ یہ سب اس لئے لکھ رہی ہوں کہ آپ کو اپنے عزیز و اقارب یاد نہیں رہتے کیا عرض کروں آج کل زمانہ ایسا آگیا ہے کہ رشتہ دار کو رشتہ دار کی خبر نہیں میں نے زینب بوا کو گھر آنے کے لئے کہا، وہ اسی شام آگئیں ۔ میں نے بڑی خاطر کی ۔ خواہش ظاہر کرنے پر آپ کے ارسال شدہ روپیوں میں سے دو سو انھیں ادھار دے دیئے ۔

ہاں تو میں بیگم فریدہ کے ہاں پہنچی، بڑے تپاک سے ملیں، بہت بدل چکی ہیں ۔ جوانی میں مسز فریدہ کہلاتی تھیں ۔ اب تو بالکل رہ گئی ہیں ۔ ایک تو بیچاری پہلے ہی اکہرے بدن کی ہیں اس پہ طرح طرح کے فکر، گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھتی ہیں ۔ کہنے لگیں اگلے ہفتے برخوردار نعیم کا عقیقہ ہے اس سے اگلی جمعرات کو نورچشمی بتول سلمہا کی رخصت ہو گی ضرور آنا ۔

میں نے حامی بھر لی اور مکان کے متعلق ان سے آخری جواب مانگا ۔ پہلے کی طرح چٹاخ پٹاخ باتیں نہیں کرتیں ۔ آواز میں بھی وہ کرارا پن نہیں رہا ۔ انھیں تو یہ بتول لے کر بیٹھ گئی ۔ عمر کا بھی تقاضا ہے ۔ سوچ رہی ہوں کہ جاؤں یا نہ جاؤں ۔ دو ڈھائی سو روپے خرچ ہو جائیں گے نیا جوڑا سلوانا ہو گا ۔ ویسے تو ان سردیوں کے لئے سادے کپڑے نئے بنوانے پڑیں گے ۔ پچھلے سال کے کپڑے اتنے تنگ ہو چکے ہیں کہ بالکل نہیں آتے ۔ آپ بار بار سیر اور ورزش کو کہتے ہیں بھلا اس عمر میں مستانوں کی طرح سیر کرتی ہوئی اچھی

لگوں گی۔ ورزش سے مجھے نفرت ہے۔ خواہ مخواہ جسم کو تھکانا اور پھر پسینہ، نہ آج تک کی ہے نہ خدا کرے۔ کبھی کبھی کار میں زنانہ کلب چلی جاتی ہوں، وہاں ہم سب بیٹھ کر نٹنگ کرتی ہیں۔ واپس آتے آتے اس قدر تکان ہو جاتی ہے کہ بس۔

آپ ہنسا کرتے ہیں کہ نٹنگ کرتے وقت عورتیں باتیں کیوں کرتی ہیں، اس لئے کہ کسی کام میں لگی رہیں۔

آپ نے جگہ جگہ خط میں شاعری کی ہے اور الٹی سیدھی باتیں لکھی ہیں۔ ذرا سوچ تو لیا ہوتا کہ بچوں والے گھر میں خط جا رہا ہے۔ اب ہمارے وہ دن نہیں رہے کہ عشق و شتق کی باتیں ایک دوسرے کو لکھیں، شادی کو پانچ برس گذر چکے ہیں، خدارا ایسی باتیں آئندہ مت لکھئے۔ توبہ توبہ اگر کوئی پڑھ لے تو کیا کہے۔

ان دنوں میں فرسٹ ایڈ سیکھنے نہیں جاتی۔ ٹریننگ کے بعد کلاس کا امتحان ہوا تھا آپ سن کر خوش ہوں گے کہ میں پاس ہو گئی۔

پچھلے ہفتے ایک عجیب واقعہ ہوا۔ بتو کے لڑکے کو بخار چڑھا یوں تپ رہا تھا کہ چنے رکھو اور بھون لو۔ میں نے تھرمامیٹر لگایا تو نارمل تھا۔ دوبارہ لگایا تو نارمل سے بھی نیچے چلا گیا۔ پتہ نہیں کیا وجہ تھی۔ پھر گھڑی لے کر نبض گننے لگی دفعتہً یوں محسوس ہوا جیسے لڑکے کا دل ٹھہر گیا ہو کیونکہ نبض رک گئی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ دراصل گھڑی بند ہو گئی تھی۔ یہ فرسٹ ایڈ بھی یونہی ہے خواہ مخواہ وقت ضائع کیا۔

ڈاکٹر میری سٹوپس کی کتاب ارسال ہے۔ اگر دکاندار واپس لے لے تو لوٹا دیجئے

یہ باتیں بھلا ہم مشرق کے رہنے والوں کے لئے تھوڑا ہی ہیں۔ اس کی جگہ بہشتی زیور کی ساری جلدیں بھجوا دیجئے۔ ایک کتاب "گھر کا حکیم" کی بڑی تعریف سُنی ہے۔ یہ بھی بھیج دیجئے۔

چند نئی فلمیں دیکھیں کافی پسند آئیں۔ ہیرو کا انتخاب بہت موزوں تھا۔ موٹا تازہ لمبے لمبے بال، کھوئی کھوئی نگاہیں، کھلے گلے کا کرتہ، گانے کا شوق، کسی کام کی بھی جلدی نہیں، فرصت ہی فرصت، آپ بہت یاد آتے۔ شادی سے پہلے میں آپ کو اسی رُوپ میں دیکھا کرتی تھی۔ کاش کہ آپ کے بھی لمبے لمبے بال ہوتے، ہر وقت کھوئی ہوئی نگاہوں سے خلا میں تکتے رہتے، کھلے گلے کا کرتہ پہن کر گلشن میں گانے گایا کرتے۔ نہ یہ کمبخت دفتر کا کام ہوتا اور نہ ہر وقت کی مصروفیت، لیکن خواب کب پورے ہوئے ہیں۔

ان فلموں میں ایک بات کھٹکتی ہے، ان میں عورتوں کی قوالی نہیں ہے فلم بناتے وقت نہ جانے ایسی اہم چیز کو کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ گیت بیحد معمولی ہیں۔ مثلاً ایک گانا بھی ایسا نہیں ہے جس میں راجہ جی، مورے راجہ یا ہو راجہ آنا ہو۔ یہ سادہ الفاظ گیت میں جان ڈال دیتے ہیں۔

ایک بہت ضروری بات آپ سے پوچھنا تھی۔ زینب بُوا نے شبہ سا ڈال دیا ہے کہ آپ کے لفافوں پر پتہ زنانہ تحریر میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کے دفتر میں کوئی سکریٹری یا سٹینو وغیرہ آگئی ہو اور آپ مصروفیت کی بنا پر پتہ اس سے لکھواتے ہوں۔ یہ لڑکی کس عمر کی ہے؟ شکل صورت میں کیسی ہے؟ غالباً کنواری ہو گی؟ اس کے

متعلق مفصل طور پر لکھئے، اگر ہو سکے تو اس کی تصویر بھی بھیجئے۔

باقی سب خیریت ہے اور کیا لکھوں، بس بچے ہر وقت آپ کو یاد کرتے ہیں۔ اصغر روز پوچھتا ہے کہ ابا میری سائیکل کب بھیجیں گے۔ آپ نے آسنے کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ اب تو ننھی کی بسم اللہ بھی قریب آ چکی ہے۔ میری مانئے تو واپس یہیں تبادلہ کرا لیجئے بھاڑ میں جائے یہ ترقی اور ایسا مستقبل۔ تھوڑی سی اور ترقی دے کر محکمے والے کہیں آپ کو اور دُور نہ بھیج دیں۔

آپ بہت یاد آتے ہیں۔ ننھے کی جرابیں پھٹ چکی ہیں۔ ننھی کے پاس ایک بھی نیا فراک نہیں رہا۔ بُرا ہو پردیس کا صورت دیکھنے کو ترس گئے ہیں۔ امی جان کی اونی چادر اور کمبلوں کا انتظار ہے۔

ہر وقت آپ کا انتظار رہتا ہے۔ آنکھیں دروازے پر لگی رہتی ہیں۔ صحن کا فرش جگہ جگہ سے اکھڑ رہا ہے مالی کام نہیں کرتا۔ اس کی لڑکی اپنے خاوند کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

آتے وقت چند چیزیں ساتھ لائیں۔ بچوں کے جوتے اور گرم کوٹ، ننھے کی جرابیں اور کنٹوپ، ننھی کا فراک، دو چمڑے کے صندوق، زینب بُوا کے لئے اچھا سا تحفہ، بلی کے گلے میں باندھنے کے لئے ربن اور کتے کا خوبصورت سا کالر، کچھ سوہن حلوہ اور ننھی کا سویٹر۔ ننھی کے کان میں پھنسی تھی۔ چچا جان سول سرجن بلانے کو کہتے تھے میں نے منع کر دیا۔ کیونکہ کل تعویذ آ جائے گا۔

یہاں کی تازہ خبریں یہ ہیں کہ پھوپھی جان کی بھینس اللہ کو پیاری ہوئی۔ سب کو بڑا افسوس ہوا۔ اچھی بھلی تھی دیکھتے دیکھتے دم توڑ دیا۔ میں پرسہ دینے گئی تھی۔ نانا عظیم کا لڑکا کہیں بھاگ گیا ہے۔ احمد چچا کا جس بینک میں حساب تھا وہ بینک فیل ہو گیا ہے اور ہاں پھوپھا جان کی ساس جو اکثر بہکی بہکی باتیں کیا کرتی تھیں اب بالکل باؤلی ہو گئی ہیں۔ بقیہ خبریں اگلے خط میں لکھوں گی۔

سرتاج کو کنیز کا آداب۔ فقط

(ایک بات بھول گئی۔ منی آرڈر پر مکان کا نمبر ضرور لکھا کیجئے۔ اس طرح ڈاک جلدی مل جاتی ہے)

## امّی جان کے نام

مری پیاری امّی مری جان امّی!

بعد ادائے آداب کے عرض یہ ہے کہ یہاں پر ہر طرح سے خیریت ہے اور خیر و عافیت آپ کی خداوند کریم سے نیک مطلوب ہوں۔ صورت احوال یہ ہے کہ یہاں سب خیریت سے ہیں۔ والا نامہ آپ کا صادر ہوا۔ دل کو از حد خوشی حاصل ہوئی۔ چچا جان کے خسر صاحب کے انتقال پُر ملال کی خبر سن کر دل کو از حد قلق ہوا۔ جب سے یہ خبر سنی ہے چچی جان زار زار رو رہی ہیں۔ خلیفہ جی یہ سنائونی لے کر پہنچے تو کسی

سے اتنا نہ ہوا کہ ان کی دعوت ہی کر دیتا۔ میں نے سوچا کہ اگر ذرا سی الکسی ہو گئی تو خاندان بھر میں تھُڑی تھُڑی ہو جائے گی۔ فوراً خادمہ کو لے کر باورچی خانہ میں پہنچی، اس نے جھپاک جھپاک آٹا گوندھا۔ لیکن سالن ذرا تیز آنچ پہ پک گئے۔ چنانچہ پھل پھلواری سے خلیفہ جی کی تواضع کی۔ بہت خوش ہوئے۔ تائی صاحبہ نے خوان بھجوا کہ حاتم کو شرمند کرنے کی کوشش کی، دوسرے روز ناشتہ پہ بھی بلوایا۔ اوچھے کے ہوئے تیتر باہر باندھوں کہ بھیتر۔ یہ تائی صاحبہ بھی ہمیشہ اسی طرح کرتی رہتی ہیں، رنگ میں بھنگ ڈال دیتی ہیں۔

الفت بیا آئی تھیں، تائی صاحبہ کا فرمانا ہے کہ یہ بچپن سے بہری ہیں۔ بہری دہری کچھ نہیں فقط وہ سننی نہیں ہیں۔ کیا مجال جو آگے سے کوئی ایک لفظ بولی جائے۔

گو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن آپ کے ارشاد کے مطابق ہم سب ممانی جان سے ملنے گئے۔ وہاں پہنچے تو سارا کنبہ کہیں گیا ہوا تھا۔ چنانچہ ہم چڑیا گھر دیکھنے چلے گئے ایک نیا جانور آیا ہے، زیبرا کہلاتا ہے۔ بالکل گدھے کا سپورٹس ماڈل معلوم ہوتا ہے اچھا ہی ہوا کہ دیکھ لیا ورنہ ممانی جان کی طعن آمیز گفتگو سننی پڑتی۔

پڑھائی خوب زوروں سے ہو رہی ہے۔ پچھلے ہفتے ہمارے کالج میں مس سید آئی تھیں جنھیں حال ہی میں ولایت سے کئی ڈگریاں ملی ہیں۔ بڑی قابل عورت ہیں۔ انھوں نے "مشرقی عورت اور پردہ" پہ لیکچر دیا۔ ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مس سید نے شنائل کا ہلکا گلابی جوڑا پہن رکھا تھا۔ قمیض پہ کلیوں کے سادہ نقش اچھے لگ رہے تھے۔

گلے میں گہرا سُرخ پھُول نہایت خوبصورتی سے ٹانکا گیا تھا۔ شیفون کے آبی دوپٹے کا کام مجھے بڑا پسند آیا۔ بیضوی بوٹے جوڑوں میں کاڑھے ہوئے تھے۔ ہر دوسری قطار کلیوں کی تھی ہر چوتھی قطار میں دو پھُول کے بعد ایک کلی کم ہو جاتی تھی۔ دوپٹے کا پلّو سادہ تھا لیکن بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ مس سیّد نے بھاری سینڈل کی جگہ لفٹی پہن رکھی تھی۔ کانوں میں ایک ایک نگ کے ہلکے پھلکے آویزے تھے۔ تراشیدہ بال بڑی اُستادی سے پرم کیئے ہوئے تھے۔ جب آئیں تو کوٹی کی خوشبو سے سب کچھ معطّر ہو گیا لیکن مجھے ان کی شکل پسند نہیں آئی۔ ایک آنکھ دوسری سے کچھ چھوٹی ہے۔ مسکراتی ہیں تو دانت بُرے معلوم ہوتے ہیں۔ بنتی بہت ہیں۔ ویسے بھی عمر رسیدہ ہیں۔ ہوں گی ہم لڑکیوں سے کم از کم پانچ سال بڑی۔ ان کا لیکچر نہایت مقبول ہُوا۔

آپ یہ سُن کر پھُولی نہ سمائیں گی کہ آپ کی پیاری بیٹی امورِ خانہ داری پر کتاب لکھ رہی ہے۔ مجھے بڑا غصہ آتا تھا جب لوگوں کو یہ کہتے سنتی تھی کہ پڑھی لکھی لڑکیاں گھر کا کام کاج نہیں کر سکتیں۔ چنانچہ میں نے یہ آزمودہ ترکیبیں لکھی ہیں جو ملک کے مشہور زنانہ رسالوں میں چھپیں گی۔ نمونے کے طور پر چند ترکیبیں نقل کرتی ہوں۔

## لذیذ آرنج سکواش تیار کرنا

آرنج سکواش کی بوتل لو، یہ دیکھ لو کہ بوتل آرنج سکواش ہی کی ہے کسی اور چیز کی تو نہیں ورنہ نتائج خاطر خواہ برآمد نہ ہوں گے۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ چھانوں

اور گلاسوں کی تعداد ایک ہونی چاہئے۔ گلاسوں کو پہلے صابن سے دھلوا لینا اشد ضروری ہے۔ بعد ازیں سکواش کو بڑی حفاظت سے گلاس میں انڈیلو اور پانی کی موزوں مقدار کا اضافہ کرو، مرکب کو چمچے سے تقریباً نصف منٹ ہلاؤ۔ نہایت رُوح افزا آرنج سکواش تیار ہو گا۔

موسم کے مطابق برف بھی استعمال کیا جا سکتا ہے (لیکن برف کو صابن سے دھلوا لینا نہایت ضروری ہے)

## انڈا اُبالنا—

یہ عمل اتنا آسان نہیں جتنا کہ لوگ سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر مشق ہو جائے تو ذرا مشکل نہیں لگتا۔ ایک انڈا لو (بہتر ہو گا کہ انڈا مرغی کا ہو) پیشتر اس کے کہ عمل شروع کیا جائے یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ انڈا خراب تو نہیں۔ اس کا سہل اور مجرب طریقہ یہ ہے کہ انڈے کو ایک کونے سے ذرا سا توڑ کر تسلی کر لی جائے۔ اب انڈے کو پانی میں ڈبو کر پانی اور انڈا دیگچی میں ڈالو۔ دیگچی کو چولھے پر رکھ کر گرم کرو اور ذرا ذرا سی دیر کے بعد پانی میں انگلی ڈال کر دیکھتے رہو کہ اُبال آنا شروع ہوا ہے یا نہیں۔ شوں شوں کی آواز پر آگ بجھا دو اور ہاتھ یا کسی اور چیز کی مدد سے جلدی سے انڈا دیگچی سے باہر نکال کر ٹھنڈا کر لو۔ اب انڈا بالکل تیار ہے اور کھایا جا سکتا ہے۔

## مزیدار فروٹ سلاد تیار کرنا

مہمانوں کے یکلخت آجانے پر ایک ملازم کو جلدی سے بازار بھیج کر کچھ بالائی اور ایک ٹین پھلوں کا منگاؤ اس کے آنے سے قبل ایک بڑی قاب کو صابن سے دھلوا لینا چاہئیے ورنہ بعض اوقات فروٹ سلاد میں اور طرح کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ اب ٹین کھولنے کا اوزار لے کر ٹین کا ڈھکنا کھولنا شروع کرو، اور خیال رکھو کہ کہیں انگلی نہ کٹنے پائے بہتر ہوگا کہ ٹین اور اوزار نوکر کو دے دو۔ اب پھلوں کو ڈبے سے نکال کر حفاظت سے قاب میں ڈالو اور بالائی کی ہلکی ہلکی تہہ جماؤ۔ نہایت مزیدار اور مفرح فروٹ سلاد تیار ہے۔ نوش جان کیجئے۔

## میز پوش سینا

جس میز کے لئے پوش درکار ہو اُس کا ناپ لو۔ بہتر ہوگا کہ کپڑے کو میز پر پھیلا کر لمبائی کے مطابق دہیں قینچی سے قطع کر لیا جائے۔ اب ہاتھ یا پاؤں سے چلنے والی سینے کی مشین منگاؤ۔ سوئی میں دھاگا پرو کر میز پوش کے ایک کونے سے سلائی شروع کرو اور سیتی چلی جاؤ۔ حتیٰ کہ وہی کونا آجائے۔ جہاں سے بخیہ شروع کیا تھا۔ اب میز پوش کو استعمال کے لئے تیار سمجھو، اگر سیتے وقت سارے کپڑے کے دو چکر لگ جائیں تو دُگنا پائیدار میز پوش تیار ہوگا۔ ضرورت کے مطابق بعد میں کسی سے بیل بوٹے کڑھوائے

جا سکتے ہیں۔

## اِستری پھیرنا

(نوٹ: استری بڑا پرانا لفظ ہے سنسکرت میں بار بار استری کا ذکر آتا ہے)
اپنے قد سے تقریباً دو فٹ نیچی میز منگا دو، اِستری میں دہکتے ہوئے کوئلے ڈالو، اور ہاتھ پھیر کر دیکھتی رہو کہ گرم ہو گئی ہے یا نہیں۔ جب ہاتھ پھیرنا مشکل ہو جائے تو سمجھ لو کہ استری تیار ہے اور پھیری جا سکتی ہے۔ اب استری کو کپڑے پر پھیرو۔ کپڑے کی تہہ درست کرنا نہ بھولنا چاہئے۔ ساتھ ساتھ پانی کے چھینٹے دیتی جاؤ (کپڑے پر) جب کپڑا بھورا ہونا شروع ہو جائے تو سمجھ لو کہ مکمل استری ہو گئی۔ دوسرا کپڑا پہلے استری شدہ کپڑے پر پھیلا کر یہ عمل دہرایا جا سکتا ہے۔ جب ایک جانی پہچانی بھینی بھینی خوشبو کمرے میں پھیلنے لگے تو استری کرنا کلینت بند کر دو۔

## کپڑے ڈرائی کلین کرنا

مناسب کپڑے چن کر ایک سمجھ دار ملازم کے ہاتھ ڈرائی کلین کی دکان پر بھجوا دو۔ بھیجنے سے پہلے ایک فہرست ضرور تیار کر لو۔ بہتر ہو گا کہ صرف وہی کپڑے بھیجو جنھیں بعد میں پہچان سکو۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کپڑے واقعی ڈرائی کلین کئے گئے ہیں ایک بڑی آزمودہ ترکیب ہے کپڑوں کو سونگھ کر دیکھو، اگر پٹرول کی بو آ رہی ہو تو سمجھ لو ٹھیک ہے اب کپڑے ڈرائی کلین ہو چکے ہیں اور انھیں فوراً استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔

سچ بتانا اچھی امّی جان! آپ کو یہ ترکیبیں پسند آئیں؟ ایسے اور بہت سے نسخے بھی میرے پاس محفوظ ہیں جنھیں اگلے خط میں بھیجوں گی۔

میں علی الصبح اُٹھتی ہوں۔ آپ کا ارسال شدہ ٹائم پیس اتنے زور سے بجتا ہے کہ رات کو اُسے رضائی میں لپیٹ کر ایک کونے میں رکھنا پڑتا ہے۔ عید پہ جو خالہ جان نے مٹاپے کا طعنہ دیا تھا۔ اس کے لیے بڑی کوشش کر رہی ہوں۔ فالتو چیزوں کا استعمال آہستہ آہستہ بند کر رہی ہوں، نشاستے سے پرہیز کرتی ہوں۔ کپڑوں تک میں سٹارچ نہیں لگنے دیتی۔

ایک خوشخبری دینا تو بھول ہی گئی۔ آپ کی پیاری بیٹی اس سال فارسی میں کالج میں دوئم آئی ہے۔ یہ سب آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے ورنہ لونڈی کس لائق ہے۔ یہ آپ سے کس نے کہا کہ میں کلاس میں دیر سے پہنچتی تھی۔ پہلا گھنٹہ فارسی کا ہوتا تھا اور فارسی میں صرف دو لڑکیاں تھیں مجمہ اور میں۔ شاید یہ اطلاع میری سہیلیوں میں سے نہیں بلکہ رشتہ داروں میں سے کسی نے پہنچائی ہوگی۔

اب خط ختم کرتی ہوں، میری طرف سے بزرگوں کی خدمت میں آداب۔ بچوں کو بہت بہت پیار۔ ہم عمروں کو سلام علیک۔

دیکھئے وہ کونسا مبارک دن ہوتا ہے کہ میں اپنی امّی کو جھک کر آداب کروں۔ اور امّی جان مجھے کلیجے سے لگالیں اور سدا لگائے رکھیں۔ آمین ثم آمین! فقط

ناچیز، آپ کی بیٹی

# منگیتر کو

جناب بھائی صاحب!

آپ کا خط ملا، میں آپ کو ہرگز خط نہ لکھتی لیکن پھر خیال آیا کہ آپ کی بہن میری سہیلی ہیں اور کہیں وہ بُرا نہ مان جائیں۔ وہم وگمان میں بھی نہ آسکتا تھا کہ کبھی ایک غیر مرد کو خط بھیجوں گی۔

امید کرتی ہوں کہ آئندہ خط لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھیں گے کہ آپ ایک شریف گھرانے کی ایشیائی لڑکی سے مخاطب ہیں ــ احتیاطاً تحریر ہے۔ میرا آپ کو خط لکھنا اس امر کا شاہد ہے کہ ہم لوگ کس قدر وسیع خیالات کے ہیں۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ رشیدہ اور حمیدہ کو جانتے ہیں۔ کلثوم اور رفعت سے بھی واقفیت رہ چکی ہے۔ ثریا اور اختر کو خط لکھا کرتے تھے۔ آپ کو کلب میں ناچتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے اور ایک شام کو آپ چمکیلی سی پیلے رنگ کی چیز چھوٹے سے گلاس میں پی رہے تھے اور خوب قہقہے لگا رہے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم ماڈرن نہیں ہیں۔ ہمیں یہ ہوا نہیں لگی۔ نہ اس روش پر چلنے کا ارادہ ہے۔ ہمارے ہاں جہاں مذہب، شرافت اور خاندانی روایات کا خیال ملحوظ ہے وہاں اعلیٰ تربیت اور بلند خیالی بھی ہے۔

میں بی۔ اے (آنرز) میں پڑھتی ہوں۔ شام کو مولوی صاحب بھی پڑھانے آتے ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ آپ نے مجھے تانگے میں کالج سے نکلتے دیکھا تھا اور میں نے برقعے کا نقاب اُلٹ رکھا تھا۔ آپ نے کسی اور کو دیکھ لیا ہوگا۔ اوّل تو میں ہمیشہ کالج کار میں جاتی ہوں دوسرے یہ کہ میں نقاب نہیں الٹا کرتی۔ ہمیشہ برقعہ میرے ہاتھ میں کتابوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

جی ہاں مجھے ٹھوس مطالعہ کا شوق ہے۔ ابا جان کی لائبریری میں فرائیڈ۔ مارکس اینڈ گرینلیس، ڈکنز، آگا تھا کرسٹی، کارلائل، پیٹر چینی، تھورن سمتھ اور دیگر مشہور مفکروں کی کتابیں موجود ہیں۔ میں نے سائیکالوجی پڑھنی شروع کی تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ سب کچھ تو مجھے پہلے سے معلوم ہے۔ فلاسفی پڑھی تو محسوس ہُوا جیسے یہ سب درست ہے، سوشل سائنس پڑھی تو لگا کہ واقعی یُونہی ہونا چاہیئے تھا۔ آخر ہمیں ایک نہ ایک روز تو جدید تہذیب کے دائرے میں آنا تھا۔ زمانے کو بیسویں صدی تک بھی تو پہنچنا ہی تھا۔ میرے خیال میں میں کافی مطالعہ کر چکی ہوں چنانچہ آج کل زیادہ نہیں پڑھتی۔

آپ نے پوچھا ہے کہ موجودہ ادیبوں میں مجھے کون کون پسند ہیں۔ سو ڈپٹی نذیر احمد مولانا راشد الخیری اور پنڈت رتن ناتھ سرشار میرے محبوب مصنفین ہیں۔ شاعروں میں نظیر اکبر آبادی مرغوب ہیں۔ خواتین میں ایک صاحبہ بہت پسند ہیں انھوں نے صرف دو ناول لکھے ہیں۔ ان میں جدید اور قدیم زیورات و پارچہ جات، بیاہ شادی کی ساری رسوم اور طرح طرح کے کھانوں کے ذکر کو اس خوبصورتی سے سمو دیا ہے کہ یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ ناول کہاں ہے اور یہ چیزیں کہاں ؟

ایک اور خاتون ہیں جو باوجود ماڈرن ہونے کے ترقی پسند نہیں ہیں۔ ان کے افسانے، ان کی امنگیں، ان کی دُنیا سب کچھ صرف اپنے گھر کی فضا اور اپنے خاوند تک محدود ہے۔ مبارک ہیں ایسی ہستیاں، ان کی تصویریں دیکھ دیکھ کر ان سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ پھر پتہ چلا کہ ان کا رنگ مشکی ہے اور عینک لگاتی ہیں۔

آپ کی جن کزن کا کہنا ہے کہ انھوں نے مجھے کلب میں دیکھا تھا ذرا ان سے پوچھئے کہ وہ خود وہاں کیا کر رہی تھیں۔

یہ جن حمید صاحب کا آپ نے ذکر کیا ہے وہی تو نہیں جو گورے سے ہیں۔ جن کے بال گھنگھریالے ہیں اور داہنے ابرو پر چھوٹا سا تل ہے۔ گاتے اچھا ہیں۔ روٹھتے بہت جلد ہیں۔ جی نہیں، میں انھیں نہیں جانتی۔ نہ کبھی اُن سے ملی ہوں۔

میری حقیر رائے میں تو آپ نے آرٹس پڑھ کر بڑا وقت ضایع کیا ہے۔ آپ کی بہن نے لکھا ہے کہ اب آپ کا ارادہ بزنس کرنے کا ہے۔ اگر یہی ارادہ تھا تو پھر پڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔ عمر میں گنجائش ہو تو ضرور کسی مقابلے کے امتحان میں بیٹھ جایئے اور ملازمت کی کوشش کیجئے۔ کیونکہ ملازمت ہر صورت میں بہتر ہے۔ اس کے بغیر نہ پوزیشن ہے نہ مستقبل۔ یہاں ڈپٹی کمشنر صاحب کی بیوی ساری زنانہ انجمنوں کی سکریٹری ہیں اور تقریباً ہر زنانے جلسے کی صدارت وہی کرتی ہیں۔ دوسرا فائدہ ملازمت کا یہ ہے کہ انگلستان یا امریکہ جانے کے بڑے موقعے ملتے ہیں۔ مجھے یہ دونوں ملک دیکھنے کا از حد شوق ہے۔

آپ نے موسیقی کا ذکر کیا ہے اور مختلف راگ راگنیوں کے متعلق میری رائے

پوچھی ہے۔ جی ہاں مجھے بھی تھوڑا بہت شوق ہے۔ بجے بجے ونتی سے آپ کو زیادہ دلچسپی نہیں ـــ آپ کو تعجب ہوگا کہ جب دلی سے بھٹنڈہ آتے وقت میں نے بججے ونتی ریکوسٹیشن کو دیکھا تو مجھے بھی پسند نہیں آیا۔ میاں کی ملہار سے آپ کی مراد غالباً خاوند کی ملہار ہے۔ جی نہیں میں نے یہ نہیں سنی۔ ویسے ایک خاندان کے افراد بھی میاں کہلاتے ہیں شاید یہ ملہار ان کی ہو۔ آپ کا فرمانا ہے کہ ٹوڈی صبح کی چیز ہے لیکن میں نے لوگوں کو صبح وشام ہر وقت ٹوڈی بچہ ہائے ہائے کے نعرے لگاتے سُنا ہے۔

بھوپالی کے متعلق میں زیادہ عرض نہیں کر سکتی کیونکہ مجھے بھوپال جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ البتہ جوگ اور بہاگ کے بارے میں اتنا جانتی ہوں کہ جب یہ ملتے ہیں تو سوزِ عشق جاگ اٹھتا ہے (ملاحظہ ہو "جاگ سوزِ عشق جاگ")

جی ہاں مجھے فنونِ لطیفہ سے بھی دلچسپی ہے۔ مصوری، بُت تراشی، موسیقی، فوٹوگرافی اور کروشئے کی بہت سی کتابیں اباجان کی لائبریری میں رکھی ہیں۔ میں اچھی فلمیں کبھی نہیں چھوڑتی۔ ریڈیو پر اچھا موسیقی کا پروگرام ہو تو ضرور سنتی ہوں خصوصاً دوپہر کے کھانے پر۔ سیاسیات پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس کے متعلق اپنی رائے اگلے خط میں لکھوں گی۔

آپ کو میری سہیلی کے بھائی نے میرے متعلق باتیں بتائی ہیں، ہاں یہ درست ہے کہ اسحٰق بھائی ہمارے ہاں آتے ہیں لیکن بس پندرہ بیس منٹ کے لیئے۔ اشفاق بھائی اور انور بھائی ہمارے ساتھ پہاڑ پر ضرور گئے تھے لیکن ان کی کوٹھی ہم سے ایک میل

دور تھی، پہاڑ کے دوسری طرف۔ لطیف بھائی اور کلیم بھائی فقط اپنی بہنوں کو چھوڑنے آتے ہیں۔ یہ غلط ہے کہ میں نے عفت کے بھائی کے ساتھ سفر کیا تھا۔ رحیم بھائی یونہی سٹیشن پر مل گئے تھے۔ میں چھٹیوں پر گھر آ رہی تھی، انھیں کوئی کام تھا۔ وہ اپنے ڈبے میں بیٹھے رہے میں اپنے ڈبے میں۔ آپ جمیل بھائی اور مسعود بھائی سے پوچھ سکتے ہیں۔

آپ کی بہن مجھ سے خفا ہیں اور خط نہیں لکھتیں۔ شکایت تو اُلٹی مجھے ان سے ہونی چاہیے۔ انھوں نے رفّی کو وہ بات بتا دی جو میں نے انھیں بتائی تھی کہ اُسے نہ بتانا۔ خیر بتانے میں تو اتنا حرج نہ تھا لیکن میں نے ان سے تاکیداً کہا تھا کہ اس سے یہ نہ کہنا کہ میں نے ان سے کہا تھا کہ اس سے نہ کہنا۔

پتہ نہیں یہ کزن والی کون سی بات ہے جس پر انھوں نے مجھ سے قسم لی تھی کہ رفّی تک نہ پہنچے۔ مجھے تو یاد نہیں۔ ویسے میری عادت نہیں کہ دانستہ طور پر کوئی بات کسی کو بتاؤں۔ اگر بھولے میں منہ سے نکل جائے تو اور بات ہے۔

خط گھر کی بجائے کالج کے پتے پر بھیجا کیجیے اور اپنے نام کی جگہ کوئی فرضی زنانہ نام لکھا کیجیے، یوں معلوم ہو جیسے کوئی سہیلی مجھے خط لکھ رہی ہے۔

باقی سب خیریت ہے۔ فقط

آپ کی بہن کی سہیلی

(اور اس خط کا کسی سے بھی ذکر مت کیجیے۔ تاکیداً عرض ہے)

# سہیلی کو

پیاری سہیلی بہنیلی۔

اُوئی دل پتھر کر لیا ہے، ایسا بھی کیا۔ کبھی خیر سلاّ کے دو لفظ ہی بھیج دیا کرو، وہی معاملہ ہُوا کہ آنکھیں ہوئیں اوٹ تو دل میں آیا کھوٹ۔

شاید تمھیں پتہ نہیں کہ میں پہاڑ پر گئی ہوئی تھی۔ بُوا میرا تو وہاں بالکل دل نہیں لگا لوگ قدرتی نظارے قدرتی نظارے کی رٹ لگاتے ہیں میرا تو جی ہفتے میں اچاٹ ہوگیا۔ نہ کوئی ڈھنگ کا سینما ہال، نہ اللہ ماری کوئی کام کی کپڑوں یا زیوروں کی دکان۔ دو مہینے میں صرف آٹھ جوڑے سلوا سکی۔ اور صرف ایک جوڑی سونے کے آویزے پسند آئے۔ اس آنے جانے میں نگوڑا نیا گرم کوٹ بھی نہ سل سکا۔ اب سردیوں میں وہی پچھلے سال بنوایا ہُوا کوٹ پہننا پڑے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ ساری گرمیوں میں ایک بھی نئے ڈیزائن کا جوڑا نہیں سلوا سکی۔ کسی نئی فلم میں ہیروئن کے کپڑے دیکھوں تو کچھ بنواؤں بھی۔

ایک بات بتاتی ہوں مگر وعدہ کرو کہ کسی سے نہیں کہو گی۔ کیونکہ نکلی ہونٹوں چڑھی کوٹھوں۔ وہ جو رشید ہے نا۔ اب تم مجھے چھیڑو گی، اسے ہٹو۔ پہلے سُن بھی لو، اس کے چچا کالج میں پروفیسر بن کر آئے ہیں۔ ہوں گے کوئی پینتالیس چھیالیس برس کے، میں اگلی سیٹ پر بیٹھتی ہوں، چنانچہ حضرت کو غلط فہمی ہوگئی۔ حالانکہ میں نے اِتّی سی بھی

لفٹ نہیں دی۔ سوائے اس کے کہ میں غور سے ان کی آنکھوں کو دیکھا کرتی تھی (آنکھیں اچھی ہیں) پروفیسروں کو کون غور سے نہیں دیکھتا۔ کبھی کبھار ان سے علیحدگی میں سوال پوچھ لیئے تو کیا ہوا۔ کُل تین یا چار مرتبہ اُن کے ساتھ چائے پی، وہ بھی ان کے بلانے پر۔ عید پر انھوں نے چھوٹے موٹے تحفے دیئے جو ان کا دل رکھنے کے لئے قبول کرنے پڑے۔ صرف ایک دو دفعہ ان کے ساتھ پکچر دیکھی۔ بس کیا تھا شاعری پر اُتر آئے۔ کہنے لگے۔ تم اب تک کہاں تھیں۔ میری زندگی میں پہلے کیوں نہ آئیں۔ حالانکہ ان کی زندگی کے شروع کے حصّے میں تو میں پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ شکل صورت معمولی ہے، گنجے بھی ہیں۔ سُنا ہے، کئیوں سے وعدہ خلافی کر چکے ہیں۔ پانچ چھ سال کے بعد بڑے بوڑھوں میں کہلائیں گے۔ تعجب ہے کہ اس عمر میں بھلا کوئی کیا وعدہ کر سکتا ہے۔

ناہید نے تو سب کے سامنے ان کی خبر لی، انھیں جھوٹا، ہٹ دھرم، مکّار اور نہ جانے کیا کیا کہا۔ ان پر کوئی اثر نہ ہوا، بعد میں معلوم ہوا کہ خیر سے ہاکی فٹ بال کے ریفری بھی ہیں اور اس قسم کے کلمات کے عادی ہو چکے ہیں۔ دراصل ناہید بندی نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ، کھٹ سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بالکل بلا سوچے سمجھے، جیسے کہ بعض لڑکیاں اکثر کرتی ہیں۔

ایک شام کو ان کے مجبور کرنے پر ان کے ساتھ سینما گئی۔ وہاں رشید اگلے درجے میں بیٹھا ہوا تھا۔ نہ جانے چچا کو کیا سوجھا کہ بھتیجے کو بُلا کر پاس بٹھا لیا اور مجھ سے اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ رشید کو خواہ مخواہ آگ لگ گئی۔ رشید کے چچا کی اس

حرکت پر مجھے سخت غصّہ آیا۔ انھوں نے نہ صرف میرا مستقبل کا پروگرام تباہ کر دیا بلکہ ایسی اچھی شام برباد کر کے رکھ دی۔ آج کل رشید کی مجھ سے لڑائی ہے۔ کل میں نے فون کیا تو طعنے دینے لگا۔ بولا تم بے حد خطرناک ہو۔ عجب اُلٹی منطق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی عورت بھی خطرناک نہیں ہوتی۔ یہ مرد ہی ہے جو کمزور ہوتا ہے۔ دونوں جائیں بھاڑ میں۔ سُنا ہے رشید زیبو کے پیچھے لگا ہوا ہے اور اس کا چچا سلّی کے پیچھے۔

زیبو تو تمھاری ہم جماعت تھی۔ بیچاری بڑی بنتی ہے۔ میں تو اُسے تب سے جانتی ہوں جب اس کے متعلق کوئی چھوٹی سی افواہ تک نہیں اڑتی تھی۔ پتہ نہیں کس بات پہ اتراتی ہے۔ اُجڑا اُجڑا حلیہ، دبلی پتلی اتنی کہ اچھی طرح دیکھنے کے لئے دوبار دیکھنا پڑتا ہے۔ پچھلے سال کسی سیکنڈ لفٹننٹ سے واقفیت تھی۔ اس سال بھی سنا ہے کسی اور سیکنڈ لفٹننٹ کے ساتھ سیکنڈل رہا۔ بار بار اسے سیکنڈ لفٹننٹ ہی ملتا ہے پہلا لفٹننٹ بھاگ جاتا ہوگا۔ کیا بتاؤں ان دنوں اتنی بدل چکی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی۔ پچھلے ہفتے ایک پارٹی پہ ملاقات ہوئی۔ میں نے نئے بندے اور نیا ہار پہن رکھا تھا۔ پھوٹے مُنہ سے ان کے بارے میں ایک لفظ نہ نکلا۔ حالانکہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ اِدھر میں کئی مرتبہ جھوٹ موٹ اس کی چیزوں کی تعریف کر چکی ہوں۔ ملمّع کی ہوئی چوڑیوں کو بار بار بجاتی تھی۔ ایسی اکل کھری ندیدی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ سنا ہے رشید اسے خوابوں کی ملکہ کہتا ہے۔ ضرور خوابوں میں ڈرتا ہوگا۔

ستی غریب بائیس برس کی ہو چکی ہے اور اب تک کوئی نہیں ملا۔ میں نے تو کئی مرتبہ کہا کہ گزٹ پڑھا کرو۔ آج کل ترقی ملنے پر ادھیڑ عمر کے لوگ اکثر نئی شادی کر بیٹھتے ہیں۔ ایسے کئی مل جائیں گے۔

سُنا ہے اس کے لئے سچ مچ ایک رشتہ آیا تھا۔ کسی بڑے زمیندار کا جس کے پاس دو درجن گائیں بھینسیں تھیں اور جو وہسکی میں دودھ ملا کر پیا کرتا تھا۔ پھر جہیز کے معاملے میں کچھ گڑبڑ ہو گئی۔

ان صاحبزادی کو بھی پَر لگ رہے ہیں۔ کیا تو جیسے زبان تھی ہی نہیں، کیا اب کُتر کُتر چلتی ہے۔ شرماتی ہیں۔ میں تو سُرخی اس لئے لگاتی ہوں کہ اور لڑکیوں میں نمایاں معلوم نہ ہوں۔ ایک اور فقرہ ملاحظہ ہو، کہتی ہیں —— موا دل کیا ہے برف کا تودا ہے، اتنی جلدی پگھل جاتا ہے۔ یہ سب رشید کے چچا کا اثر ہے۔ مجھے ان پروفیسر صاحب پر غصہ ہے تو اس بات کا کہ ساری خرافات مجھ ہی کو سناتے رہے۔ ابا جان سے کچھ بھی نہیں کہا جیسے کہ خاندانی لوگوں میں دستور ہے، گنجے ہیں تو کیا ہُوا۔ مرد اکثر گنجے ہو جاتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ان کی عمر زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر آنکھوں کی طرف دیکھتے رہو تو صرف چالیس برس کے لگتے ہیں۔ خیر دفع کرو ان سب کو۔

بلّو کی منگنی ہونے والی ہے۔ میں نے چھیڑا کہ بلّو کا منگیتر پبلشر ہے اس لئے انگوٹھی پر "جملہ حقوق محفوظ ہیں" ضرور کھدوائیں۔

عفّو کی بات پکّی ہو گئی ہے، نہیں اُس نے منگیتر کو نہیں دیکھا۔ لیکن سنو گی۔ تو خوش ہو گی کہ چھ سو روپیہ ماہوار پاتا ہے۔ اکلوتا ہے، بہن بھائی کے قضیئے سے پاک ہے۔ عفّو کے والدین نے اچھی طرح یقین کرا لیا ہے۔ کہ شراب نہیں پیتا، اور کیا چاہیئے؟ اور ہاں لڑکے کی والدہ حج کرنے جا رہی ہیں۔ عفّو نے تو یہاں تک سُنا ہے کہ ان کا ارادہ حج کے بعد وہیں رہ جانے کا ہے، خدا کرے یہ خبر سچ ہو۔

اچھا بہن تم اپنی سناؤ، کیا کیا مصروفیتیں ہیں۔ تمھاری خاموشی سے دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے — دُور ہو تو کیا، تِل تِل رتّی رتّی سب جانتی ہوں۔ اللہ وہ دن لائے کہ اپنی پیاری سہیلی کے ہاتھ رنگے ہوئے دیکھوں۔ خدا سہیلی دے۔ تو ایسی جس کی دسوں انگلیاں دسوں چراغ۔

حمّو تو تمھیں یاد ہو گی۔ اس کی شادی پر ہم سب گئے تھے۔ سُنا ہے۔ لڑکے نے اعتراض کیا کہ نہ تو رسوم ادا کی جائیں اور نہ باجا گاجا ہو خاموشی سے سب کچھ ہو جائے۔ توبہ کیسا ہونق لڑکا ہو گا۔ شادی ہو رہی ہے یا کوئی چوری کر رہے ہیں۔ ولایت سے ابھی ابھی آیا ہے اس لئے دماغ درست نہیں ہے۔ لیکن کون سنتا ہے۔ رسمیں ساری ہوئیں، مانجھے بٹھانا، کنگنا باندھنا، مہندی لگانا، مسالا پسوانا، پانی بھروانا۔ تمھیں خوشی ہو گی کہ مہر تین ہزار مقرر ہوا ہے اور ڈیڑھ سو روپے جیب خرچ لکھا گیا ہے۔ حمّو کتنی خوش نصیب ہے۔ باقی کی رسمیں بھی ادا کی گئیں۔ چوتھی

کھیلنا، دلہن کی جوتی دولھا کے کندھے پر لگانا، آرسی مصحف کرنا، دولھا کے سر پر بہنوں کا آنچل ڈالنا، دولھا کو زعفران کے بہانے مرچیں کھلا دینا، دولھا کے جوتے چرا لینا، پھر دولھا کو اُلٹی چارپائی سے گرا دینا، اس کی شیروانی پلنگ سے سی دینا، میراسنوں کا بیہودہ گانے گانا۔ بڑا لطف رہا۔ دولھا بھی ایک چُغد نکلا۔ جنم نہ دیکھا بوریا سپنے آئی کھاٹ، سُنا ہے کہ نکاح کے فوراً ہی بعد کہیں فرار ہوگیا۔ بڑی مشکلوں سے ڈھونڈ کر لائے۔ پتہ نہیں آج کل کے لڑکے کیسے ہوگئے ہیں۔ یہی رسومات تو قوموں کے زندہ رہنے کی نشانیاں ہیں۔ دولھا نے مہر میں بھی مین میخ نکالی کہ بیس ہزار کا جو جہیز لڑکی کو دے رہے ہیں یہ اپنے پاس رکھئے اور تیس ہزار کی رقم کو کم کر کے مہر دس ہزار کر دیجئے لاحول ولاقوۃ!

شادی میں کچھ لڑکے بھی تھے۔ ہمیں چھیڑنے لگے۔ ڈانٹا تو بولے۔ سنگار کیوں کرتی ہو۔ یہ لوگ اتنا نہیں جانتے کہ ہم کپڑے اور زیور صرف ایک دوسری کو دکھانے کے لئے پہنتی ہیں۔ موئے لڑکوں کو اس سے کیا۔

ممّو کی رخصت ہوگئی۔ خدا کرے کہ بنّے بنّی میں ہمیشہ بنی رہے۔ لیکن آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ افواہ ہے کہ اس کی ساس نندیں بڑی ظالم ہیں پَر کا کوّا اور رائی کا پہاڑ بنانے کو ہر دم تیار ہیں۔ پر بہن یہ مرحلہ تو ہر لڑکی کو

طے کرنا ہے۔

رشید کے چچا بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کے متعلق ایک لطیفہ سُنا کہ رنڈوے ہیں۔ مگر کوئی کہہ رہا تھا کہ بیوی زندہ ہے۔ خیر مجھے اس سے کیا۔

اونی کتنا لمبا خط لکھا ہے۔ لو اب خوش ہو یا اب بھی روٹھی رہو گی۔ خط لکھو مفصّل سا ہو۔ کس کس کی نسبت ٹوٹی ہے۔ کس کس کے گھر شکر رنجی ہوئی ہو یا ہونے کا امکان ہے۔ ہماری جاننے والیوں میں سے کوئی سُسرال سے لڑکر آئی ہے۔ میرے متعلق کسی سے کوئی بات تو نہیں سُنی۔ ان دنوں کس کس کے سکینڈل چل رہے ہیں۔ کوئی نیا فلمی گانا پسند آیا؟ غرارے یا جمپر کا کوئی نیا ڈیزائن ــــ ساری باتیں مفصّل لکھنا۔

اُمید ہے کہ منشی فاضل کا امتحان پاس کر چکی ہو گی۔ کبھی آکر مل ہی جاؤ۔ صرف چالیس پچاس میل کا تو فاصلہ ہے۔ فقط۔

تمھاری دُور افتادہ سہیلی

# برساتی

میں علی الصبح اُٹھا اور سامان باندھنا شروع کر دیا۔ آج میں اڈنبرا کو چھوڑ کر لندن جا رہا تھا۔ پانچ سو میل موٹر چلانا تھی۔ کار میں سامان رکھ کر پڑوسیوں سے علیک سلیک کی اور پروفیسر کے ہاں پہنچا، وہ ناشتے پر میرا منتظر تھا۔

"ایسے موقعے مجھے اداس کر دیتے ہیں۔" وہ بولا "جوانی میں اپنے بچّوں کو رخصت کیا کرتا تھا۔ اب بڑھاپے میں شاگردوں کو — ہم سکاٹ ویسے بھی جذباتی ہیں۔"

اس میز پر ہم نے کتنی مرتبہ لمبی لمبی بحثیں کی تھیں۔ دُنیا کے ہر موضوع پر۔

پروفیسر کہہ رہا تھا — "پینسٹھ برس کی زندگی میں کوئی تجربہ ایسا نہیں جو مجھے نہ ہُوا ہو۔ لیکن جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ مسرّت پہنچائی۔ وہ ہے صبح صبح چاء

کی پیالی اور ایک سگریٹ ۔۔۔ اس کے بعد دن بھر جو کچھ ہونا ہے سب خرافات میں شامل ہے۔ لیکن زندگی کچھ ایسی بُری بھی نہیں، ہو سکتا تھا کہ میرے والدین شادی نہ کرتے اور میرا وجود ہی دُنیا میں نہ ہوتا۔ اچھّا ہوا کہ یہ تماشہ دیکھ لیا۔ میں زیادہ باتیں تو نہیں کر رہا ہوں؟ ۔۔ یہی وقت ہے جب میں بول سکتا ہوں، میری بیوی باہر گئی ہوئی ہے۔" چلتے وقت پروفیسر نے نصیحت کی ۔۔۔ "حدِ نگاہ کبھی محدود نہ رہے۔ ہمیشہ پہاڑیوں کے اُس پار دیکھنا۔"

میں نے شہر کا ایک چکّر لگایا، پھر یونہی خیال آ گیا کہ آین سے ملتا چلوں۔ ویسے کل اُسے خدا حافظ کہہ چکا تھا۔ یونیورسٹی میں اس سے ملا، وہ بہت خوش ہوئی۔

" تمھیں ڈنبار میں اتار دوں گا، وہاں سے بس لے لینا۔"

ہم دونوں روانہ ہوئے، آبادی سے باہر نکل کر میں نے موٹر رو کی اور پیچھے مڑ کر اڈنبرا کے خطِ فلکی کو دیکھا۔۔ نوکدار مینار، مخروطی گنبد، پہاڑیاں، ۔۔۔ جیسے قرونِ وسطیٰ کا کوئی شہر۔۔

"تم تو یوں دیکھ رہے ہو جیسے پھر کبھی یہاں نہ آؤ گے۔"

"آؤں گا، لیکن زندگی کے یہ لمحے دوبارہ نہیں آئیں گے۔"

ہم دونوں خاموش تھے۔ آین مجھے سگریٹ سلگا کر دیتی، دونوں مُسکراتے پھر اُداسی چھا جاتی۔

سُورج نکل آیا تھا۔ سکاٹ لینڈ کی پہاڑیوں پہ سبزہ مخمل کی طرح بچھا ہوا تھا،

کہیں کہیں heather کے سُرخ قالین بچھے ہوئے تھے۔ ہم سمندر کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف جا رہے تھے۔

ڈنبار آگیا۔

"میں بیرک سے ٹرین میں چلی جاؤں گی۔"

بل کھاتی ہوئی سڑک، نشیب و فراز، سرسبز پہاڑیاں اور سمندر۔۔۔

بیرک آگیا۔

"اچھا بس نیو کاسل تک، وہاں میں خود تمہیں ٹرین میں بٹھا دوں گا۔"

سکاٹ لینڈ کی حدود ختم ہو چکی تھیں۔ نیلی جھیلوں اور رنگین پہاڑوں کو میں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ رابرٹ برنز اور اس کے نغمے، اونچے پہاڑوں کی دُھند اور تنہائیوں کی دلسوز دُھنیں۔۔۔ سب پیچھے رہ گئے تھے۔

نیو کاسل آیا تو این بھی واپس سکاٹ لینڈ چلی گئی۔

رخصت ہوتے وقت ہم بالکل خاموش تھے۔

"یہ برساتی تم نے نئی لی ہے؟"

میں نے پہنی ہوئی برساتی کو دیکھا۔ واقعی نئی معلوم ہو رہی تھی۔ شاید کل جوئن نے بغیر پوچھے اسے ڈرائی کلین کرا دیا۔

ٹرین چلنے لگی۔ این کہہ رہی تھی۔۔۔ "اپنی جرابیں مت پھینکنا، مرمت کے لئے مجھے بھیج دینا۔ کام پہ ناشتہ کئے بغیر کبھی مت جانا۔ لوگوں سے لڑنا مت۔۔۔"

اب میں تیزی سے لندن کی طرف جا رہا تھا۔ برساتی کی آستینوں کو دیکھا، پھر کالر اور پیٹی کو ___ کیا یہ وہی برساتی ہے؟ ایسی برساتیاں تو جگہ جگہ دکانوں میں ملتی ہیں۔

کچھ دُور جا کر موٹر روک لی، سامنے چشمہ بہہ رہا تھا۔ ایک پتھر پر بیٹھ کر غور سے برساتی کو دیکھنے لگا ___ اس کے کالر پر کسی نے نام لکھا تھا ___ یہاں سُرخ نشان تھے ___ یہاں سبز دھبہ ___ اس جگہ موم لگا ہوا تھا ___ اور اب یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ برساتی کہاں گئی جو میری رفیق تھی؟ جس سے طرح طرح کی یادیں وابستہ تھیں۔

وہ دھندلی صبح میری آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ جب میں پہلے پہلے اڈنبرا آیا۔ گاڑی پہنچی تو ابھی اندھیرا تھا۔ میں سٹیشن کے ہوٹل میں ناشتہ کر رہا تھا۔ بیرے نے پردہ ہٹایا تو کھڑکی میں سے عجیب نظارہ دکھائی دیا۔ زمین پر دُھند چھائی ہوئی تھی۔ اس دُھند سے فصیلیں اور بُرجیاں اُبھر رہی تھیں ___ اڈنبرا کا قلعہ پریوں کا محل معلوم ہو رہا تھا۔

سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ میں اوورکوٹ خریدنے گیا۔ یہاں نوعمر طبقہ برساتی پہنتا ہے اور ادھیڑ عمر کے لوگ اوورکوٹ۔ بوڑھے برساتی اوورکوٹ اور چھتری تینوں اِستعمال کرتے ہیں۔

ایک سبز رنگ کی برساتی پر میری نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ اسے پہنا، پیٹی کو کس کر آئینے میں دیکھا تو خوب چُست نظر آنے لگا۔ فوراً اوورکوٹ کا ارادہ ترک کر دیا اور برساتی خرید لی۔

اور وہ دن جب آئین سے ملاقات ہوئی، اس مغرور لڑکی کو میں نے کئی مرتبہ یونیورسٹی

میں نے دیکھا تھا ہمیشہ اکیلی ہوتی، سب سے الگ تھلگ۔ پاس سے گذرتے وقت ہم دونوں مُنہ پھیر لیتے۔

یونیورسٹی کے Rector کا انتخاب ہو رہا تھا۔ امیدوار کئی تھے لیکن اصل مقابلہ سر الگزینڈر فلیمنگ اور آغا خان کے درمیان تھا۔ سب کو یقین تھا کہ آغا خان یہ دوڑ ضرور جیت جائیں گے لیکن بالکل ذرا سے فرق سے فلیمنگ منتخب ہو گئے۔

دوپہر کو اُن کا ایڈریس تھا۔ اڈنبرا کی پرانی رسم ہے کہ ریکٹر کی تقریر کو صرف ایک شخص سنتا ہے — خود ریکٹر۔

بڑے ہال میں خوب ہنگامہ مچا، ہم قسم قسم کی چیزیں لے کر پہنچے، سیٹیاں، ڈھول باجے، بطخیں، کبوتر، رسّے، چھتریاں۔

لیکچر شروع ہوا تو کئی طلبا نے چھتریاں لگالیں جیسے بارش ہو رہی ہو۔ اس گیلری سے رسّہ پھینکا گیا جسے دوسری طرف باندھ دیا گیا۔ ایک لڑکا اس سے لٹک کر ہال عبور کرنے لگا۔

ڈھول بجے، کبوتر چھوڑ دیئے گئے، باہر نکلنے کا راستہ نہ ملا اس لئے وہ اندر ہی اڑتے رہے۔ میں نے ایک بطخ چھوڑی جو سیدھی ایک لڑکی کے سر پر جا بیٹھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا — یہ این تھی۔

فلیمنگ کہہ رہے تھے — "پنسلین کے پہلے تجربے کتوں اور بھیڑوں پر کئے گئے"۔

بھوں - بھوں - بھوں ۔۔۔ دیر تک ہال میں بھونکنے اور بھین بھین کی آوازیں آتی رہیں ۔

میرے سر پہ ایک پٹاخا پھٹا، اسے آئن سٹائن نے پھینکا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی سے بطخ مانگ کر آئن کے سر پہ رکھ دی ۔

فلیمنگ کی آواز آئی ۔۔۔ " لوئی پاسچر نے اپنی ساری عمر جراثیم کے پیچھے گذار دی ۔۔۔ "

نعرے لگنے لگے ۔۔۔ " سبحان اللہ کیا زندگی تھی کہ جراثیم کے پیچھے گذری ۔ "

آئن نے پھر ایک پٹاخا پھینکا، میں نے فوراً ایک بطخ اس کے سر پہ رکھ دی ۔

فلیمنگ نے الکحل کی تخمیر کا ذکر کیا تو جیسے حاضرین کو نشہ چڑھ گیا ۔ وہیں لوٹنے لگے ۔ ایک صاحب بیہوش ہو گئے، انھیں سٹریچر پہ لٹایا گیا ۔ دروازے کے قریب چھلانگ مار کر اٹھے اور واپس آ بیٹھے ۔

یہ ہنگامہ ختم ہوا تو میں نے دیکھا کہ پورچ میں ڈین ایک بڑا سا اشتہار پڑھ رہی ہے شام کو نئے ریکٹر کے اعزاز میں رقص ہو رہا تھا ۔

" کیا ارادہ ہے ؟ " میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا ۔

" ضرور چلوں گی ۔ "

رات کو ہم رقص پہ گئے ۔ میرے پروفیسر نے مجھے فلیمنگ سے ملایا ۔ پُرشفقت چہرہ، سفید بال، باتوں میں بھولاپن ۔۔۔ یہ وہی عظیم شخص ہے، بنی نوعِ انسان کا سب سے

بڑا محسن، جتنی جانیں اس نے بچائی ہیں، آج تک کسی نے نہیں بچائیں۔
سکاٹش دھنوں پر رقص ہوتا رہا۔ آخر میں سب نے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر Auld Lang Syne گایا۔ باہر نکلے تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ این نے شام کا ہلکا پھلکا سا لباس پہن رکھا تھا۔ بڑی سخت سردی تھی۔ میں نے برساتی اتار کر اسے پہنا دی۔
آسمان پر نامعلوم سی روشنی تھی اور چاروں طرف سناٹا۔ مخروطی برجیاں اور نکیلے مینار ستاروں کو چھو رہے تھے۔ مجھے یہ گلیاں بہت مانوس سی معلوم ہوئیں — رات کے اندھیرے میں سب بستیاں ایک سی لگتی ہیں۔
پھر یونیورسٹی کے طلباء نے قندیلوں کا جلوس نکالا۔ این اور میں ہزاروں لڑکے لڑکیوں کے ساتھ بڑی بڑی قندیلیں لیے قلعے سے روانہ ہوئے۔ اندھیری رات تھی، سڑکیں خالی تھیں، نیچے اترتی ہوئی سڑک کے دونوں طرف خلقت کا ہجوم تھا۔
قندیلوں سے موم پگھل پگھل کر برساتی پہ گرتا رہا اور نشان پڑتے رہے۔

مگر اب نہ یہ نشان ہیں نہ دوسرے، سب دھل چکا ہے۔ اس سے اب وہ خوشبو بھی نہیں آرہی جو این کو پسند تھی۔ اور میں لندن جا رہا ہوں۔ اس شہر کی مشینی زندگی سے مجھے وحشت ہوتی ہے، پندرہ میل اس طرف نکل جاؤ، دس میل مخالف سمت میں چلے جاؤ لندن ختم ہی نہیں ہوتا۔ جہاں شراب خانوں میں محبوبہ کو سامنے بٹھا کر لوگ فٹ بال، غیر ملکی پالیسی، بزنس، کتوں اور گھوڑوں کی باتیں کرتے ہیں۔ کل سے

پڑھائی شروع ہو جائے گی۔ لندن میں دھواں ہوگا، دھند ہوگی اور ہر وقت کی بارش —— لیکچروں اور امتحانوں کے چکّر سے مدتوں نجات نہیں ملے گی —— کل سے زندگی جامد ہو جائے گی۔ ایک سیاح چاردیواری میں بند ہو جائے گا۔

اس جمود سے میں پہلے بھی کئی بار آشنا ہوا تھا۔ ایسے گھٹے گھٹے سکون سے سب سیاح آشنا ہوتے ہیں۔ جب قدم بوجھل ہو کر زمین میں دھنس جاتے ہیں، شاہراہوں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور یقین ہو جاتا ہے کہ یہ نظر بندی اب کبھی ختم نہیں ہوگی۔ یہ گھٹا کبھی نہ چھٹے گی۔

میں نے پھر برساتی کو دیکھا —— یہ وہ تو نہیں جو اُن اجنبی آسمانوں اور ان جانے خطّوں میں میری رفیق تھی۔ جس کے قرب میں طرح طرح کے پیغام تھے —— نئے نئے ملک چمکتی ہوئی سڑک اور آزادی ——!

اِس کالر کے نیچے ہسپانوی سینوریتا کے سُرخ ہونٹوں کے نشان تھے۔

ایک دُھندسی چھا گئی۔ چشمے کا شور دھیما ہوتا گیا، دھوپ پھیکی پڑتی گئی۔ وہ سب نقوش ذہن میں اُبھرنے لگے۔ میں اور میرا دوست دوسری بار انگلستان عبور کر رہے ہیں۔ ہم ہسپانیہ جائیں گے۔ میں اب وہ شرارتی اور بے چین لڑکا تھا جس نے سکول سے بھاگ کر ایک باغ میں واشنگٹن آروِنگ کی کتاب "الحمرا کی کہانیاں" پڑھی تھی، جسے اندلس نے مسحور کر دیا، جس کے خوابوں میں وہ سہانی فضائیں بس گئیں۔

رودبارِ انگلستان کو عبور کر کے ہم پیرس پہنچتے ہیں۔ فرانسیسی زبان بالکل سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن یہ الفاظ بار بار سننے میں آتے ہیں — شوں داشیں، فوں خاں، ساں سیں —

رات کے کھانے کا بِل آتا ہے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے ہیں — دو ہزار کچھ سو فرانک!

دو تین ایسے کھانے اور رہے تو ساری سیر یہیں ختم ہے لیکن حساب لگاتے ہیں تو کل ڈھائی پونڈ بنتے ہیں۔ بڑی فرحت ہوتی ہے۔

صبح اٹھ کر میں ڈائری دیکھتا ہوں، آج کے ضروری کام یہ ہیں:-

۱۔ حجامت
۲۔ کالر کا بٹن
۳۔ صابن
۴۔ نپولین کا مقبرہ
۵۔ رومال
۶۔ ورسیلز کے محلات

چنانچہ سیدھے حجام کے ہاں پہنچتے ہیں، دکان پر لکھا ہے:-

"یہاں حجامت اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے
اور انگریزی بولی جاتی ہے"۔

یُوں تو سب حجام باتونی ہوتے ہیں لیکن فرانسیسی حجّام کی باتیں سُن کر اخبار خریدنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ آدھ گھنٹے میں صرف وہ ایک کام کی بات کرتا ہے — "جرمن بُہت بُرے پڑوسی ہیں۔ جب کبھی یورپ میں جنگ ہوتی ہے تو اکھاڑے کے لئے ہمارا ملک چُنا جاتا ہے۔ لڑتے دوسرے ہیں لیکن دیکھا دیکھی ہمیں بھی شریک ہونا پڑتا ہے جب جنگ ختم ہوتی ہے تو جیتتا کوئی اور ہے — آپ کے سر میں مالش کروں؟"

نپولین کا مقبرہ جہانگیر کے مقبرے سے ملتا جلتا ہے، زبردست ہجوم ہے، شور مچا ہوا ہے۔ لوگ باتیں کر رہے ہیں، اونگھ رہے ہیں۔ تاش کھیل رہے ہیں، پڑھ رہے ہیں، سودا بیچ رہے ہیں۔ لیکن مقبرے سے کسی کو دلچسپی نہیں، اور نہ غالباً نپولین سے۔

دوپہر کو دو ہزار ایک سو کچھ فرانک کا لنچ کھا کر ورسیلز کے محلات دیکھتے ہیں، یہ جگہ ایک بہت بڑا ہوسٹل معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں لوئی چہاردہم یاد آجاتا ہے جو اس عمارت میں ستر برس رہا۔ آخری دنوں میں کافی سٹھیا گیا تھا۔ ہسپانیہ سے جنگ کا اعلان کرتے وقت اس نے یہیں وہ شیخ چلّیانہ فقرہ کہا تھا — "اب ہسپانیہ اور ہمارے درمیان کوئی پیرانیز حائل نہیں رہے —" تیرہ برس تک لڑائی رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں طرف کے سپاہیوں کی عمروں میں تیرہ برس کا اضافہ ہوگیا اور پیرانیز پہاڑ وہیں رہے جہاں ہمیشہ سے تھے — بلکہ آج کل بھی وہیں ہیں۔

پیرس کو غور سے دیکھا تو فرانسیسیوں کی رومان پسندی کے قصّے بے بنیاد

معلوم ہوتے۔ یہ لوگ اکثر جوڑوں میں باہر نکلتے ہیں لیکن آپس میں کسی سرگرمی کا اظہار نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے سے کچھ بیزار سے معلوم ہوتے ہیں۔ بچّوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر۔ یا تو یہ لوگ شادیاں نہیں کرتے یا سخت قسم کے خلاسفر ہیں۔ عورتیں چھوٹے قد کی ہیں۔ چہرے پر میک اَپ اس قدر ہوتا ہے کہ بجائے خدّوخال کے صرف میک اپ کے فرق سے پہچانا جا سکتا ہے کہ یہ وہی ہے۔ یا کوئی اور۔ وہ سب رنگ رلیاں جنھیں فرانس سے منسوب کیا جاتا ہے۔ شاید انقلابِ فرانس سے پہلے ہوتی ہوں گی۔ ان دنوں یہ لوگ کسی پیچیدہ مسئلے پہ ہر وقت غور کرتے رہتے ہیں۔

جب ہم پیرس کا مشہور عریاں رقص دیکھنے جا رہے تھے تو مجھے جُولیا کا فقرہ بار بار یاد آ رہا تھا —— کہ بھلا ڈاکٹروں کو عریاں رقص سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے —— جُولیا سچ کہتی تھی۔ لیکن ہمیں محض روایتاً جانا پڑا۔ جیسے مشرق سے ہر آنے والے کے متعلق اہلِ یورپ کو یقین ہوتا ہے کہ اگر یہ شخص تاج محل میں باقاعدہ رہا نہیں تو اس نے دیکھا ضرور ہوگا۔ اسی طرح یورپ سے آنے والوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ انھوں نے پیرس کے وہ ناچ ضرور دیکھے ہوں گے۔

سٹیج پر لڑکیوں کو دیکھتے ہی بوڑھے دُوربینیں نکالتے، یہ دوربینیں کرائے پر ملتی ہیں۔ لیکن صرف مردوں کو۔

پیرس سے روانہ ہوئے جون آف آرک کے گاؤں سے ہوتے ہوئے ٹورز پہنچے

دریا کو عبور کر کے اس میدان کو دیکھا جہاں آٹھویں صدی میں ایک فیصلہ کُن جنگ ہوئی تھی۔ عرب فرانس فتح کرتے ہوئے پیرس سے صرف سوا سو میل رہ گئے تھے۔ یہ لڑائی دنیا کی اہم ترین لڑائیوں میں سے تھی۔ عربوں کی شکست نے یورپ کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔

سان سبستیاں پر ہسپانوی سرحد عبور کر کے سمندر کے کنارے رات بسر کی۔ اگلے دن برگوس کے ایک ہوٹل میں کھانے کا انتظار کر رہے تھے کہ یکلخت پچاس ساٹھ خواتین و حضرات ساتھ آ بیٹھے۔ کسی کی شادی خانہ آبادی ہو رہی تھی۔ ہمیں بھی براتیوں میں شریک کر لیا گیا۔

ہر ہسپانوی آدھا بل فائیٹر ہوتا ہے اور آدھا ڈون کوئیکزاٹ۔ فرانسیسی انعام لئے بغیر نہ ٹلے گا لیکن ہسپانوی رقم لے کر مُنہ بنائے گا۔ اسے مٹھائی یا سگرٹ دو تو خوشی سے قبول کرے گا کہ اُسے ہم رتبہ سمجھ کر تحفہ دیا گیا ہے۔

راستے میں موٹر کھڑی دیکھ کر ایک بیل گاڑی والا رک گیا کہ کسی مدد کی ضرورت ہو تو حاضر ہوں۔ سیاہ بال، سیاہ آنکھوں اور گندمی رنگت والے ہسپانوی ہمیں اجنبی نہ سمجھتے، بلکہ کئی بار ایسا ہوا کہ خود اُن لوگوں نے ہم سے راستہ پوچھا۔

گاؤں میں کھانے کے لئے رُکتے۔ یہ معلوم ہوتے ہی کہ ہمیں زبان نہیں آتی، دکاندار ہمیں باورچی خانے میں لے جاتا۔ گوشت، مچھلی، سبزیاں، انڈے۔ ہم اشارہ کرتے اور وہ جلدی سے پکا دیتا۔

سیدھے سادے شریف لوگ، غریب، مہمان نواز۔ سفیدی کئے ہوئے گھر

جو دھوپ میں چمکتے ہیں۔ مکانوں کے دریچے اتنے کشادہ اور سجے ہوئے کہ خواہ مخواہ اندر جھانکنے کو جی چاہتا ہے۔

میڈرڈ کی شاندار سنگِ مرمر کی بنی ہوئی عمارتوں، بڑی بڑی جھیلوں اور وسیع باغات کو دیکھ کر یہ خیال تک نہیں ہوتا کہ یہاں خانہ جنگی ہوئی تھی۔ مشہور آرٹ گیلری پرادو میں ہم نے پورا دن صرف کیا۔ ٹشان، وان ڈیک، ال گریکو، روبنز، رافیل، گویا، ماریلو اور دوسرے فن کاروں کی تصویروں پر ہسپانوی فخر کرتے ہیں اور یہ فخر بجا ہے

صبح صبح فرانکو کا مراقشی باڈی گارڈ گلیوں سے گذر رہا تھا۔ خوبصورت دجیہہ شہسوار قدیم عربی یونیفارم ـــ اُنھوں نے کئی مرتبہ فرانکو کی جان بچائی۔ ملکی خانہ جنگی میں فرانکو کی فتح مراقش کے قبیلوں کی مرہونِ منت تھی۔

ہسپانوی موسیقی کی اُداس دُھنیں سُن کر مجھے بدوؤں کے قافلے یاد آ گئے۔ جنھیں میں نے صحراؤں میں دیکھا تھا۔ بدوؤں کا مقولہ ہے کہ آبادیوں میں صرف بُزدل رہتے ہیں۔ بدّو بستیوں میں محض اس لئے آتے ہیں کہ اگلے سفر کی تیاری کر سکیں۔ خیمے کے گرد گھاس اُگنے سے پہلے وہ کوچ کر جاتے ہیں۔

خانہ بدوشی عربوں کی تاریخ کا اہم جزو رہی ہے ـــ نہایت المناک جزو۔

ہوٹل کی چھوٹی سی دکان میں صندلی رنگت اور سیاہ بالوں والی حسینہ نظر آتی۔ خواہ مخواہ اس سے پوچھنے کو جی چاہتا کہ آج تاریخ کیا ہے؟ اس وقت کیا بجا ہے؟ باہر موسم کیسا ہے؟

میرے دوست نے اس سے آویزے خریدے اور انھیں پہننے کے سلسلے میں ترکیب استعمال دریافت کی۔ اس نے مسکرا کر اپنا ایک آویزہ اتارا اور یہ نیا آویزہ پہن کر چہرہ ہمارے سامنے کر دیا۔

میرے دوست نے نعرہ لگایا — "بونو" — (یہ لفظ نیا نیا سیکھا تھا) اس کی رنگت گلابی ہو گئی۔ شرما کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ ہمیں پتہ چلا کہ بونو کے یہاں وہی معنے ہیں جو ہمارے ہاں 'اُف مار ڈالا' کے ہیں۔ لیکن حیرت ہوئی کہ مغربی ممالک میں لڑکیاں شرماتی بھی ہیں۔

اُندلس تخیل سے بھی زیادہ دلکش معلوم ہوا۔ اندلس کے سحر کو کوئی چیز اتنی اچھی طرح واضح نہیں کرتی جتنا کہ وہاں کا حُسن۔

اُندلسی عورتیں پھولوں سے زیادہ حسین ہیں، ان کی ہر ادا میں عجب شانِ دلربائی ہے — پُرتمکین، قابلِ ستائش، گہری جھیلوں سے زیادہ گھمبیر، خاموش، جیسے کوئی راز سدا اُن کی پُراسرار اور پرکشش رُوح میں پوشیدہ رہتا ہے۔ ایسا بیش بہا بھید جسے عاشق یا خاوند تک نہیں پا سکتے۔ سادگی ایسی کہ ان کی موجودگی میں ان کا قرب تک محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن بعد میں رواں رواں کسی آتشیں جذبے سے مغلوب ہو جاتا ہے جب یہ محبت کرتی ہیں تو محبوب کو اپنی شدید چاہت اور ملائم اپنائیت سے متحیّر کر دیتی ہیں۔ لیکن اُنھیں کبھی دکھاوے کی محبت نہیں ہوتی۔

غرناطہ ایک وسیع وادی میں پھیلا ہوا ہے، پہاڑیوں پر الحمرا کا قصر اور جنت العریف

کے باغات ہیں۔ ایک طرف نیچی پہاڑیوں پر پرانا شہر البیرزن آباد ہے جہاں خانہ بدوش رہتے ہیں۔ عقب میں سیرا نویدا کی برفانی چوٹیاں ہیں جہاں سے الحمرا کے فواروں کو پانی ملتا ہے۔

اُوپر پہاڑ سے دُور افق پر ایک دھندلی سی چیز نظر آتی ہے۔ افریقہ کا ساحل۔

ان باغوں میں یہ محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی کسی کے قدموں کی آہٹ سُنی ہے، ابھی ابھی کوئی گیا ہے، یہ نامعلوم سی خوشبو اس کے پیراہن کی ہے۔ کسی نے پھولوں کو چھُو لیا تھا، یہ ٹہنیاں اب تک ہل رہی ہیں۔

الحمرا اب بھی پریوں کا مسکن معلوم ہوتا ہے۔ ہر ستون، ہر محراب، درو دیوار کے خوشنما نقوش، چپہ چپہ سحر زدہ ہے۔ لیکن اِس ویرانی میں زندگی کے آثار صرف فواروں کی صدائیں ملتے ہیں۔ یہ چشمے کبھی خاموش نہیں ہوئے۔ عربوں کے زمانے سے اب تک رواں ہیں۔ گذرتے ہوئے وقت کے مدّوجزر، انسانی زندگی کی کم مائیگی، فلسفہ تعمیر و تخریب — سب ان فواروں میں جذب ہو کر رہ گئے ہیں۔

شام کو نیا چاند نکلا، میں نے پہاڑی سے نیچے دیکھا۔ ساری وادی میں روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں، برفانی چوٹیوں سے تارے جھانک رہے تھے۔

وہ کیسا منحوس طلسم تھا جو سدا اس قصر پر مسلّط رہا۔ یہ قصر جو اب بھی دنیا کی حسین ترین چیزوں میں سے ہے۔ ان سُرخ فصیلوں کے اندر جو ارضی جنّت ہے وہ اس قدر غم انگیز کیوں ہے۔

ہوا کا جھونکا آیا اور خوشبوئیں بکھیرتا چلا گیا۔ خوش الحان پرندوں کے چہچہے سنائی دیئے اور فوّاروں کی صدا ـــــ دل میں اداسی کی تہیں بیٹھتی چلی گئیں۔ وہ اُداسی جو حُسن سے مربوط ہے۔

سی نور آنتونیو ہمارا گائیڈ تھا۔ ایسی نورانی شکل کہ ولی اللہ معلوم ہوتا۔ یورپ میں چالیس پینتالیس برس کی عمر کے بعد اکثر آدمی ولی اللہ معلوم ہوتے ہیں۔ اُس کا والد دادا سب گائیڈ تھے۔ اسے فخر تھا کہ اس کا ایک بزرگ واشنگٹن آرونگ کا گائیڈ رہ چکا تھا۔ چنانچہ اس کی تصنیف میں بیشتر روایات اور قصے انتونیو کے بزرگ کے بتائے ہوئے تھے۔

"لیکن اب یہ نسل ختم ہو جائے گی، میں لاولد ہوں۔" وہ ٹھنڈا سانس بھر کر کہتا۔

اُسے موسیقی، ادب اور تاریخ سے خاص لگاؤ تھا ـــ "سامنے دیواروں پر عجیب سے خطوط بنے ہوتے ہیں، عرب یہاں ٹرگنومیٹری پڑھاتے تھے۔ قصر کے بڑے دروازے باب العدل پر جو کنجی کی شبیہ ہے یہ صوفیوں کا نشان ہے، وہ کنجی جس سے خدا دلوں کے قفل کھولتا ہے ـــ 'ہسپانوی باغوں کی ایک رات' ـــ کی مشہور دھن دراصل الحمرا کے چشموں کی صدا کا تاثر ہے ـــ فرانسیسی الحمرا کو بارود سے اڑانے لگے تھے لیکن وقت پر پتہ چل گیا۔ تب سے ہمیں ان سے نفرت ہے ـــ آپ بالکل ہسپانوی معلوم ہوتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کبھی کچھ کر بیٹھیں اور بھاگنا پڑے تو چھپنے کے لئے سیدھے یہاں چلے آیئے، کسی کو پتہ تک نہ چلے گا ـــ"

وطن کی بہت سی باتیں یہاں ہیں، کسی سے کچھ پوچھو تو چار پانچ آدمی ویسے ہی ساتھ آن کھڑے ہوتے ہیں۔ رات کو لوگ خوشبو لگا کر گلیوں میں بغیر کسی مقصد کے دیر تک گھومتے رہتے ہیں۔ آدھی آدھی رات تک ہوٹل کھلے ہوئے ہیں اور ریکارڈ بج رہے ہیں لیکن یہاں ایک چیز ایسی ہے جو ہمارے ہاں نہیں ــــ محبوبہ کے دریچے کے نیچے کھڑے ہو کر گانا گایا جا سکتا ہے (اگرچہ اس کی اجازت ہماری فلموں میں ہے) لیکن ہسپانوی محبوبہ جواباً ہرگز نہیں گلستے گی۔ محبوبہ کے والدین تب تک خاموش رہیں گے جب تک عاشق سنجیدگی سے گاتا رہے۔ لیکن اگر وہ بات کرنے کی کوشش کرے تو شور مچ جائے گا اور محبوبہ کو اندر بلا لیا جائے گا۔

انتونیو نے خانہ بدوشوں کے ناچ کی بڑی تعریف کی۔ "اگر آپ نے غاروں میں خانہ بدوشوں کا یہ رقص نہیں دیکھا تو اندلس نہیں دیکھا۔"

یہ رقص خاص فرمائشی چیز ہے۔ پبلک کے لئے نہیں ہوتا۔ اس کے لئے کم از کم پانچ سو پیسٹے (تقریباً چھ پاؤنڈ) دینے پڑتے ہیں۔ ان لوگوں کو شراب بھی پلانی پڑتی ہے۔ تین پاؤنڈ اور ــــ گویا مجرا کرانا ہے۔

شام کو ہم البیرزن گئے، سیڑھیاں طے کر کے غاروں میں اترے۔ مدھم سی روشنی میں سگریٹ کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ ایک عجیب سی خوشبو آ رہی تھی۔

شراب کا دور شروع ہوا۔ گٹار بجنے لگی۔ میرے ساتھ بیٹھی ہوئی چنچل لڑکی بار بار مجھ سے اجنبی زبان میں سوال پوچھ رہی تھی۔ ایک جام مجھے بھی زبردستی دیا گیا جسے میں نے

اس لڑکی کو دے دیا، اس نے فوراً اسے اپنے جام میں انڈیل لیا۔ گھڑی دیکھنے کے بہانے اس نے میری کلائی تھام لی۔

وہ ناچنے اُٹھی تو دوسری آبیٹھی۔ وہ بھی پریشان کرنے لگی، دفعتاً پہلی نے اسے پکڑ کر ایک طرف دھکیل دیا۔ موقعہ پاتے ہی وہ پھر آبیٹھی۔ اب باقاعدہ چھینا جھپٹی شروع ہو گئی۔ بڑی مشکل سے انھیں چھڑایا گیا۔ پہلی لڑکی کے رخسار پہ لمبا نشان تھا، جیسے خنجر کا زخم ہو۔

"یہ خانہ بدوش لڑکیاں بڑی تند خو ہوتی ہیں۔" انتونیو نے میرے کان میں کہا— "جدھر مائل ہو جائیں تو جان تک لڑا دیتی ہیں۔ ذرا محتاط رہئے، یہ پوچھ رہی تھی کہ آپ کہاں مقیم ہیں۔"

"اسے کوئی غلط پتہ بتا دیجئے۔"

اب اصلی رقص شروع ہوا یہ خانہ بدوشوں کا قدیم رقص ہے۔ اس میں ایک واضح کشمکش موجود ہے، جیسے روح کی ساری جدّوجہد جسم میں منتقل ہو گئی ہو۔ زندگی، محبت، جذبۂ تخلیق کے بنیادی حقائق کا اظہار اس رقص میں پورے خلوص سے نمایاں ہے— یہ اظہار جو غیر ارادی ہوتا ہے۔ جس میں حزن ہے، بیتابی ہے مگر بلا کی جاذبیت بھی ہے۔

رقاصہ تنہا کھڑی ہوئی اس پھول کی طرح معلوم ہوتی ہے جو شعاعوں کی تمازت، تھکن اور نیند کے احساس سے مغلوب ہو چکا ہو۔ اس کے گورے بازو پانی میں تیرتے ہوئے کنول کے لمبے ڈنٹھل ہیں۔

یکایک وہ کانپتی ہے۔ اس کے دل کو کسی شدید جذبے نے چھوا ہے۔ ایک لہر کے بعد دوسری آتی ہے، شدتِ احساس سے اس کا جسم لرزنے لگتا ہے۔

اب وہ صبح کے دھندلکے میں کھلے ہوئے پھول کی طرح لگ رہی ہے۔ پھول جو سورج کی پرستش کے لئے خاموش کھڑا ہے جس کی پنکھڑیوں سے شبنم کے قطرے ڈھلک رہے ہیں۔

وہ بیدار ہو رہی ہے۔ زندگی نے دفعتاً اُسے بازو سے آن پکڑا۔ اس کا سر پیچھے جھک جاتا ہے۔ اس کے بازو کسی غیر مرئی شے کو آغوش میں لے لیتے ہیں۔ اس کے ہونٹ ایک ان جانے بوسے کی لذت سے بوجھل ہو جاتے ہیں۔۔۔ آہستہ آہستہ وہ آنکھیں کھولتی ہے۔ پلٹ کر وہ اس کا تعاقب کرتی ہے۔ اس کی روح بے چین ہے، وہ تیزی سے سانس لے رہی ہے۔ اس کرب سے نجات پانے کے لئے وہ تگ و دو کرتی ہے۔ رقص کی ایک ایک جنبش سے یہ جدّوجہد عیاں ہے۔

آخر ایک جھٹکے کے ساتھ وہ اپنے آپ کو چھڑا لیتی ہے۔۔۔ اب وہ آزاد ہے۔

فرطِ انبساط سے اس کا رؤاں رؤاں پھڑک رہا ہے۔ مجیرے بجتے ہیں، تار تھرتھراتے ہیں۔ گویے کی لے کے ساتھ وہ ترنگ میں ناچ رہی ہے۔

یہ وجدانی حالت زیادہ دیر تک نہیں رہتی۔ رقاصہ پر ایک نئی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ زندگی کی مضبوط گرفت نے اسے دبوچ لیا ہے، اس کا چہرہ پژمردہ ہے، اعضا تھکے تھکے سے ہیں۔ وہ لڑکھڑا رہی ہے، اس کے ہونٹوں پر آہیں ہیں۔ اس کی آنکھیں

نمناک ہیں۔

اب وہ ایک کونے میں بےحس و حرکت کھڑی ہے۔ خاموش۔ تنہا۔
گٹار سسکی بھر کر خاموش ہو جاتی ہے، رقص تمام ہوتا ہے۔

غرناطہ سے اشبیلیہ تک جگہ جگہ دھوپ میں چمکتے ہوئے سفید صاف ستھرے گاؤں آتے ہیں، زیتون، نارنگیوں اور کھجوروں کے درخت۔ ہر گاؤں میں مینار اور گنبد دار عمارتیں ہیں جو کبھی مسجدیں تھیں ــــ اب تک طرزِ تعمیر وہی پرانا ہے۔

عربوں کو درختوں سے ہمیشہ محبت رہی۔ عبدالرحمٰن اوّل نے کھجور کا پہلا پودا شام سے منگوا کر قرطبہ میں بویا تو وطن یاد آیا اور اس نے وہ نظم کہی جو اب تک پڑھی جاتی ہے۔

اشبیلیہ میں پلاؤ کھایا۔ نارنخاس (نارنگیاں) آئیں تو چاقو ڈھونڈنے کے لئے اِدھر اُدھر ہاتھ مارے۔ برساتی غائب تھی۔ فوراً کمرے میں پہنچے، وہاں نہیں ملی، صندوق کھولے، کار میں دیکھا۔ ہوٹل والوں سے پوچھا لیکن نہیں ملی۔

غرناطہ فون کیا۔ برساتی کا حلیہ بتایا۔ جواب ملا ــ آپ تحفے خریدتے وقت برساتی ایک دکان پر چھوڑ آئے تھے، ایک بڑھیا اسے پہنچا گئی ہے ــــ لیکن آپ کی برساتی سبز نہیں سبزی مائل ہے اور اس کی جیب میں دستانے ہیں اور بس پیسٹے بھی آج شام تک اشبیلیہ پہنچ جائے گی ــ

شام سے پہلے برساتی مل گئی۔ لاری والے نے کرایہ نہیں لیا، غرناطہ والے ادا کر چکے تھے۔

اشبیلیہ کی سب سے مشہور عمارت القصر ہے جو ہو بہو الحمراء کی نقل ہے، غرالدہ کبھی مسجد کا مینار تھی۔ اب گرجے کا مینار ہے۔ اس میں سیڑھیاں نہیں ہیں پہاڑی سڑک والی چڑھائی ہے ہمیں بے حد رقت زدہ گائیڈ ملا، شاید اس کی محبوبہ اس سے بیزار تھی یا Vice Versa اس نے ہمیں ڈون جوآن کی قبر دکھائی جو گرجے کی سیڑھیوں کے عین نیچے ہے۔ گرجے میں جانے والا کتبے کے اوپر سے گذرتا ہے۔ مرحوم کی آخری خواہش کے مطابق کتبے پر لکھا ہے۔ "یہاں دنیا کا سب سے بڑا گنہ گار سو رہا ہے۔ اسے پاؤں تلے روند دیجیے۔"

ڈون جوآن چلتے چلتے بھی سکور کر گیا۔ ایسا کتبہ کسے نصیب ہوتا ہے؟ ایک گرجے میں کولمبس کی ہڈیاں دفن ہیں۔ لیکن جنوبی امریکہ والے کچھ اور کہتے ہیں۔ دراصل کولمبس اس قدر مشہور ہو چکا تھا کہ متعلقہ ممالک میں سے ہر ایک نے اسے اپنے ہاں دفن کیا ہے۔

"یہ وہ سگرٹ فیکٹری ہے جہاں مشہور رقاصہ کارمن ملازم تھی۔" گائیڈ ٹھنڈا سانس بھر کر بولا۔

"اور وہ دکان کہاں ہے جہاں باربر آف سویلیہ کام کرتا تھا؟" میں نے پوچھا۔ ہم بل فائیٹنگ کے اکھاڑے کے سامنے کھڑے تھے۔

"سردیوں میں بُل فائیٹنگ نہیں ہوتی۔ کیونکہ سارے بُل فائیٹر آرام کرتے ہیں"۔
اس نے آہ بھر کر کہا۔

"اور غالباً بیل بھی آرام کرتے ہیں"۔ میں نے لقمہ دیا۔

اس کا نام کارلوز باربلا تھا۔ اندلس میں ایسے نام اب تک ہیں جو باشندوں کی نسل کو ظاہر کرتے ہیں۔ رکارڈو ڈی مڈینہ (مدینہ کا رچرڈ) کارلوز الحسین (چارلس الحر)

گائیڈ کی افسردگی مجھ سے نہ دیکھی گئی اور ہم پلاؤ کھا کے لوٹ آئے۔

ہم نظاروں کے رنگین کارڈ خریدتے۔ پورا سٹ خریدنا پڑتا۔ اس لئے کچھ اوٹ پٹانگ کارڈ بھی آجاتے۔ چنانچہ گرجوں وغیرہ کے نظارے جُولیا کو ارسال کئے جاتے۔ جولیا سخت مذہبی قسم کی لڑکی تھی، کٹر رومن کیتھولک، شرعی سکرٹ پہنتی یعنی ٹخنوں تک نیچی۔ جمعے کو گوشت سے پرہیز تھا، جمعرات کو انڈوں سے، بدھ کو مچھلی سے، اتوار کو سینما سے۔ تقریباً ہر روز اس کا کسی چیز سے روزہ ہوتا لیکن ماشاء اللہ تھی خوش خوراک، ایک ہی دن میں ہفتے بھر کی کسر نکال لیتی۔

اشبیلیہ میں سال کی آخری رات تھی۔ میں تیار ہوا تو دیکھا کہ میرا دوست سویا پڑا ہے! اسے جگایا

" کوٹ کی جیب میں بٹوہ ہے۔ تم اکیلے ہو آؤ۔ میں تھکا ہوا ہوں"۔

بڑوس کی رقص گاہ میں بڑی رونق تھی، جدھر نظر جاتی۔ ادھیڑ عمر کے مرد عورت دکھائی دیتے۔ یورپ میں یہ بڑی مصیبت ہے۔ کسی اچھی جگہ جاؤ نقط بنے سنورے

بوڑھے بوڑھیاں نظر آنے ہیں۔ شاید یہ زندگی کا قانون ہے، جب خون میں حرارت اور طبیعت میں جولانی ہوتی ہے تو کوئی نہیں پوچھتا۔ سارے کام اُلٹے ہوتے ہیں اور جیب خالی ہوتی ہے۔ جب حالات بہتر ہونے لگتے ہیں تو دل بجھ جاتا ہے اور مسرّتوں سے محظوظ ہونے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی —— ہر چیز ذرا دیر میں ملتی ہے۔

واپس لوٹا تو ہوٹل والے نے روک لیا۔ "آج تو جگہ جگہ جشن ہوں گے۔ اگر آپ آج سو گئے تو مجھے بہت افسوس ہوگا۔"

"تو اوپر سے برساتی منگا دیجئے۔"

برساتی پہن کر میں باہر نکلا۔ وادی الکبیر کے کنارے کنارے چلنے لگا، بڑی سہانی رات تھی۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ غرالدہ کو آج روشن کیا گیا تھا —— اس خوشنما مینار کو دیکھتا رہا۔ اتنی بلندی سے مؤذن کی آواز نیچے نہیں پہنچتی ہوگی —— پھر چمکتے ہوئے تاروں نے یاد دلایا کہ عرب مسجد کے بلند میناروں سے رصد گاہ کا کام لیتے تھے۔

اونچی عمارات کا سلسلہ ختم ہوا تو کنج آئے جہاں الاؤ روشن تھے، شور مچا ہوا تھا ہجوم میں ایک گویے نے تان اٹھائی اور اس طرح مُرکی لگائی کہ استاد نیاض خاں یاد آگئے۔

یہاں BOLERO ہو رہا تھا۔ اس رقص میں ہنگامہ زیادہ ہے، لوگ دائرے میں کھڑے ہو کر تالیاں بجا بجا کر تال دیتے ہیں۔ ایک طرف سے لڑکا نکلتا ہے۔ مخالف سمت سے لڑکی۔ وہ لڑکے کی موجودگی سے بظاہر بے خبر ہے۔ لڑکا طرح طرح کے

حیلوں سے اُسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

سینوریتا کے ہاتھوں میں castanets ہیں جنھیں وہ کبھی تال دینے کے لئے بجاتی ہے۔ کبھی والہانہ انداز میں تو کبھی محض شرارتاً۔

متواتر چھیڑ چھاڑ سے تنگ آ کر وہ لڑکے کی طرف بڑھتی ہے۔ لیکن کچھ اس انداز سے جیسے حملہ کر رہی ہو۔ لڑکے کے قدم زمین پہ جمے رہتے ہیں لیکن وہ بدن کی جنبش سے وار بچا جاتا ہے۔ لڑکی بالکل چھوتی ہوئی برابر سے گذر جاتی ہے۔

"اولے ole" ہجوم چلاتا ہے۔ اسی طرح کبھی ان کے آباؤاجداد "واللہ" کہہ کر داد دیا کرتے تھے۔

وہ سر کو بار بار جھٹکتی ہے۔ سیاہ زلفیں بکھر جاتی ہیں، بالوں میں ٹنکے ہوئے پھول گر جاتے ہیں، بل کھاتا ہوا جسم مچلنے لگتا ہے۔ گٹار کے نغمے کا زیر و بم نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔ لڑکا پھر چھیڑتا ہے، وہ آتی ہے۔ یہ دامن بچا جاتا ہے۔

"اولے!" ہجوم داد دیتا ہے۔

رقص کا اختتام اسی طرح ہوتا ہے جیسے ہونا چاہیئے۔ لڑکے کی مدافعت گھٹتے گھٹتے ختم ہو جاتی ہے۔ نسوانی جادو اپنا کام کر جاتا ہے۔ اب لڑکی اپنے لباس اور چوڑیوں سے کھیل رہی ہے اور وہ دیوانہ وار اس کے گرد طواف کر رہا ہے۔

گانے، تالیوں اور سازوں کے شور میں شراب کا دور چلتا ہے۔ ایک نیا جوڑا ناچنے لگتا ہے۔ جہاں اس رقص میں خمار و مستی ہے وہاں محبت کے تمام حربوں کی

ترجمانی بڑے خلوص سے ہوتی ہے۔ اس رقص کے کچھ حصے بل فائیٹنگ سے بہت ملتے ہیں بالکل اسی کی نقل معلوم ہوتے ہیں۔ بیل حملہ کرتا ہے اور بل فائیٹر وار بچاجاتا ہے۔

میری باری آئی۔ تب تک میرے چند دوست بن چکے تھے۔ سینوریتا فلاویا کی فرمائش پر میں نے سیاہ کوٹ اور ٹائی اتار کر اُس کی بہن کے حوالے کیے۔ کالر کھول کر اور بال پریشان کر کے میدان میں کود پڑا۔

ٹِک ٹکاٹک ٹِکاٹِک ٹِک ٹِک — فلاویا کے Castanets بجے۔

ٹپ ٹپاٹپ ٹپاٹپ ٹپ ٹپ — میں نے ایڑیوں کو فرش پر مارا۔

میں سفید قمیص سیاہ چست پتلون پہنے، ٹھوڑی نیوڑھائے، پنجوں کے بل تنا ہوا کھڑا تھا۔ بالکل بل فائیٹر کے انداز میں۔

داہنا کندھا اور داہنا پاؤں آگے کر کے میں فلاویا کی طرف پنجوں پر گھوما۔

چھنا نانن — چھن — چھن — اس کی چوڑیوں کی جھنکار سنائی دی۔ ایک اچٹتی نگاہ ڈالتی ہوئی وہ اتنے قریب سے گذری کہ میرے بال اور بھی پریشان کر گئی۔ گویّے نے پھر استاد فیاض خاں کی طرح انترہ اٹھایا۔ فلاویا نے دونوں بازو پھیلائے میرے چہرے کا ہالہ بنا کر انگلیاں یوں نچائیں جیسے بلائیں لیتے ہیں۔ بالکل یہی میں نے کیا۔ میں آگے بڑھا، لیکن وہ تڑپ کر بازوؤں کے حلقے سے نکل گئی۔

"اولے — اولے"۔

لے اب چلنتر میں تھی ، رقص تیز ہوتا گیا۔

الاؤ بجھنے لگے ، چاندنی پھیکی پڑ گئی۔ جب ہم واپس آ رہے تھے تو چاند کھجوروں کے جھنڈ میں غروب ہو رہا تھا۔

ایک امریکن نے ہم سے کہا کہ وہ ہمیں شہر تک اپنی کار میں چھوڑ آئے گا۔ فلاؔدیا کی بہن کے کہنے پر ہم سب کار میں بیٹھ گئے۔ ایک لڑکی امریکن کے ساتھ بیٹھی تھی۔ کسی ، مذاق پر اُس نے ہسپانوی زبان میں کچھ کہا — جس کے معنے تھے — میں سینوریتا ہوں مجھے کچھ نہ کہنا — ہم سب ہنسنے لگے — اتفاق سے امریکن کی کہنی پھر اُسے چھو گئی — اس نے پھر وہی فقرہ دوہرایا — اتنے میں فلاؔدیا نے اپنی بہن سے کچھ کہا جس میں سینوریتا کا لفظ دو مرتب آیا۔

امریکن جو غالباً مدہوش تھا طیش میں چلّایا — "سُن لیا یا باباسُن لیا۔ تم بھی سینوریتا ہو اور سینوریتا کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا"

فلاؔدیا غصّے سے لال بھبوکا ہو گئی۔

"کار رکئے ، میں اترنا چاہتی ہوں"

کار رکی ، فلاؔدیا اتری ، میں بھی اُتر گیا۔ ہم کافی دُور مضافات میں تھے۔

"تم ناحق اُتر گئے — اجنبی ہو ضرور راستہ بھول جاؤ گے"

"لو یہ برساتی پہن لو — سردی ہے" بڑے اصرار سے میں نے اُسے برساتی پہنائی۔

ہم وادی الکبیر کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے، رات ختم ہو چکی تھی۔ صبح کا اجالا پھیل رہا تھا۔

"پتہ نہیں میری بہن گھر پہنچ کر کیا کیا شکائتیں کرے گی۔"

"تو پھر میں شام کو تمھاری گلی میں SERENADE کرنے نہ آؤں؟"

وہ ہنسنے لگی۔ "ضرور آنا۔ میں سیاہ مینٹلا پہن کر بالوں میں پھول لگا کر دریچے میں انتظار کروں گی۔"

"لیکن تم اپنے نازک سے پنکھے سے چہرہ چھپا لو گی۔"

"تمھیں سب پتہ ہے۔ اچھا نہیں چھپاؤں گی۔"

جب اس کا گھر آیا تو مشرق میں روشنی پھیل چکی تھی۔

"تو پھر تم آؤ گے۔"

"نہیں فلاڈیا، اب ملاقات نہیں ہوگی۔ میں آج قرطبہ جا رہا ہوں۔"

وہ کچھ دیر خاموش کھڑی مجھے دیکھتی رہی، پھر اس نے برساتی کو سرخ ہونٹوں سے بار بار چوما۔۔۔

"میں تمھیں ہر نئے سال کی رات کو یاد کیا کروں گی۔۔۔"

قرطبہ ویرانی کی تصویر ہے، محزوں، المناک۔ قرطبہ ایک مردہ شہر ہے جس میں روحیں بستی ہیں۔ پرانے محلوں میں، کھنڈروں کے آس پاس، کھجور کے درختوں کے

پیچھے، دریا کے کنارے۔ دہشت ناک خاموشی ہے۔ جیسے اجل کو رخصت ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔

یقین نہیں آتا کہ یہ وہی شہر ہے جسے یورپ کے ایامِ جہالت میں ایک فرانسیسی راہبہ نے 'دنیا کا ہیرا' کہا تھا۔

میں وادی الکبیر کے پُل پہ کھڑا ہوں ـــ سامنے مسجدِ قرطبہ کا مینار ہے اور اس کے ساتھ خلیفہ کا محل۔ عربوں کا بنایا ہُوا یہ پُل اب بھی استعمال ہوتا ہے۔ مسجدِ قرطبہ اب بھی اتنی ہی حسین و جمیل ہے۔ مدینۃ الزہرا کے کھنڈر اس کی گذشتہ عظمت کے گواہ ہیں۔

یہ شہر ایک زبردست تہذیب کا مقبرہ ہے۔

دسویں صدی میں یہاں ڈھائی لاکھ مکان تھے۔ دس لاکھ باشندے یہاں رہتے تھے۔ لندن کو یہ آبادی کہیں انیسویں صدی میں نصیب ہوئی۔ یہاں میلوں لمبی پختہ سڑکیں تھیں، جن پر رات کو روشنی ہوتی تھی، اس زمانے کے سات سو سال بعد تک لندن کی کسی سڑک پہ ایک لیمپ تک نہ تھا۔ قرطبہ میں ستر لائبریریاں تھیں۔ خلیفہ الحکم کی لائبریری میں پانچ لاکھ کتابیں تھیں۔ المنصور نے باون لڑائیاں لڑیں اور ہر مرتبہ فتحیاب ہوُا۔ عیسائی یورپ کے تمام ممالک اپنے سفیر یہاں بھیجنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ڈوزی لکھتا ہے کہ ان دنوں اندلس میں تقریباً ہر شخص پڑھ لکھ سکتا تھا، عیسائی یورپ میں صرف گنے گنائے پادری یہ دعوےٰ کر سکتے تھے۔ اندلس کی عورتیں آزاد

تھیں اور بغیر نقاب کے بلا روک ٹوک باہر نکلتیں۔ ان میں سے بیشتر نے حکومت کے ذمہ دار عہدے سنبھال رکھے تھے۔

آٹھویں صدی سے تیرھویں صدی تک دنیا بھر میں عربی بولنے والے ہی وہ واحد لوگ تھے جنھوں نے تہذیب و تمدن کی شمع تھامے رکھی۔ یہ روشنی مسلسل ہو کر مغربی یورپ پہنچی اور تحریک احیائے علوم کا باعث بنی۔

ہسپانیہ کے عرب بڑے مہذب تھے۔ بارھویں صدی میں مراقش سے کاغذ سازی کی صنعت ہسپانیہ میں آئی، تیرھویں صدی میں اسے ہسپانیہ سے اٹلی لایا گیا، یورپ پر عربوں کا یہ سب سے بڑا احسان ہے۔

سولھویں صدی تک پیرس کی یونیورسٹی میں طب کے طلباء کو بارہ کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ یہ سب عربی کتابوں کے ترجمے تھے۔

یونانی ادب ہم تک عربوں کی وساطت سے پہنچا۔

اب بھی ابن رشد Averroes کا ذکر فلسفے کی ہر کتاب میں ہوتا ہے، اشبیلیہ کا ابن ظہر Avenzoar۔ عظیم شاعر، فلسفی، نثر نگار، سیاستدان ابن حزم — اور مشہور سرجن ابو القاسم جس کی تقلید یورپ میں صدیوں تک ہوئی۔

یہاں سوشلزم صحیح معنوں میں رائج تھا۔ المنصور پہلے کلرک تھا، ترقی کر کے حکمران بن گیا۔ یہاں مفتوحہ عیسائی مطمئن تھے، ہر شہر میں ان کے گرجے تھے۔ ان کے لئے قانون ان کا اپنا تھا۔ ان کے جج اپنے تھے۔ ہسپانیہ کے سفیر اکثر عیسائی ہوا کرتے۔ عبدالرحمٰن سوئم

کا حفاظتی دستہ بارہ ہزار عیسائیوں پر مشتمل تھا۔

نفاست اور نستعلیق پن میں مسجد قرطبہ کا مقابلہ قدیم یونانی عمارات سے کیا جا سکتا ہے۔ کوئی اور طرزِ تعمیر ایسا نہیں جو ایسے لطیف تاثرات پیدا کرتا ہو۔

گاتیر جب یہاں آیا تو ستونوں اور خوشنما محرابوں کے جھنڈ کو دیکھ کر اسے عرب کے نخلستان یاد آئے اور وہ محبت جو عربوں کو درختوں سے رہی ہے، اسے یوں محسوس ہوا جیسے راتوں رات سنگِ مرمر کا جنگل کا جنگل اُگ آیا ہے۔ نو سو نازک ستون (جو کبھی بارہ سو تھے) جنھیں کارتھیج، روم اور بازنطینی سلطنت سے لایا گیا۔ ہر ستون سے دو محرابیں اُٹھتی ہیں، پھر اوپر دو محرابیں ——

ان محرابوں پہ سُرخ نقوش ہیں۔ جدھر نظر جاتی ہے ستونوں کی قطاریں اور محرابوں کے حاشئے نظر آتے ہیں۔ ستون اتنے نازک ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ تیز ہوا چلی۔ تو سب کچھ گر پڑے گا۔ یقین نہیں آتا کہ بارہ سو سال سے یہ عبادت گاہ جوں کی توں کھڑی ہے۔ عیسائی فاتح اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اسے تباہ نہیں کیا۔ لیکن اس میں گرجا تعمیر کر دیا۔ ہٹن کو اس حسین عمارت کے شکستہ قلب میں یہ گرجا ایسا لگا جیسے ایک استغراق و دعا میں ایک گستاخ قہقہہ۔

ان دنوں ہر دروازے پر ایک چھوٹا سا گرجا ہے۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ فرانکو مسجد کو پرانی حالت پہ لانا چاہتا ہے۔ مدینۃ الزہرا بھی از سرِ نو تعمیر ہو گا۔

"یہاں وہی ہوا جو سینٹ صوفیہ میں ترکوں نے کیا۔ میں رومن کیتھولک ہوں لیکن میری خواہش ہے کہ یہاں سے گرجے ہٹا دیئے جائیں۔ ستون دوبارہ نصب کئے جائیں

ہسپانوی رگوں میں عربوں کا خون ہے ۔۔۔ یہ مسجد ہماری قومی یادگار ہے" گائیڈ کہہ رہا تھا

قرطبہ سے دس میل دور مدینۃ الزہرا کے کھنڈرات ہیں جسے ہسپانیہ کا پامپی آئی کہا گیا ہے۔ اسے خود بربروں نے تباہ کیا۔ فرانکو کے انجینئر اسے دوبارہ تعمیر کر رہے ہیں۔

ہسپانیہ سے ہم اداس ہو کر لوٹے۔

سان سبستیان پر فرانس میں داخل ہوئے تو میرا دوست لین پول کی کتاب کے یہ فقرے سنا رہا تھا۔ "ہسپانیہ سے عرب کیا گئے سونے کی چڑیا اڑ گئی۔ مستعار شدہ روشنی سے یہ ملک کچھ دیر جگمگایا، پھر اسے ہمیشہ کے لئے گہن لگ گیا۔"

واپس اڈنبرا پہنچا، برفباری ہو رہی تھی، یخ کر دینے والی سردی تھی اور تند ہوا جو غالباً سیدھی قطب شمالی سے آرہی تھی۔ ایک ہم وطن نے فون کیا ۔۔۔ "سنا ہے آپ ہسپانیہ گئے تھے۔"

"جی ہاں۔"

"میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کب ؟"

"کل جمعہ ہے آپ میرے ساتھ نماز پڑھئے۔"

میں گیا، نماز کے بعد انھوں نے فرمایا "میں بھی ہسپانیہ دیکھنا چاہتا ہوں، بڑا

اچھا اسلامی ملک ہے۔"

میں نے انھیں بتایا کہ ہسپانیہ اسلامی ملک نہیں ہے تو انھوں نے فوراً ارادہ تبدیل کر دیا۔

ہر روز بارش ہوتی، ہر روز لیکچر ہوتے۔ دن رات بجلی کی روشنی میں پڑھائی ہوتی۔ — لیکن یہ خوشی تھی کہ تین مہینے کے بعد ایسٹر کی چھٹیاں ہوں گی۔ شام کو تھک کر آتا تو نقشے دیکھتا اور نئے سفر کا پروگرام بناتا۔ ایک ایک دن گننے کے بعد انتظار ختم ہوا اور تعطیل شروع ہوئی۔

میں پھر رودبارِ انگلستان عبور کر رہا تھا۔ برساتی کی دونوں جیبیں نقشوں اور گائیڈ کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس مرتبہ میں سیدھا FRENCH RIVIERA پہنچا۔

نیس میں خوشگوار دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں دن بھر بحیرۂ روم کے ساحل پر بیٹھا لہریں گنتا رہا۔

برطانیہ یورپ کے اس حصے سے بہت مختلف ہے۔ وہاں مٹیالے رنگوں کے ڈھیلے ڈھالے لباس نظر آتے ہیں۔ غذا کے جزو وہی ہیں لیکن باورچی خوب ستیاناس کرتے ہیں، لوگ پھیکے، بدمزہ کھانے کو چٹخارے لے لے کر کھاتے ہیں۔ فش اینڈ چپس کے ساتھ ساتھ انگریز تلخ اور کسیلی بئیر کے گھڑے کے گھڑے پی جاتے ہیں۔ ناگوار

اور تیز قسم کی دھنوں پر لڑکیاں آدھی رات تک پریڈ کرتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ رقص کر رہی ہیں۔ لیکن یہاں دیدہ زیب چست لباس ہیں، کلاسیکی موسیقی، لذیذ غذا اور خوش رنگ شراب۔ وہاں اگر کوئی کہے کہ سٹیشن تک صرف پندرہ منٹ کا راستہ ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اگر سرپٹ بھاگتے ہوئے گئے تب پندرہ منٹ میں پہنچو گے۔ یہاں سو گز چلنے میں آدھ گھنٹہ لگتا ہے۔ وہاں ہر چیز کی جلدی ہے۔ انگریز کا ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔ وہ زمین دوز ریل میں چالیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے جا رہا ہے۔ بار بار گھڑی دیکھتا ہے۔ بھاگ کر بس پکڑتا ہے۔ پھر ایک ٹرین میں سوار ہوتا ہے اور اس ساری بھاگ دوڑ کے بعد چپ چاپ آدھے میل لمبے کیو میں کھڑا ہو جاتا ہے — فلم یا میچ دیکھنے یا کھانا کھانے کے لئے۔ ممکن ہے کہ سڑک پر دوڑتے ہوئے انگریز کو دفتر پہنچنے کی جلدی ہے۔ یا شاید اس نے کسی کو ملاقات کا وقت دے رکھا ہے۔ وہ دونوں کہیں شراب پئیں گے یا کتوں کی دوڑ پر شرط لگائیں گے، یا وہ محض اس لئے بھاگ رہا ہے کہ باقی سب انگریز بھی بھاگ رہے ہیں۔

لیکن یہاں کسی چیز کی جلدی نہیں — یہاں اگر کسی نے پانچ منٹ بچا بھی لئے تو بیکار رہے۔ بھلا وہ ان پانچ منٹوں کا کرے گا کیا۔

وہاں افراتفری سی رہتی ہے۔ بسوں اور ٹرینوں میں مرد بیٹھے ہوتے ہیں، عورتیں کھڑی ہیں۔ اکثر مرد جیب سے اخبار نکال کر چہرے کے سامنے کر لیتے ہیں — وہ عورتوں کو کھڑا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ میں اکثر کسی عورت کو جگہ دینے کے لئے اٹھ

کھڑا ہوتا، مرد بڑے تعجب سے میری طرف دیکھتے۔ ایک صاحب کہنے لگے ۔۔
"تمھیں کام پر جانا ہے، بار بار اٹھ کر اپنی جگہ لڑکیوں کو بٹھاتے رہے
تو تھک جاؤ گے ۔"

ایک دن ایک بوڑھا جو فلسفی معلوم ہوتا تھا۔ بولا۔ "سر والٹر ریلے! شولری کے دن بیت چکے، اب عورت مرد برابر ہیں۔ بلکہ یہاں سولہ سترہ لاکھ عورتیں فالتو ہیں ۔۔ ہمارا اُن کا مقابلہ ہے ۔۔ اگر تم چوکنے نہ رہے تو کسی دن ایک عورت کرسی سے تمھیں اٹھا کر تمہارا کام خود سنبھال لے گی ۔"

یہاں ملتے وقت مرد جھک کر عورت کا ہاتھ چومتے ہیں۔ آداب محفل پر بڑی سنجیدگی سے عمل کیا جاتا ہے ۔ لیکن یہاں غربت ہے، سستی ہے اور بیزاری ہے۔

کرائے کی کرسی پر میں دن بھر سمندر کے کنارے بیٹھا لوگوں کو دیکھتا رہا۔ اور لوگ مجھے دیکھتے رہے۔

مانٹی کارلو کا مشہور قمار خانہ دور سے مسجد معلوم ہوتی ہے۔ سبز مینار اور گنبد۔ لیکن رات کو کچھ اور ہی سماں ہوتا ہے۔ ہر روز انسانی رجائیت کے اس مندر میں لوگ اُمیدیں لے کر آتے ہیں۔ لیکن اس کا وجود ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ زیادہ لوگ ہارتے ہیں۔

Cannes میں دکانوں پر بڑی بڑی ہستیوں کی نہایت عجیب و غریب

تصویریں لگی ہوئی ہیں ـــــ ریٹا ہیورتھ سمندر میں نہاتے ہوئے ـــــ بھویں غائب ہیں، اور میک اپ اترا ہوا، چہرے پر طرح طرح کے نشان ـــــ کوئی قسم کھائے تب بھی اعتبار نہیں آتا کہ سامانِ آرائش سے اتنی کایا کلپ ہو سکتی ہے۔ فاروق نے سمندر میں غسلِ صحت کرتے ہوئے بکینی سوٹ پہنا ہوا ہے۔ اس برائے نام لنگوٹ میں فربھی پوری شان و شوکت سے نمایاں ہے۔

کھانے کی میز پر سامنے ایک ادھیڑ عمر کی خاتون پہلی شام کو دیکھتی رہتی ہیں، دوسری شام کو مسکراتی ہیں۔ میں پاس جا بیٹھتا ہوں۔ ان کے ساتھ ان کی لڑکی بھی ہے۔

"آپ کونسی زبان سمجھتے ہیں"؟ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا

"وہی جو آپ بول رہی ہیں ـــــ"

"معافی چاہتی ہوں، بغیر تعارف کے مرد سے عورت کا بات کرنا، آداب کے خلاف ہے۔ لیکن آپ تنہا بیٹھے تھے سوچا کہ اجنبی ہوں گے، چنانچہ میں نے بلا لیا ـــــ"

ان کا جی باہر جانے کو چاہ رہا تھا۔ کچھ دیر ضبط کیا۔ آخر کہہ ہی دیا۔

"ہم دونوں اکیلی ہیں، اس طرح ہمارا باہر نکلنا اچھا نہیں لگتا۔ آپ ہمیں نائٹ کلب لے چلیں تو ہم مشکور ہوں گے ـــــ یہ میری بیٹی ہے۔ ہیلن ان سے گفتگو کرو۔"

ہیلن حسین تھی۔ لیکن بے حد اداس۔ مادام کا خاوند جنوبی فرانس کا مشہور ڈاکٹر تھا دونوں سیر کرنے نیس آئی تھیں۔

رقص کرتے ہوئے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ ہیلن اب رو دے گی۔

"ٹرائے کی ہیلن اداس کیوں ہے ؟"

پھر ایک غم آمیز مسکراہٹ لبوں پر آئی — "جی نہیں اُداس تو نہیں ہوں"۔

واپسی پر مادام نے ایک طرف لے جاکر بتایا کہ ہیلن عارضۂ عشق میں بُری طرح مبتلا ہے اور غلطی سے ایک ایسے لڑکے پر عاشق ہو گئی ہے جو بیک وقت چھ لڑکیوں پر عاشق ہے۔ تین سے منگنی کرا چکا ہے، دو سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور افواہ ہے کہ اُس کا ایک بچہ بھی ہے۔ سخت نامعقول قسم کا آدمی ہے، کام وام کچھ نہیں کرتا دن بھر ڈنڈے بجاتا ہے۔

"میں تم سے درخواست کرتی ہوں — میری مدد کرو گے ؟"

"فرمائیے —"

"اس کی توجہ اُدھر سے ہٹا دو۔ مہینوں کے بعد یہ آج مسکرائی ہے محض اسی لئے اسے یہاں کھینچ کر لائی ہوں کہ کسی طرح اُسے بھول جائے —"

"مادام — مجھے اپنے غم ہی نہیں چھوڑتے — اور پھر میں یہاں صرف چند دنوں کے لئے ہوں"۔

"مجھے مایوس مت کرو۔ میرا خاوند اور میں نہایت غمگین ہیں — ہماری مدد کرو"۔ مادام رونے کی تیاریاں کرنے لگی۔

"اچھا! — اچھا!" میں نے جلدی سے کہا۔

اگلے دن ہم تینوں سیر کو گئے۔ موٹر بوٹ لے کر اُن جزیروں کی سیر کی جہاں

Dumas کے کردار قید رہے تھے۔ پھر سب سے اونچی چوٹی پر چڑھ گئے۔ موسم صاف تھا — دور سمندر میں ایک دھبہ نظر آ رہا تھا۔

"ہیلن وہ دیکھو جزیرہ کارسیکا — نپولین کا وطن — یہاں عربوں کی اولاد اب تک آباد ہے، لوگوں کا خیال ہے کہ نپولین کی رگوں میں بدوؤں کا خون تھا۔"

فرانس کے سب سے بڑے ہیرو کے متعلق یہ سن کر ہیلن نے احتجاج کیا۔

"بھئی نپولین تمہارا ہی تھا۔ لیکن مورخ کہتے ہیں کہ اس کے خون میں آمیزش تھی۔"

شام کو نائٹ کلب میں مادام ہم دونوں کو چھوڑ کر خود بوڑھوں کی محفل میں جا بیٹھی۔

"کیا وہ اب بھی تم سے ملتا ہے؟"

"نہیں بات تک نہیں کرتا۔"

"اور تمھیں اب بھی پسند ہے؟"

"ہاں۔"

اس کے رخسار پر راکھ کا چھوٹا سا ذرہ تھا جسے میں نے انگلی سے ہٹا دیا۔ اس کی آہیں تھیں کہ ختم ہی نہ ہوتی تھیں۔

"ناچنا ہے تو سیدھی طرح ناچو ورنہ جاؤ اپنی امی کے پاس۔"

"پہلے میں اسے بھلا لوں — پھر —"

"اچھا جلدی کرو — تمھیں آدھ گھنٹہ دیتا ہوں — پھرتی سے بھلا دو۔"

وہ ہنسنے لگی۔ ہیلن کو بشاش دیکھ کر مادام کی باچھیں کھل گئیں — "یہ مدتوں کے

بدہضمی ہے۔ اسے باہر لے جاؤ سمندر کے ساحل پر۔'

ہم سمندر کے کنارے ٹہل رہے تھے۔ پھر اس عاشقِ جانباز کا ذکر چھڑ گیا۔

"تم نے جس انداز سے اس کی تعریفیں کی ہیں۔ میں بھی اس پر عاشق ہو گیا ہوں، اب ہم دونوں رقیب ہیں، آؤ سمندر میں کنکر پھینکیں، جو دُور پھینکے گا وہی جیتے گا۔"

ہم کنکر پھینکنے لگے۔

"تم جان بوجھ کر ہار رہے ہو۔" وہ مچل گئی

"نہیں! میں اس بُتِ طنّاز کو جیتنے کی پوری کوشش کر رہا ہوں۔"

"کہاں ہے پتھر؟ دکھاؤ اپنا ہاتھ۔"

میں نے دوسرا ہاتھ دکھا دیا

"تم وائلن بجاتے ہو؟"

"کیوں؟"

"یہ تو آرٹسٹ کی انگلیاں ہیں ـــ"

"تمھیں وائلن پسند ہے؟"

"بہت، اُس کا وائلن بجانا ہی تو مجھے پسند آ گیا تھا۔"

"شاید تمھیں علم نہیں کہ وائلن کے تار بلّی کے پوست سے بنتے ہیں اور اس کے گز میں گھوڑے کی دُم کے بال ہوتے ہیں ـــ غالباً تمھیں جانور پسند ہیں۔"

"ہاں۔"

"تبھی اُسے پسند کرتی ہو — چلو واپس چلیں۔"

"نہیں — یہاں بیٹھیں گے۔"

ہم برساتی بچھا کر بیٹھ گئے۔

"یہ لہریں کتنی اچھی لگ رہی ہیں، خصوصاً ان کا جھاگ۔"

"ان لہروں کے پیچھے تم سے بڑے مگرمچھ تیر رہے ہیں۔"

مگرمچھ سے ڈر کر اس نے میرا بازو تھام لیا۔

"مجھے سپاہی بہت پسند ہیں۔ لیکن کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ مسافر ہوتے ہیں اور چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔"

"مگر جو سپاہی نہیں ہوتے وہ کہیں بھی نہیں جاتے، ہمیشہ وہیں کے وہیں رہتے ہیں۔"

"لیکن سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔"

"انھیں ہونا بھی چاہئے۔"

"اپنے وطن میں تمھاری کوئی محبوبہ ضرور ہوگی — ہے نا؟"

"میرا وطن ہر جگہ ہے — میرا وطن کرۂ ارض ہے اس لئے کہ میں کسی دوسرے سیارے تک نہیں پہنچ سکتا۔"

"اور محبوبہ؟"

"سپاہی کی محبوبہ نہیں ہوتی — اور اتنی چھوٹی لڑکیوں کو ایسے وقت باہر نہیں ہونا چاہئے۔"

"تم مجھے چھوٹی سی لڑکی سمجھتے ہو۔ میں انیس برس کی ہوں۔"

"میں بھی اُنیس برس کا ہوں۔"

"اُنیس برس؟"

"انیس برس اور تقریباً ڈیڑھ سو مہینے۔"

ہم ریت پر چلنے لگے۔ وہ جس طرف ہوتی وہیں برساتی اُسی بازو میں تھام لیتا۔

"یہ برساتی ہم دونوں کے درمیان ہمیشہ رہتی ہے۔"

اگلی شام کو ہم پھر وہیں بیٹھے تھے۔ ہیلن بولی — "کل ہم دونوں مینٹون چلیں گے۔"

"نہیں — اب مجھے اٹلی جانا ہے۔"

وہ خاموش ہو گئی۔

"اگر تم اداس ہو ئیں تو میں سمجھوں گا کہ تم بدستور اُس پر عاشق ہو۔"

"نہیں۔ بخدا اب مجھے اس کی اتنی بھی پرواہ نہیں — سچ مچ —"

"ہیلن — صرف چند دنوں میں تمہاری پہلی محبت تمام ہوئی۔ شاید یہ جذبہ اتنا شدید نہ تھا۔ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ اب تم خوب ہنسو کھیلو اور اگلی مرتبہ کسی کام کے آدمی سے محبت کرنا بلکہ بہتر یہی ہو گا کہ خود کسی پر عاشق نہ ہونا، دوسروں کو بیشک عاشق ہونے دینا۔ ورنہ میں جہاں بھی ہوا خفا ہو جاؤں گا۔"

"مگر تم کہاں ہو گے؟"

میں نے ملکِ خدا تنگ نیست پائے گدا لنگ نیست کا ترجمہ کر کے سنایا جو اچھی طرح

نہ ہو سکا۔ ہیلن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"تم فرانس پھر آؤ گے نا؟"

"شاید۔" کہہ کر میں نے 'وارث شاہ تیرے ساڈے حشر میلے' کا ترجمہ کرنے کی کوشش نہ کی لیکن نتائج خاطر خواہ نہیں نکلے۔

"تمہارا بازو کہاں ہے؟ یہ برساتی پھر کہیں سے آگئی۔"

"میں۔ ہیلن۔ اور برساتی —— یہ ازلی تکون ہے۔"

فرنچ رویرا سے اٹلی کو سڑک بحیرۂ روم کے ساحل کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ ایک طرف چمکدار نیلا سمندر ہے دوسری طرف باغوں سے لدی ہوئی پہاڑیاں جن کی چوٹیوں پر قدیم رومن وضع کے مکان بنے ہوئے ہیں۔ یہ ساحل پھولوں سے پٹا پڑا ہے۔ جگہ جگہ ستونوں سے لپٹی ہوئی بیلیں، سیب اور شفتالو کی نوخیز کلیاں، نارنگیوں کے کنج اور سرو کے درخت۔

دھوپ میں نیلے پیلے آبی سرخ سفید گلابی پھول چمکتے ہیں، سمندر سے ہوا کے خنک جھونکے آتے ہیں تو پودے جھومتے ہیں۔

ایک لمبی سی سرنگ آئی تو میں نے دیکھا کہ میرے ساتھ ایک ہم سفر بھی ہے۔ ہم باتیں کرنے لگے کہ بحیرۂ روم نے دنیا کی تاریخ میں کتنا اہم حصہ لیا ہے۔ اس کے کناروں پر تہذیبیں ابھری اور مٹی ہیں۔ یہ دنیا کا حسین ترین خطہ ہے۔ میرا پروفیسر کہا کرتا کہ فنونِ لطیفہ

کی تخلیق پر ماحول کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ اس کے لئے یا تو پہاڑ ہونے چاہئیں یا سمندر کا ساحل اور یا پھر صحرا۔ میدان بالکل بیکار ہیں۔

وہ اداس ہو گیا ۔۔۔ "یہ علاقہ کبھی علوم و فنون کا گہوارہ تھا۔ دنیا بھر کو ہم نے جینا سکھایا۔ آرٹ ۔ ادب ۔ رزم ۔ سیاست ۔ ہم ہر بات میں میرِ کارواں تھے۔ لیکن اب اس تیز مشینی دور میں ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ ان ملکوں میں اب سوائے افلاس، غلامی اور سیاسی بے چینی کے اور کچھ نہیں رہا۔"

میں نے موضوع بدل دیا اور اسے اپنی سیاحت کے قصے سنائے ۔۔۔ دجلہ و فرات کی وادی پر ہوائی جہاز سے اڑتے وقت عجیب نظارے دیکھنے میں آتے ہیں، صبح اور سہ پہر کو جب سائے لمبے ہوں تو بلندی سے پرانے شہروں نہروں اور سڑکوں کے نشان نظر آتے ہیں ۔۔۔ اس اجاڑ ویرانے میں کبھی گنجان آبادی تھی۔ بحیرۂ قلزم سے بحیرۂ روم جاتے ہوئے میں نے وہ خلیج بھی دیکھی تھی جہاں مدّوجزر سے بڑی نمایاں تبدیلی آتی ہے پانی کی سطح نیچی ہوتی ہے تو اس کنارے سے اس کنارے تک ایک پایاب راستہ بن جاتا ہے۔ غالباً اسی جگہ سے حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر گذرے ہوں گے، پھر فرعون کے گذرتے وقت پانی پرانی سطح پر آگیا۔

میں اس علاقے میں بھی رہ چکا تھا۔ جہاں آتش پرستوں کے پیغمبر زرتشت نے تبلیغ شروع کی۔ وہاں اتنی سردی ہوتی ہے کہ آگ کے بغیر جینا مشکل ہے۔ اس خطے کے لئے اس سے بہتر کوئی اور مذہب نہیں ہو سکتا لیکن صحرا کے باشندوں سے یہ توقع

رکھنا کہ وہ رات دن آگ جلا کر بیٹھے رہیں زیادتی ہے۔

"لیکن عیسائیت یہاں سے پھیلی اور دُنیا بھر نے اسے قبول کیا۔ اگرچہ وہ عیسائی جو مذہب کی پرواہ نہیں کرتے عروج پر ہیں۔ اس لئے کہ روحانیت کی جگہ مادیّت نے لے لی۔ سارے مذہب انسان کو سدھار رکھنے کے لئے ظہور میں آئے۔ اُسے دہشتناک چیزوں سے ڈرایا گیا۔ خوشنما چیزوں کا لالچ دیا گیا۔ لیکن اب انسان کو ڈر ہے نہ کوئی لالچ ۔ اِسی دنیا میں اُسے ہولناک چیزیں بھی مل جاتی ہیں اور طربناک بھی۔ دانتے نے دوزخ کی جو تفصیل دی ہے اُسے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی ہوگی ۔ جیل خانوں، ہسپتالوں اور جنگ کے میدان میں ایسے نظارے عام ہیں۔ شاید بہشت کو بیان کرنے کے لئے اُسے تخیّل پر زور ڈالنا پڑا ہو۔ لیکن بیسویں صدی میں تو ایسی جگہیں بھی ہیں جہاں بہشت کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں۔"

جنوا پر اُسے اُترنا تھا۔ کولمبس اسی شہر کا باشندہ تھا۔

"کولمبس کو تو آپ جانتے ہوں گے؟" اس نے پوچھا

"ان کے متعلق سُنا بہت کچھ ہے، کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ویسے میرے جاننے والوں میں سے کئی کولمبس کی طرح ہیں۔ کہیں جا رہے ہوں تو منزل معلوم نہیں ہوتی، پہنچ کر یہ خبر نہیں کہ کہاں پہنچے ہیں ۔ واپس آکر یہ علم نہیں کہ کہاں گئے تھے۔"

وہ ہنس پڑا۔

جہاں فرانسیسی ہمیشہ آئن سٹائن کی تھیوری پر غور کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اطالوی

مسکراتے ہیں، ہنستے ہیں، گاتے ہیں (یہ گانا صرف دُور سے بھلا معلوم ہوتا ہے) بے تکلف لوگ ہیں۔ اگر کسی کی زُلفیں پسند آگئیں تو اسے ہاتھ سے چھو کر بتائیں گے کہ یہ زُلفیں اچھی ہیں۔ بڑے اطمینان سے کندھے پر، کہنی یا بازو رکھ کر کھڑے ہو جائیں گے۔ شاید اس توقع پر کہ دوسرا شخص بھی ان کے کندھے پر کہنی ٹیک دے یا غالباً بغلگیر ہو جائے۔ لیکن اگر وہ ہاتھ ہٹا دے تو بجائے معافی مانگنے کے حیران ہوتے ہیں۔

اطالوی رویرا میں بحیرۂ روم کے خطّے کی آب و ہوا کے جلوے نظر آتے ہیں۔ میرا پروفیسر کہا کرتا کہ یہ ایسی آب و ہوا ہے جو پندرہ سے ساٹھ سال کے مرد کو سائنٹ لکھنے پر اُکساتی ہے — پروفیسر ایّامِ جوانی میں یہاں اکثر آیا کرتا تھا — "آج کل کے نوجوان کیسے ہو گئے ہیں۔ جب میں جوان تھا تو آس پاس کی سب لڑکیاں شام ہی سے گھروں میں قفل لگا لیا کرتیں —" یہ کہتے ہوئے اس کی بوڑھی آنکھوں میں ایسی چمک آجاتی کہ میں اپنے دل میں یہ مصرعہ پڑھتا — ننگِ پیری ہے جوانی میری۔

فلارنس کے گائیڈ نے جلدی جلدی یہ سبق پڑھ کر سنایا — "فلارنس ہی ایسا منفرد شہر ہے جس کی خاک سے بے شمار عظیم آدمی اُٹھے۔ دُنیا بھر میں یہ فخر سوائے ایتھنز کے کسی اور شہر کو میسّر نہیں ہوا — مائیکل اینجلو، باٹی چیلی، بوکیکیو، دانتے، گلیلیو، ڈاونچی، لیونارڈو ڈا ونچی؟ بن ڈنی تو، مشیا دلی اور میڈیچی فیملی کے افراد۔ یہاں نشاۃ ثانیہ نے جنم لیا، میڈیچی فیملی نے فن کاروں کی سرپرستی کی، یہاں چمڑے اور شیشے کا کام نہایت عمدہ ہوتا ہے۔

اس میں بھی میڈیچی فیملی کا ہاتھ ہے — اس پل پر دانتے نے بیترس کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ — وہ سامنے میڈیچیوں کا مقبرہ ہے —"

ہمارا امریکن ساتھی ضبط نہ کر سکا — "آج یا تو میڈیچی فیملی رہے گی یا میں —"

اگلے روز گائیڈ ہمیں مائیکل اینجلو کا ڈیوڈ دکھانے لے گیا — وہاں سے آرٹ گیلریاں —

"یہ سب میڈیچی فیملی کی فیاضی کا نتیجہ ہے —" وہ بولا۔

امریکن چلایا — "میڈیچی فیملی میرے اعصاب پر سوار ہو گئی ہے، خدایا اس فیملی نے میری زندگی تباہ کر دی، اپنے وطن پہنچ کر میں راتوں کو ہڑبڑا کر اٹھوں گا ہمیرے پڑوسی یہ چیخیں سنیں گے — میڈیچی فیملی! میڈیچی فیملی!"

فلارنس کے لئے یہ فارمولا استعمال ہو سکتا ہے:۔

فلارنس + میڈیچی فیملی = صفر

فلارنس — میڈیچی فیملی = ایک خوشنما شہر

کاش کہ وہاں کے گائیڈ اسے استعمال کیا کریں۔

وینس میں ایک موٹر بھی نظر نہیں آتی۔ سڑکوں کی جگہ نہریں ہیں جن میں شکارے چلتے ہیں۔ یہاں کی مال روڈ ایک اچھا خاصا دریا ہے۔ وینس سمندر میں ٹاپوؤں کا ایک جھنڈ ہے جس پر بڑی مشاقی سے لکڑی اور پتھر بچھا کر مکانوں کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

سنگِ مرمر کا یہ شہر کبھی عجوبۂ روزگار تھا۔ ڈیڑھ ہزار سال پہلے یہاں پہلی ری پبلک وجود میں آئی۔ سب سے پہلا اخبار یہاں جاری ہوا۔ سب سے پہلا پبلشر بھی یہیں آباد تھا۔ ڈاک کا انتظام پہلے پہل یہیں سے شروع ہوا۔

یہ رسوائے عالم کینیز آنووا کا شہر ہے۔ یہاں شیکسپیئر کی ڈیسڈیمونا رہتی تھی۔ اُس کا مُوَر عاشق اوتھیلو (جس کا اصلی نام غالباً عطاء اللہ ہوگا) اس سے ملنے ضرور آتا ہوگا۔

سان مارکو کے چوک میں کوئی ڈیڑھ ہزار کبوتر ہر وقت موجود رہتے ہیں، یہ کبوتر بڑے بے تکلف ہیں۔ سر یا کندھے پر اس طرح آ بیٹھتے ہیں کہ لٹھوں سے پیٹو تو نہیں اُترتے۔

سان مارکو کوئی بہت دور پہنچے ہوئے بزرگ تھے جو شاید شہید ہوئے ہوں گے کیونکہ اس زمانے میں پہنچے ہوئے بزرگوں کے انتقال کا یہی فیشن تھا۔

ڈوگے محل میں نہ پُل ہے جسے بائرن نے آہوں کا پل کہا ہے۔ لیکن یہ آہیں عاشقوں کی نہ تھیں (جیسا کہ لڑکے لڑکیاں سمجھتے ہیں) بلکہ مجرموں کی تھیں۔

میں ایک جگہ کھڑا سوال نکال رہا تھا کہ اتنے لیروں کے کتنے روپے ہوئے دو لڑکیاں آئیں ـــ

"آپ نیس میں ہمارے ساتھ تھے۔"

"جی ہاں ـــ مجھے یاد ہے۔"

"دو اطالوی ہمارا تعاقب کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے کل سے پریشان کر رکھا ہے قریب نہیں آتے۔ بس دُور سے گھورتے رہتے ہیں۔"

"تو ابھی اُنھیں بُلا لاتا ہوں۔ تعارف کرا دوں گا۔"

وہ ہنسنے لگیں۔ "ہم ان سے ملنا تو نہیں چاہتے۔ بس کسی طرح یہ دفع ہو جائیں۔"

"دکھایئے کہاں ہیں۔"

"وہ رہے۔"

دو پستہ قد لمبے لمبے بالوں والے موٹے تازے نوجوان چوروں کی طرح کھڑے تھے۔

"اب ہم ان کا تعاقب کریں گے۔"

ہم تینوں ان کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ لڑکیوں نے اپنا تعارف کرایا۔ ایک کا نام سوسن تھا یہ ڈچ تھی۔ دوسری غزالہ Giselle بلجیم کی تھی۔ دونوں جینوا میں اقوامِ متحدہ کے کسی دفتر میں کام کرتی تھیں۔

"بطورِ غزالہ کے تمھاری آنکھیں ہرن کی سی ہونی چاہئیں اور تمھیں تیز بھاگنا چاہئے۔"

ہم نے رفتار تیز کر دی۔ اطالوی فوراً فرار ہو گئے۔

"ہمیں اطالویوں سے بہت ڈر لگتا ہے، یوں گھورتے ہیں جیسے ابھی کھا جائیں گے کبھی ہم نے رات کو شکارے کی سیر نہیں کی۔ بڑا جی چاہتا ہے لیکن رات کو ڈر کے باہر نہیں نکلتے۔"

"آج شام کو میرے ساتھ چلئے۔"

آٹھ بجے سان مارکو کے چوک میں پہنچا تو وہاں صرف سوسن تھی۔

"غزالہ کہاں ہے؟"

"اس کے سر میں سخت درد ہے۔"

میں سمجھ گیا۔ تین کا ہندسہ اچھا نہیں ہوتا، اس لئے غزالہ ریٹائر ہو گئی۔

ہم شکارے میں نکلے۔ رات کا وینس دن کے وینس سے اس قدر مختلف ہے کہ پہچانا نہیں جاتا۔ چاندنی میں دھلی ہوئی عمارتیں، سبزی مائل سمندر، پانی میں روشنیوں کا مچلتا ہوا عکس جیسے لاکھوں ستارے ٹوٹ رہے ہوں۔

سوسن کو بائرن پسند تھا۔ وہ نظمیں سنانے لگی۔

"اگر تم مجھے ساتھ نہ لاتے تو میں کبھی یہ چاندنی اور سنگِ مرمر کا طلسم نہ محسوس کر سکتی۔ شاعر، ادیب، صناع، معمار ـــ ہر فن کار اپنے دل میں چھپی ہوئی کسک کا اظہار چاہتا ہے۔ جب معمار نے سمندر کی لہروں پر سنگِ مرمر سے مختلف شبیہیں ترتیب دیں تو اس کا پیغام وینس کی صورت میں ظاہر ہوا۔"

اگلے دن ہم اکٹھے سیر پر نکلے۔ گرجے میں طرح طرح کی چیزیں رکھی ہیں، یونانی مندروں کے ستون، مسجد کا چھوٹا سا گنبد۔ گائیڈ ہمیں بتا رہا تھا کہ وینس کے باشندے آرٹ کے اتنے دلدادہ تھے کہ جہاں کسی ملک میں کوئی نفیس چیز دیکھتے تو اسے اٹھا کر فوراً وینس بھیج دیتے۔ آرٹ کی خاطر لڑائی یا چوری سے بھی گریز نہ کرتے۔ ہر سال یہاں ایک طویل جشن منایا جاتا۔ آٹھ مہینوں تک خوب رنگ رلیاں ہوتیں۔

"بقیہ چار مہینے باشندے کیا کرتے ہوں گے؟" ایک طرف سے آواز آئی۔

"آرٹ کے نمونے چرانے نکل جاتے تھے۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔

دوسری شام کو سوسن کے سر میں سخت درد ہوا۔ چنانچہ عزالہ ساتھ گئی۔ اس نے پہلے تو بائرن کی شان میں گستاخانہ جملے کہے کہ اطالویوں کی طرح تعاقب کیا کرتا اور شادی شدہ خواتین کے پیچھے تو تیر کی طرح جاتا تھا۔ پھر یہ خوشخبری سنائی کہ وینس کی بنیادیں کمزور ہو رہی ہیں لکڑی گل چکی ہے۔ پل ہلتے ہیں، مکان آہستہ آہستہ بیٹھ رہے ہیں۔ یہ شہر سخت خطرے میں ہے۔

"دو تین دنوں تک تو شہر تباہ نہیں ہو رہا۔ میں پرسوں جا رہا ہوں۔"

"نہیں ابھی کئی سال لگیں گے۔ پتہ نہیں اطالوی اپنے شہروں کا ذکر کرتے وقت مرنے کا حوالہ کیوں دیتے ہیں۔ فلارنس دیکھئے اور مرجائیے۔ نیپلز دیکھ کر مرئیے۔ میرے خیال میں اس شہر کے لئے یہ فقرہ ہونا چاہئے۔ وینس سونگھئے اور مرجائیے۔"

کشتی چلانے والے کو جو ترنگ آئی اس نے گانا شروع کر دیا، اس کا منہ میرے دہنے کان سے تقریباً بارہ انچ کے فاصلے پر تھا۔ لہٰذا فوراً سگریٹ دے کر چپ کرایا۔ دو سگرٹوں کے بعد بھی جب وہ باز نہ آیا تو میں نے عزالہ سے جگہ بدل لی۔

روم میں جگہ جگہ رومیو ملتے ہیں۔

کلیسائے پطرس روم میں ہے بھی اور نہیں بھی۔ سٹیشن روم کا لگتا ہے لیکن ڈاک خانہ واٹیکن کا ہے۔ واٹیکن تیرہ ایکڑ جگہ کا نام ہے جو خود مختار ہے اور بیش قیمت نحائف

سے پٹا پڑا ہے۔ یورپ بھر کے شاہی مرید اپنے پیرِ اعلیٰ یعنی پوپ کو بڑی قیمتی چیزیں بھیجتے رہے ہیں۔ سیاح اکثر سوچتے ہیں کہ اگر اطالوی اپنے گرجوں سے سونے چاندی کے یہ تحفے نکال لیں تو اٹلی کا افلاس آج دُور ہو سکتا ہے۔

کولوزیم ایک قبرستان معلوم ہوتا ہے نہ جانے یہاں کتنے انسانوں کا خون بہا ہو گا لیکن رات کو یہ جگہ اور طرح کی معلوم ہوتی ہے۔ گمان تک نہیں ہوتا کہ کبھی یہاں لاکھوں خون کے پیاسے تماشائی جمع ہوتے ہوں گے اور جان لیوا مقابلوں میں شریک ہونے والوں کی یہ پکار اس عمارت میں گونجتی ہو گی۔ "اے شہنشاہ ہم جو کہ بہت جلد مرنے والے ہیں تجھے سلام کرتے ہیں۔"

سات پہاڑیوں کا پرانا روم تباہ ہو چکا ہے۔ کہیں کہیں کھنڈر رہ گئے ہیں۔ موجودہ شہر زیادہ پرانا نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے۔ ہر تاریخی عمارت کے ساتھ دو مذہبی میوزیم اور چھ گرجے بھی دیکھنے پڑتے ہیں۔

وہ میز اب بھی رکھی ہے جس پر حضرت عیسیٰ نے آخری کھانا کھایا۔ وہ سیڑھیاں بھی ہیں جن کو طے کر کے وہ صلیب تک پہنچے، لوگ ان سیڑھیوں پہ گھٹنوں کے بل چڑھتے ہیں اور دیکھنے والا ڈرتا رہتا ہے کہ یہ اب گرے اب گرے۔

اٹلی کو اپنے آرٹ پہ سدا فخر رہا ہے۔ "دنیا کی تخلیق" نقاشی کی زبردست مثال ہے۔ مائیکل اینجلو نے حضرت آدم و حوا کے ساتھ ساتھ خدا تعالیٰ کی تصویر بھی بنائی ہے۔ واٹیکن میں متبرک چیزوں کے علاوہ برہنہ مجسمے بھی ملتے ہیں۔ برہنہ تصویریں اور

مجسمے بنانا بڑا مشکل کام سمجھا جاتا تھا۔ انھیں وہی آرٹسٹ بنا سکتے تھے جو علم الابدان کے ماہر ہوں، جو اس علم سے ناواقف تھے وہ اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے انھیں کپڑے پہناتے تھے۔

تین دن میں گائیڈوں سے بچتا رہا۔ پیازہ وینیسا میں کھڑا تھا کہ ایک گائیڈ نے مجھے آلیا۔

"وہ دیکھئے۔ اس بالکنی سے مسولینی ہجوم کو مخاطب کیا کرتا تھا۔"

"جی ہاں"

"جب ہٹلر روم میں آیا تو بجلی کا ایک لیمپ بھی نہ جلا۔ لوگ مشعلیں ہاتھ میں لئے پھر رہے تھے۔ سارا شہر تاریک تھا، صرف مشعلوں کی روشنی تھی۔ ایسی رات پھر روم میں کبھی نہ آئے گی۔"

"روم میں کیا کسی شہر میں نہ آئے گی سوائے اڈنبرا کے۔"

"جولائی کا مہینہ جولیس سیزر کے نام پہ ہے۔"
"بالکل درست ہے۔"
"اور اگست شہنشاہ آگسٹس کے نام پر۔۔۔۔"

اگلی صبح اٹھا تو میری توبہ ٹوٹ چکی تھی۔ میں دوسرے سیاحوں کے ساتھ بس میں بیٹھا ہوا تھا اور گائیڈ ہمیں ہدایات دے رہا تھا۔ ایک جگہ بس رکی۔

"اتریئے!" گائیڈ نے ہمیں حکم دیا۔

ساتھ بیٹھے ہوئے بوڑھے امریکن نے اپنی بیوی سے پوچھا "اب یہ کیا دکھائے گا؟"

"حضرت موسیٰ کا مشہور مجسمہ" وہ بولی۔

بوڑھے نے کھڑکی سے ڈیڑھ دو سو سیڑھیاں دیکھیں جنھیں ہم سب کو طے کرنا تھا

اور سگار کا کش لگا کر بولا — "تم دیکھ آؤ۔ میرے خیال میں حضرت موسیٰ کے بغیر بھی گزارا ہو سکتا ہے"

نیپلز کے سٹیشن پر کوولا منتظر ملا۔ بازو پھیلائے آیا اور مشرقی انداز میں لپٹ گیا۔

"امی کو — امی کو" (میرے عزیز دوست) اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

دورانِ جنگ میں وہ اطالوی فوج میں تھا، افریقہ کے صحرا میں گرفتار ہوا۔ دو تین مرتبہ میں نے اس کا علاج کیا۔ پھر اتفاق سے میرا تبادلہ قیدیوں کے کیمپ کے ہسپتال میں ہو گیا جہاں وہ بھی تھا۔ اس سے دوستی ہو گئی۔ جنگ کے بعد اس نے اٹلی سے خط و کتابت جاری رکھی۔ نیپلز پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ کاؤنٹ ہے نصف سے زیادہ شہر کا مالک ہے۔

اس نے ایسی خاطر مدارات کی کہ الف لیلہ کی راتیں یاد آ گئیں۔ جنوں اور پریوں پر دوبارہ اعتقاد ہو گیا۔ نیپلز کی خوشنما خلیج کے کنارے چاندنی رات میں ایک مشہور فنکار نے پیانو پر مون لائٹ سوناٹا بجایا۔ آدھی آدھی رات تک بادبان والی کشتیوں میں سمندر کی سیر ہوتی، پھر محفلِ رقص و سرود جمتی — رات کو تین بجے سو کر صبح اٹھتا تو بالکل وہی بیزار موڈ ہوتا جو علی الصبح خروشچیف کا ہوتا ہوگا۔ ضیافتوں پر مجھے اطالوی لڑکیوں سے ملایا جاتا۔

ایک لڑکی کا نام Marisa تھا۔ میں نے کوولا کے کان میں کہا — "تم اتنے دن مشرق میں رہے اور مریضہ کے معنے نہ آئے۔ یہ لفظ بیماروں کے لئے استعمال ہوتا ہے"

دوسری سے تعارف ہوا — روزالبا۔ اس کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح تھا۔

"اس کے معنے تو ٹھیک ہیں نا؟" کوولا نے کان میں پوچھا

ایک نہائت مرنج و مرنجاں اور بیزار قسم کا آدمی ہمیں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا
ہم رقص کر رہے تھے اُس کی نگاہیں ہم پر تھیں — کچھ دیر کے بعد اُلجھن سی ہونے لگی۔

"کون ہے یہ؟"

"روزا لبا کا منگیتر — تم اس کی ذرا پرواہ نہ کرو۔ یہ ہمیشہ یونہی رنگ میں بھنگ ڈالتا ہے
روزا لبا اسے جوتی کی نوک پر نہیں لیتی۔"

وہ کاؤنٹس سے پوچھ رہی تھی کہ میرا قیام کتنا ہے۔ پانچ چھ روز سُن کر اس نے افسوس میں
سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو کہ بھلا پانچ چھ دنوں میں کیا ہو سکتا ہے۔

لکولا، کاؤنٹس، روزا لبا اور میں۔ چاروں اگلے روز باہر گئے۔ وِسوویس پہاڑ کے
دامن میں میرے دوست نے موٹر ٹھہرائی اور ہمیں دو بندوقیں دیں۔

"یہ کس لئے ہیں۔ ان سے ہم ایک دوسرے کو کیا کریں؟" میں نے پوچھا

"روزا لبا کو کبوتر کے شکار کا شوق ہے۔ جنگل میں جا کر شکار کھیلو۔ شام کو میں تمہیں لینے آؤں گا"
میں نے بہتیرا کہا کہ بھلا اطالوی کبوتروں نے میرا کیا بگاڑا ہے کہ میں انھیں کچھ کہوں لیکن
وہ ہمیں چھوڑ گیا۔ وہ میرے وطن کے متعلق سوال پوچھنے لگی۔ میں نے پاسپورٹ نکال کر دے دیا
کہ اس میں سب کچھ لکھا ہے۔ پڑھ لو تصویر دیکھتے ہی اِس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

"تم جنگ میں لڑے تھے؟"

"ہاں۔"

"تم نے کتنے اطالوی مارے؟"

"چھ سات تو گنے تھے۔ زخمیوں کی تعداد کا اندازہ نہیں۔"

غصے سے اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔

"تم لڑنا چاہتی ہو۔ یہ رہی بندوق۔ ورنہ تمھارا غصہ اس غریب منگیتر پہ اُترے گا۔"

منہ پھیر کر وہ دور جا بیٹھی۔

"اے وطن پرست حسینہ! پاسپورٹ کا دوسرا صفحہ بھی پڑھ۔ ڈاکٹر ہلاک نہیں کیا کرتے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اگر یہ علم ہوتا کہ یہاں کی لڑکیاں ایسی خونخوار ہیں تو کبھی اطالویوں کو نہ چھوڑتا۔"

"مجھے معاف کر دو۔ میرا منگیتر جنگ میں مارا گیا تھا۔"

"تمہارے کتنے منگیتر ہیں؟"

"اصلی منگیتر وہی تھا۔"

"تو گویا یہ اسسٹنٹ منگیتر ہے۔"

وہ مسکرانے لگی۔

"لیکن جنگ کو تم نے سنجیدگی سے ہرگز نہیں لیا۔"

"غالباً تم صحیح کہتے ہو۔ ہم آرٹسٹ ہیں سپاہی نہیں۔ پچھلی جنگ میں ہمارے ہاں دو فریق تھے۔ رجائی کہتے تھے ہم یہ جنگ ضرور ہاریں گے۔ قنوطی کہتے۔ درست ہے مگر کب؟"

ہم سرو کے درختوں کے جھنڈ میں بیٹھے تھے۔ خوشگوار دھوپ میں ساری وادی نکھری ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ سامنے نیلا سمندر تھا۔

"بارش تو نہیں ہو رہی جو برساتی پہن رکھی ہے۔"

"شاید ہونے لگے۔ میں قنوطی فریق سے ہوں۔"

"تم اسے ہر وقت ساتھ رکھتے ہو؟"

"اسی کو سیر کرانے کے لئے تو میں خود مارا مارا پھرتا ہوں۔ تم نے گونج سُنی؟" میں بظاہر چونکا ہو گیا۔

"نہیں تو—" وہ ڈر گئی۔

"یہ وسوویس کی گڑگڑاہٹ تھی۔ ابھی پہاڑ پھٹے گا اور لاوا بہنے لگے گا۔ وہ دیکھو ایک آدمی بھاگا جا رہا ہے۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی

"تم تو کبوتر دلی کا شکار کرتی ہو، ایک معمولی سے پہاڑ کی کیا وقعت ہے۔ ہم یہاں سے نہیں ہلیں گے۔"

کافی دیر کے بعد اُسے یقین آیا کہ گونج دونج کچھ نہ تھی۔

سورج ڈوبنے لگا تو آسمان سُرخ ہو گیا۔

اس نے برساتی پر اپنے نام کے پہلے حروف لکھے — "جب انھیں دیکھو گے تو روز آلیا یاد آجائے گی۔"

کمولا بہت دیر میں آیا۔ مجھے چھیڑنے لگا۔" اسے کیونکر رام کیا۔ یہ تو بے حد غصیل اور گستاخ لڑکی ہے۔"

" بزرگوں کی دعا ہے" میں نے جواب دیا

رات کو میں نے خواب دیکھا کہ سامنے روزآلبا کھڑی ہے۔ متناسب جسم، شگفتہ حسین چہرہ اور دلآویز مسکراہٹ۔ پھر جیسے اُس کا جسم بڑھنے لگا۔ بازو پھولتے گئے، گردن غائب ہوگئی، ایک ٹھوڑی کی جگہ دو ہوگئیں۔ وہ پھیلتی گئی حتّے کہ میٹرن معلوم ہونے لگی۔

صبح کمولا سے پوچھا۔ وہ بولا "یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ اطالوی سینورینا کے پاس سب کچھ ہے۔ حُسن۔ تمازت اور کشش۔ لیکن ان پر فربہی بہت جلد آتی ہے۔ شاید یہ زیتون کے تیل کا اثر ہے یا آرام پسند زندگی کا"

میں نے اُسے بتایا کہ یہاں کھانا بہت لذیذ ہے۔ سات کورس کا ڈنر۔ اس کے بعد بیرو چپکے سے پوچھتا ہے۔ کچھ اور لاؤں ؟

" لیکن شہروں کے باہر بڑی غربت ہے۔ ہم لوگ مفلس ہیں۔ ہمارے ہاں اتنی بھوک ہے پھر بھی عورتوں کی فربہی جوں کی توں ہے ــــ"

" افلاس کے لیے حکومت کچھ نہیں کرتی ؟" میں نے پوچھا

" کون سی حکومت ؟ ہر مہینے تو یہاں حکومت بدلتی ہے۔ فرانس کی طرح ہم بھی بار بار حکومت تبدیل کرتے ہیں تاکہ ہر شخص کو موقع مل سکے اور ری پبلک کے معنے ہر خاص و عام پر واضح ہو جائیں۔ ہماری کرنسی کی کوئی قدر نہیں۔ پاؤنڈ کے بیس پچیس لیرے ہوا کرتے تھے اب سترہ سو ہیں۔ بجائے بٹوے کے لوگ کلپ میں نوٹوں کو دبا کر رکھتے ہیں ــــ

لیروں کے ذکر پر مجھے کچھ تحفے یاد آگئے جنھیں میں خریدنا چاہتا تھا۔ لیکن اپنے

دوست کے سامنے خریدتے ہچکچاہٹ ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ قیمت آدا کرنے پر اصرار کیا کرتا۔ بہانہ کر کے میں دکان میں گھس گیا۔ باہر نکلتے وقت شاید دوسری گلی میں چلا گیا اور راستہ بھول گیا۔ کچھ دیر سڑک پہ چلا پھر کمولا کی آواز سنائی دی۔

"تم نے اتنی دور سے مجھے کیسے ڈھونڈ لیا؟"

"اطالویوں کے ہجوم میں تمہارا چہرہ اور کندھے دور سے نظر آجاتے ہیں۔ تم سوچتے تو ہوگے کہ یہ خوش باش اور آرام طلب قوم عظیم رومنز کی اولاد کیونکر ہو سکتی ہے۔ وہ رومن جو کبھی دنیا کے مالک تھے۔ مسولینی کو وہم تھا یا خوش فہمی وہ ہمیں پرانے رومن سمجھتا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایک انسان چند لوگوں کو تھوڑے عرصے کے لئے بیوقوف بنا سکتا ہے لیکن سب کو زیادہ دیر تک نہیں۔ اب ہمارا مقولہ ہے۔ ڈولچی فی آرے نی انتے ۔۔۔ (کچھ نہ کرنا کس قدر خوشگوار ہے)"

مجھے ایک مصرعہ یاد آگیا۔ ع جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں۔ شاید ہم بھی اسی سنہرے اصول پر کاربند ہیں۔

"یہ تم بیٹھے بٹھائے فلاسفر کیوں بن گئے؟" میں نے کہا۔ "آؤ حسن یار کی باتیں کریں۔"

پامپی آئی حضرت عیسےٰ کی پیدائش سے پہلے سمندر کے کنارے آباد تھا۔ ایک رات وسووئیس پھٹا یہ شہر اور ہرکولینئم دونوں لاوے میں دب گئے۔ پہیہ اور سپرنگ جو دورِ جدید کے دو سب سے اہم آلے سمجھے گئے ہیں پامپی آئی میں استعمال ہوتے تھے۔ آج کل سردی گرمی کے بچاؤ کے لئے دوہری دیواروں کے مکان بنائے جاتے ہیں۔ پامپی آئی میں

بھی دیواریں دوہری ہیں - ان میں پائپ لگے ہوئے ہیں اور سائفن بھی۔

پتھر کی سڑکوں پر رتھ کے پہیوں کے نشان ہیں ۔ ریل کی لاٹوں کا عرض ان نشانوں کے عرض سے لیا گیا ہے ۔ چونکہ اس شہر کو لاوے نے تباہ کیا تھا انسان نے نہیں اس لئے کھدائی میں سب کچھ جوں کا توں ملا۔ دیواروں پر الیکشن کے اشتہار ہیں ــــ فلاں کو ووٹ دیجئے ۔

اس فقرے کو مخالف پارٹی نے کاٹ کر نیچے لکھ دیا ہے ــــ نہیں فلاں صاحب کو ووٹ دیجئے ــــ مکانوں پر خوش آمدید۔ کتے سے خبردار رہئے ــــ یہاں پارک کرنا منع ہے ۔ اور دیگر نوٹس ہیں۔ ہسپتال کے قریب کی سڑکیں رتھوں کے لئے بند ہیں۔ شیشے کے برتن۔ سونے کے زیورات ۔جراحی کے نازک آلے ــــ ڈھائی ہزار سال سے حالات کچھ زیادہ نہیں بدلے ۔

رات کی ضیافت نائٹ کلب میں ہوئی۔ کمولا جھانوں کا استقبال کر رہا تھا۔ یکایک ایک شعلہ سا لپکا اور نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ کمولا اُسے ملنے گیا۔ لیکن وہ مڑی اور دوسرے گروہ میں شامل ہو گئی جہاں کسی اور کی پارٹی ہو رہی تھی۔

یہ گراتسی آلدہ تھی ــــ یعنی فیاض اور مہربان ۔

غیض و غضب سے کمولا کانپنے لگا ۔ اطالوی بڑے جذباتی ہوتے ہیں۔

"میری زبردست توہین ہوئی ہے - اسے میں نے بلایا تھا لیکن مخالف فریق نے ہتھیا لیا - ان میں میرا پرانا دشمن بیٹھا ہے جس نے دانستہ طور پر مجھے زک پہنچائی ہے ۔"

"نہیں آئی تو نہ سہی۔ لعنت بھیجو ان سب پر ــــ"

"نہیں! وہ مردود اس لڑکی پر عاشق ہے۔ اٹلی کا ہر مالدار شخص اس کے پیچھے لگا ہوا ہے میرے عزیز دوست، ایک کام کرو۔ کسی طرح اس لڑکی کو یہاں لے آؤ۔"

میں نے سوچا کہ ہماری تاریخ میں کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ بھرے سوئمبر سے کوئی سورما لڑکی کو بھگا کر لے گیا اور لوگ منہ دیکھتے رہ گئے۔ بعد میں تو لڑکیوں اور سورماؤں کو عادت سی پڑ گئی تھی اگر کوئی سوئمبر خیریت سے تمام ہوتا تو لڑکی اسے اپنی ذاتی توہین سمجھتی۔

کمولا اصرار کرنے لگا۔ میں ہال عبور کر کے دوسرے گروہ میں پہنچا اور گراتسی آلدہ کو رقص کے لئے کہا۔ وہ مسکرا کر اٹھی۔ رقص کے اختتام پر میں اسے چھوڑ آیا۔ دوسری دفعہ بھی یہی ہوا تیسری دفعہ بھی اسی کے ساتھ ناچا۔ وہ لوگ بھی مجھے دیکھ دیکھ کر عادی سے ہو گئے۔ چوتھی مرتبہ جب رقص ختم ہوا تو میں نے اس کا بازو تھام لیا۔

"چلئے، کمولا منتظر ہے۔"

"لیکن وہ — ؟" گراتسی آلدہ نے ایک پلے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ جائے جہنم میں۔ آپ ہماری مہمان ہیں۔"

اس کے آتشیں ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ تڑپتی مچھلی حسینہ سوچ رہی تھی کہ اب کیا ہوگا۔ اتنے میں ایک چھوٹا سا فربہ آدمی تیزی سے ہماری طرف آیا اور گراتسی آلدہ سے کچھ کہنے لگا۔

"آپ مجھ سے گفتگو کیجئے۔ خاتون میرے ساتھ ہیں۔" میں نے لڑکی کو اپنی طرف کھینچ لیا مکمل خاموشی چھا گئی۔ ہجوم کی نگاہیں ہم تینوں پر تھیں۔

وہ بڑی تیزی سے بولنے لگا۔ اس نے لڑکی کی طرف ہاتھ بڑھایا جسے میں نے جھٹک دیا۔

"آپ مجھ سے بات کیجیے۔" میں آگے بڑھا اور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے سر اوپر اٹھا کر قہر بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ کچھ دیر سوچ کر واپس چلا گیا۔

"میرے دوست، تم نے آج میری آبرو رکھ لی" گمگولا مجھ سے لپٹ گیا۔ "سارے بیپلز کے سامنے میں نے اسے شکستِ فاش دی ہے۔"

محض اغیار کے سینوں پر مونگ دلنے کے لئے میں نے بار بار گرانسی آلدہ کے ساتھ رقص کیا۔

کھانے کے بعد گمگولا میرے کان میں بولا۔ "یہ تمہارے ساتھ سورنتو کی سیر کرنا چاہتی ہے۔"

"کب؟"

"اسی وقت ——"

"دوست، تم مجھے مخمصوں میں پھنساتے ہو۔ ابھی اس آدمی سے لڑائی ہوتے ہوتے بچی ہے۔ کون تھا وہ؟"

"یہ Fiat کمپنی کا اہم کارکن ہے۔"

وطن میں تین برس تک میں نے فی آٹ کار چلائی تھی۔ مجھے افسوس ہوا کہ ابھی اپنی کار کے صنّاع سے لڑنے لگا تھا۔

"مگر میں یہاں تم سے ملنے آیا ہوں نہ کہ لڑکیوں کی ایک پلٹن سے۔"

"ضد نہ کرو۔ یہ رہی کار کی چابی۔"

بل کھاتی ہوئی سڑک پر ہم ساحل کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ نیلے سمندر میں زرد، سُرخ، سبز، گلابی روشنیوں کے عکس اتنے اچھے معلوم ہو رہے تھے کہ کچھ دیر کے لئے میں ساتھ بیٹھی ہوئی گرانسی آلدہ کو بھول گیا۔ میرے ذہن میں وہ کہانیاں بھر رہی تھیں جو سودر نتو، راویلو، امالفی سے وابستہ ہیں۔ کار ٹھہرا کر ہم ایک اُونچی سی چٹان پر بیٹھ گئے۔

"تم خوب جانتی ہو کہ بے حد حسین ہو۔ پھر یہ عشوے اور غمزے کس لیئے ہیں؟"

"مجھے مضبوط اور پُروقار مرد پسند ہیں۔ تمھاری جرأت پہلے تو بُری لگی پھر میں نے اسے سراہا۔ اپنے اوپر تمھیں کس قدر بھروسہ ہے۔ لیکن تمھارے دوست کو اتنی ہمت کیوں نہ ہوئی؟"

"اپنے دوست کے خلاف میں ایک لفظ سُننا نہیں چاہتا۔"

اس نے بازو اٹھا کر انگڑائی لی۔ سیاہ زلفوں کی ایک لٹ ماتھے پر آن گری۔ دو ساحر آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔

"میں نے سُنا ہے کہ تمہارے حُسن میں ایسا جادُو ہے کہ لوگ دل تھام کر رہ جاتے ہیں لیکن تم کسی کو قریب نہیں آنے دیتیں، سب کو ترساتی ہو۔"

"نہ جانے کیوں مجھے اس میں لطف آتا ہے۔ جس مرد کو چاہو غلام بنا لو۔ یہ کیسا مخمور کن خیال ہے" ذرا سی مسکراہٹ۔ پیار بھرا بول۔ معمولی سی ادا سے مرد یوں شل ہو کر

رہ جاتے ہیں جیسے ان پر بجلی آن گری ہو۔ کتنی خود اعتمادی محسوس ہوتی ہے کہ جیسے ان کی قسمت کا فیصلہ میرے ہاتھ میں ہو۔ بس اشاروں پر ناچنے لگتے ہیں۔ تنکار کو گھبر کر تنکاری بھی تو یہی محسوس کرتا ہے ۔"

"تو مجھے کل ہی یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیئے۔"

"لیکن مجھے یقین ہے کہ تم ان مردوں میں سے نہیں ہو جن کے دل میں عورت کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔"

"مگر وقعت ہونی چاہیئے۔ عورت ایک بے بس ناسمجھ بچے پر اپنی زندگی ضائع کرکے اسے مرد بناتی ہے۔ کنبے کی پرورش میں عورت کا کردار نہایت اہم ہے تخلیق و تربیت میں اس کے فرائض بڑے کٹھن ہیں۔ مرد کی حیثیت ایک آنریری ممبر کی سی ہے۔ چنانچہ یہ مرد ہی ہے جو جنگیں فتح کرتا ہے۔ نئے افق تلاش کرتا ہے۔ اونچے پہاڑوں پر چڑھتا ہے۔ نئی نئی ایجادات۔ نت نئے کارنامے۔ ادب، شاعری سیاست۔ یہ سب مرد کے ہیں۔ اس لئے کہ وہ آزاد ہے اور اس کے پاس زیادہ وقت ہے ۔"

"سنا ہے تمہارے ملک میں پردے کا رواج ہے۔"

"ہاں۔"

"مجھے پردہ بہت پسند ہے۔ اس کے لئے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ خدا اپنے بندوں سے پردہ کرتا ہے۔ مغرب میں عورت اپنا وقار کھو چکی ہے۔ اسے معاشی آزادی میسر ہے۔ وہ فیکٹریوں، دفتروں اور دکانوں میں کام کرتی ہے۔ لیکن اب اس کا گھر نہیں ہے اُلٹی کو

مذہب لے کر بیٹھ گیا۔ یہ مذہب طلاق کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ جس کا جو جی چاہے کرتا ہے کوئی باز پرس کرے تو اُسے بھی ترغیب دیتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح کرو۔ ان دنوں میرے پیچھے بے شمار شادی شدہ مرد لگے ہوئے ہیں۔ ایک دن تمہارا دوست ــــ"

"میرے دوست کو بیچ میں مت لاؤ اور یہ بتاؤ کہ یہ سحر طرازی کا یہ پروگرام کب تک جاری رہے گا؟"

"میں پچیس برس کی ہوں۔ شاید پندرہ برس اور حسین رہوں۔ پھر بڑی بوڑھیوں کی طرح رہا کروں گی۔"

"اچھا تو میں سولہ برس کے بعد تم سے ملوں گا۔ تب تک خطرہ دور ہو چکا ہوگا۔"

"اگر اگلے سال میں تاجپوشی دیکھنے لندن آئی تو تم ملو گے؟"

"ملوں گا۔ لیکن یہ سمجھ لو کہ میں مزدور آدمی ہوں۔ اب چھٹی ہے تب کام ہوگا۔"

اس نے پھر انگڑائی لی اور اُف کہہ کر کلائی تھام لی۔

"کیا ہوا؟"

"چوڑی ٹوٹ گئی۔ خون نکل آیا۔"

برساتی پر خون کے دو قطرے گر گئے جنہیں رومال سے پونچھا مگر نشان نہ گیا۔ اس نے برساتی پر وہ حروف نہ جانے کیسے پڑھ لئے۔ مچل گئی۔ "یہ اُس ٹاؤن روز الیا نے لکھا ہے۔" وہ پتھر سے حروف کھرچنے لگی۔

شہنشاہ ٹائبیریس نے دنیا پر حکومت کرنے کے لئے کیپری کو صدر مقام چنا تھا

اس کا انتخاب غلط نہ تھا۔ کیپری دنیا کا سب سے خوشنما جزیرہ ہے۔ ایک نیلی سی دھند یہاں ہر وقت چھائی رہتی ہے۔ کوئی رنگ ایسا نہیں جو یہاں نہ ہو۔ سمندر کا رنگ، پہاڑیوں کا رنگ، آسمان کا رنگ، باغ، عمارتیں، پھول، لباس، — ہر چیز رنگین ہے۔

سب سے حسین چیز بلیو گراٹو (نیلا غار) ہے جس کا واحد راستہ سمندر سے ہے اور اتنا تنگ ہے کہ کشتی میں لیٹ کر داخل ہوتے ہیں۔ غار کے منہ سے روشنی اندر آتی ہے جو نیلے پانی میں سے گذرتے ہوئے رنگی جاتی ہے۔ اندھیرے میں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ایک بہت بڑا نیلم جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ لوگ مبہوت رہ جاتے ہیں کشتیاں بار بار ٹکراتی ہیں۔ باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔ ملاح کھینچ کھینچ کر باہر لاتے ہیں۔

ہم واپس نیپلز جا رہے تھے کہ ایک شخص بھاگا بھاگا آیا۔ "ٹھہرو!" اس نے بالکل اس طرح نعرہ لگایا جیسے ہماری فلموں میں ایک آدمی ہمیشہ پکارتا ہے۔ "ٹھہرو یہ شادی نہیں ہو سکتی۔"

اس کے ہاتھ میں کوئی بستہ جیسی چیز تھی — میری برساتی — اچھی جگہوں پر یہ خود بخود رہ جاتی ہے۔ یا تو شرارتی ہو گئی ہے یا اسے سکاٹ لینڈ کی آب و ہوا پسند نہیں۔

رات کی محفل میں گانا بجانا خوب زوروں پر تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کا شخص اپنے سیاہ لباس پر امتیازی تمغات لگائے آیا اور میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"معاف کیجئے۔ سینیورا آپ سے گفتگو کرنا چاہتی ہیں۔"

میں اب اس قسم کی باتوں کا عادی ہو چکا تھا۔

"چلئے —" میں اٹھ کر ساتھ ہو لیا۔

سامنے ایک نوعمر لڑکی ہیرے جواہرات پہنے مسکرا رہی تھی۔

میزبان نے اپنا تعارف کرایا۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو خاوند غائب تھا۔

میں اور وہ اکیلے رہ گئے۔ وہ سسلی سے آئی تھی اور انگریزی نہیں جانتی تھی۔ چنانچہ چھوٹے موٹے الفاظ کے علاوہ دونوں کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔

وہ بیحد خوبصورت تھی۔ رخسار پر ننھا سا تل تھا اور چہرے پر بلا کی معصومیت۔ کانوں میں ہیرے کے آویزے۔ گلے میں بیش قیمت ہار۔ سر پر جڑاؤ [illegible]

بار بار وہ کچھ کہنے کی کوشش کرتی لیکن ٹھیٹھ اطالوی زبان میں۔ ویسے جب اطالوی باتیں کرتے ہیں تو ان کے چہرے کے اظہار اور ہاتھوں کی جنبش سے بہت کچھ اندازہ ہو سکتا ہے لیکن یہ حسین لڑکی نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی — میں صرف اتنا سمجھ سکا — آج رات گیارہ بجے۔ پامپی آئی کی سڑک۔

نکولا مہمانوں سے باتیں کر رہا تھا — مجھے اچھی طرح علم تھا کہ وہ کیا رائے دے گا۔

اس کا خاوند کافی دیر کے بعد آیا۔ چلتے وقت اس نے ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا کہہ رہی ہو — بھولنا مت۔ ضرور آنا۔

پونے گیارہ بجے میں نے برساتی اوڑھی۔ نکولا کی کار لے کر پامپی آئی کی طرف چل دیا لیکن سوچ رہا تھا، جاؤں یا نہ جاؤں۔ برساتی کی طرف دیکھا۔ اس کے کالر تک ربڑ کے ننھے سلوٹیں سی

پڑی ہوئی تھیں۔ یوں لگا جیسے برساتی خوش نہیں ہے بلکہ کہہ رہی ہے۔ میاں تم سیّاح ہو
ان الجھنوں میں مت پڑو۔ سب کچھ دور دور سے دیکھو اور اپنا راستہ لو۔

اچھا نہیں جاتا۔ میں واپس لوٹ آیا

نیپلز سے روانگی کے وقت گمولا کہنے لگا ۔" اگلی مرتبہ زیادہ چھٹی لے کر آنا۔ ہم
دونوں سسلی چلیں گے"۔ گاڑی کی گھنٹی بجی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے مجھ سے بغلگیر ہوگیا۔

"اُمی کو — پھر ضرور آنا"

سوئیٹزرلینڈ کو یورپ کی تفریح گاہ کہتے وقت یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کون سی تفریح؟
یہاں برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ ہیں۔ رنگ برنگے پھول ہیں۔ وسیع سرسبز وادیاں
نیلی جھیلیں، سب کچھ ہے مگر یہ نظارے اپنے آپ کو اس باقاعدگی سے دوہراتے ہیں کہ
سوئٹزرلینڈ کے تیس چالیس میل دیکھ لینا سارا ملک دیکھ لینے کے مترادف ہے۔
یہاں اصلی سوئس بہت کم پائے جاتے ہیں۔ ملک کے تین حصے ہیں۔ جنوبی حصے
میں یہ معلوم ہوتا ہے گویا ابھی تک اٹلی ہی میں قیام ہے۔ شمالی حصے میں جرمنی اور مغربی
حصے میں فرانس یاد آتے ہیں (مشرقی حصے میں کچھ یاد نہیں آتا)۔ یہاں ایک چیز سے جی بھر
جاتا ہے۔ ایک دکان میں بلی دیدے مٹکا رہی ہے — یہ گھڑی ہے۔ ایک جگہ چوہا ناچ رہا ہے
یہ بھی گھڑی ہے۔ وہ چیز جو قلمدان معلوم ہوتی ہے۔ در اصل گھڑی ہے۔ ہر جگہ گھڑیاں ہی گھڑیاں ہیں
— بلوتری، مخروطی، مستطیل، مربع، گول، تکونی — اپنی گھڑی سے نفرت ہو جاتی ہے۔

اُونچے الپس گھٹاؤں کو اندر نہیں آنے دیتے۔ وادیوں میں دھوپ رہتی ہے۔ لیکن گھٹا اندر آجائے تو یہ پہاڑ باہر نہیں نکلنے دیتے۔ چنانچہ ہفتوں بارش ہوتی ہے۔

کسی زمانے میں ان فلک بوس پہاڑوں کو ہینی بال نے ایک کثیر فوج اور سینتیس ہاتھیوں سمیت عبور کیا تھا۔ اٹلی پہنچ کر اس نے فوج گنی تو معلوم ہوا دشوار گذار راستوں میں ہزاروں سپاہی ہلاک ہو چکے تھے لیکن ہاتھی پورے سینتیس کے سینتیس موجود تھے جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ ہینی بال بذاتِ خود ہاتھی پر سوار تھا لہٰذا ہاتھیوں کے طفیل سے بچ گیا۔

لوسرن سے جھیل عبور کر کے پہاڑی ریل کے ذریعے رگی کی چوٹی پر پہنچا۔ دیر تک تصویریں اتارتا رہا۔ ہوٹل پہنچ کر معلوم ہوا کہ برساتی پھر غائب ہے۔ مجھے کچھ اپنے اوپر غصہ آرہا تھا کچھ برساتی پر۔ اب اسے یہیں چھوڑ جاؤں گا:

اگن بوٹ والوں سے ملا۔ اُنھوں نے پہاڑی ریل کے چھوٹے سے سٹیشن کو فون کیا — کہ پہاڑ کی چوٹی پر جو اونچا سا درخت ہے اس کے نیچے ایک برساتی پڑی ہوگی۔ جواب آیا — برساتی بالکل وہیں رکھی ہے، تہہ کی ہوئی۔

ٹرین چلنے سے دس منٹ پہلے ایک آدمی برساتی لے کر سٹیشن پر پہنچا۔ "جناب بہت اچھا ہوا کہ یہ مل گئی ورنہ آپ یہی سمجھتے کہ سوئیٹزرلینڈ والوں نے چرا لی"۔

لندن پہنچا۔ اگلے روز ملکہ کی گارڈن پارٹی پر مدعو تھا۔ میرے پرانے افسرِ اعلیٰ نے ملکہ اور ڈیوک سے ملایا جنھوں نے وطن اور عزیزوں کے متعلق باتیں کیں۔

جب میں جولیا کو روم کے گرجوں کی باتیں سنا رہا تھا تو وہ بار بار پوچھتی ۔ "مگر ملکہ نے اور کیا کیا سوال کئے ؟ شہزادی مارگریٹ کا لباس کیسا تھا ؟ ڈیوک کیسے معلوم ہو رہے تھے ؟" اڈنبرا میں لڑکے لڑکیوں نے اس قدر جوش و خروش کا اظہار کیا کہ وہ مختصر سی گفتگو جو شاہی خاندان کے افراد سے ہوئی تھی مجھے مہینوں دوہرانی پڑی ۔ لیکن جولیا کو میں نے روم کی ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ اس کے عقیدے ڈگمگانے لگے اور آخر اس نے مذہب تبدیل کر لیا ۔ وہ رومن کیتھولک سے پروٹسٹنٹ بن گئی ۔

میں چونکا ۔ گھڑی دیکھی ۔۔۔ افوہ کتنی دیر ہو گئی ہے ۔ ابھی بہت سفر باقی ہے ۔ دن چھوٹے ہو گئے ہیں ۔ چھ بجے ہی اندھیرا ہو جائے گا ۔ اب اُٹھئے ۔۔۔ اُٹھئے بس اب کہ لذتِ خواب سحر گئی ۔۔۔ جاگتے میں خواب دیکھنا بہت بری عادت ہے ۔۔۔ قصہ سوتے جاگتے کا تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں ۔ کل نو بجے لندن میں آپ کا پہلا لیکچر ہے ۔ پانچ بجے تک کلاسیں ہوا کریں گی ۔ رات کو آموختہ یاد کیجئے گا اور پانچ چھ گھنٹے سو کر ۔۔۔ رات گذری نورکا تڑکا ہوا ۔۔۔ ہوشیار اسکول کا رڈ کا ہوا ۔۔۔ میں برساتی لے کر اٹھا اور کار میں بیٹھ گیا ۔

دس پندرہ میل گیا ہوں گا کہ ایک شخص نے ہاتھ سے اشارہ کیا ۔ میں رُک گیا ۔

"کہاں چلو گے ؟"

"جہاں لے چلو ۔"

"لندن ؟"

"ہاں"

میں نے اُسے بٹھا لیا۔ وہ میرا ہم عمر تھا۔ عقابی آنکھیں۔ ورزشی جسم۔ مسکراتا چہرہ۔ اس کے پاس صرف ایک چمڑے کا صندوق تھا۔

"یہ صندوق سامان کے ساتھ رکھ دیں؟" میں نے پوچھا

"نہیں۔ اسے میں اپنی گود میں رکھ لوں گا۔"

صندوق پر بے شمار لیبل لگے ہوئے تھے ۔۔۔ دی آنا، روم، زیورچ، برلن، کوپن ہیگن، فرنیک فرٹ۔ اس نے بتایا کہ اس کا نام جیرلڈ ہے۔ کینیڈا کا رہنے والا ہے، پچھلی جنگ میں ہوا باز تھا۔ قریب ہی ایک کیمپ میں ایک ماہ کے لئے ہوا بازی کی ٹریننگ کے واسطے آیا تھا۔ اب ملازمت کی تلاش میں لندن جا رہا ہے۔

"کینیڈا میں آٹھ برس سے نہیں گیا۔ وہاں تھوڑی سی زمین ہے اس کی آمدنی پر گذارا ہے"

"تو زر زمین زن میں سے تمہارے پاس ایک چیز موجود ہے۔"

میں نے کہاوت کا ترجمہ کیا تو وہ ہنسنے لگا۔ "یوں تو زن بھی تھوڑی سی ہے ایک لڑکی مجھے پسند ہے اور تم؟"

"میں ان تینوں سے مبرّا ہوں۔"

میں اس کے صندوق کے لیبلوں کو پھر دیکھنے لگا ۔۔۔ پیرس، لوزاں، وینس، ایتھنز۔ میں نے بھی تو یہی سفر کیا تھا ۔۔۔ پیرس، لوزاں، وینس، ایتھنز۔

وہ سب جگہیں نگاہوں کے سامنے پھرنے لگیں۔ میں بھول گیا کہ موٹر چلا رہا ہوں

میرے ساتھ کوئی میٹھا ہے اور ہم لندن جا رہے ہیں۔ وہ سارے نظارے ذہن میں اُبھرنے لگے

میں پھر رود بارِ انگلستان عبور کر رہا ہوں۔ سمندر خلافِ معمول پُرسکون ہے اور توقع کے خلاف دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ میں عرشے پہ کھڑا نقشہ دیکھ رہا ہوں۔

پھر پیرس، لوزان، وینس ہوتا ہوا ترییست Trieste پہنچتا ہوں۔ اس شہر کی فضا ایسی ہے جیسے ابھی کچھ ہونے والا ہے۔ یہاں ہر شخص ہر دوسرے شخص کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ جاسوسی قصوں کے شائقین کے لئے یہ بہترین جگہ ہے۔ ابھی پہنچے دیر نہیں ہوئی تھی کہ مجھے یوں لگا جیسے کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔ پہلے تو یونہی خیال سا تھا لیکن پھر دیکھا کہ سمندر کے کنارے پرانے کھنڈرات میں، پہاڑیوں کی طرف — جہاں کہیں میں جاتا یہ شخص بھی پہنچ جاتا۔ میں نے اسے نظرانداز کیا، گھورا، قریب جا کھڑا ہوا۔ لیکن اس پہ کوئی اثر نہ ہوا۔ دن بھر آنکھ مچولی ہوتی۔ آخر میں جھنجھلا اُٹھا۔ کباڑی بازار میں جب وہ سیڑھیاں اُتر رہا تھا میں نے اُسے جا پکڑا۔

"میرے پاس صرف دو دن تھے۔ ایک تو تم نے ضائع کر دیا۔ اب اگر کل بھی تم نے میرا تعاقب کیا تو میں تمہارا بھرکس نکال دوں گا۔"

اس کی گھگھی بندھ گئی۔ "میں آپ کا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ میں تو خود سیاح ہوں اور دن بھر ڈرتا رہا ہوں کہ آپ میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔"

اس سے معافی مانگ کر تھوڑی دور گیا ہوں گا کہ ایک عورت آگے آگے چلنے لگی۔

جس طرف میں مُڑتا وہ بھی پھرتی سے مڑ جاتی۔ یہ کیا تماشہ ہے؟ شاید یہ سوچتی ہوگی کہ تعاقب کرانا تعاقب کرنے سے کہیں بہتر ہے۔ میں نے رفتار تیز کر دی حتیٰ کہ اس کا سانس پھُولنے لگا۔ یہ دوڑ جیت کے میں برابر سے نکل گیا۔ ہوٹل میں کھانا کھاتے وقت دیکھتا ہوں تو وہی عورت کونے میں بیٹھی ہے مینیجر پوچھا۔ معلوم ہوا کہ وہ بھی سیاحت کے سلسلے میں یہاں ٹھہری ہوئی ہے۔ لاحول پڑھی اور سو گیا۔

سٹیشن پر گیا۔ کسی نے بتایا کہ آج شام کو اورینٹ ایکسپریس بلگراڈ جا رہی ہے۔ مشہور ریلی ٹرین جو کبھی لندن سے وی آنا، بوڈاپسٹ، بخارسٹ، صوفیہ ہوتی ہوئی استنبول پہنچتی تھی اور وہاں سے سیدھی بغداد۔ ریاستہائے بلقان کے دنگے فساد تو ہمیشہ سے مشہور ہیں۔ عجیب عجیب لوگ اس ٹرین سے سفر کیا کرتے ــــ بادشاہ، جاسوس، سیاست دان، چور۔ جواہرات پہ ڈاکہ، اغوا، قیمتی کاغذات کی چوری، دُنیا بھر کے جرائم اس سے منسوب ہیں۔

اب یہ ان ملکوں سے نہیں گزرتی۔ بلگراڈ سے نش۔ وہاں سے ایک شاخ صوفیہ ہوتی ہوئی استنبول پہنچتی ہے۔ دوسری سلونیکا ہو کر ایتھنز۔

شام کو میں اس ٹرین میں تھا۔ ڈبے کے لمبے راستے میں کھڑا کھڑکی سے سبز پہاڑیاں دیکھ رہا تھا کہ ایک لڑکی ساتھ آ کھڑی ہوئی اور اگا تھا کرسٹی کے ہیبت ناک قصّوں سے متاثر ہو کر خاص طور پر اس ٹرین سے سفر کر رہی تھی۔

"میں لندن سے آ رہی ہوں۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی ہے، ابھی میں نے اس ٹرین کے متعلق ایک ناول ختم کیا تھا ــــ اول تو یہ ایکسپریس کہاں ہے، اتنی آہستہ چل رہی ہے

پھر وہ ماحول ہی ندارد ہے سب لوگ آرام سے بیٹھے ہیں۔ اب تک کچھ بھی نہیں ہوا۔"

رات کے دس بجے نسوانی چیخ سنائی دی میں جلدی سے باہر نکلا۔ یہ وہی لڑکی تھی۔ اُسے کھڑکی میں کسی کا سر نظر آیا تھا۔ دراصل کھڑکی کے شیشے میں اس نے خود اپنے سر کا عکس دیکھا تھا۔ کچھ دیر کے بعد پھر چیخ سُنائی دی۔ اس مرتبہ اُسے کھڑکی میں تلوار نظر آئی۔ جو درحقیقت شیشہ اوپر نیچے کرنے کا ہینڈل تھا۔

رات بھر اس نے تنگ کیا۔ اسے بندوق، پستول، خنجر، چھریاں، چاقو — سب باری باری دکھائی دیئے — سوائے توپ کے جو بہت بڑی ہوتی ہے۔

ناشتے پر وہ غائب تھی۔ معلوم ہوا کہ علی الصبح کسی سٹیشن پر اُتر گئی۔ ایک انگریز انجینئر کچھ مشینوں کی مرمت کرنے بلگراڈ جا رہا تھا۔ وہ بھی کچھ ڈرا سا ہوا تھا۔ پوچھا کہ دن میں کیوں ڈرتے ہو؟ کہنے لگا "مشرق سے میں بہت گھبراتا ہوں۔ یہ لوگ بے حد جذباتی ہوتے ہیں جو جی میں آجائے کر گزرتے ہیں —"

بلگراڈ پہنچ کر دیکھا تو واقعی مشرق شروع ہو چکا تھا۔ جھونپڑیاں اور فلک بوس عمارتیں ساتھ ساتھ کھڑی تھیں۔ بڑی بڑی کاروں کے ساتھ بیل گاڑیاں چل رہی تھیں۔ تیز ہوا چلتی تو گرد اڑتی۔ مکھیاں تھیں بے شمار کتے تھے۔ میں نے ایک پاؤنڈ کے دینار (مقامی کرنسی) لئے اور فوراً حلوہ خریدا جو گڑ کی طرح تھا۔

یوگوسلاویہ کے لوگ غریب ہیں۔ لیو بیرک ملا جو زاغرب سے مجھے ملنے آیا تھا۔ میں اس کے دوست سے لندن میں مل چکا تھا۔ لیو کو لندن میں تعلیم حاصل کرنے کا بیحد شوق تھا

بلکہ جنون تھا۔ اس کے دوست کو برٹش کونسل والے وظیفہ دے کر ساتھ لے گئے اور یہ ہاتھ ملتا رہ گیا۔ دن بھر وہ لندن کی باتیں پوچھتا رہا۔

"لندن کی ایک اعزازی ڈگری تو تم آج ہی اپنے نام کے ساتھ لگا سکتے ہو۔"

"سچ مچ؟" اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

میں نے ایک نقلی ڈاکٹر کا قصہ سنایا۔ جو اپنا نام یوں لکھا کرتا۔

ڈاکٹر . . . . اے۔ جے۔ کے (لندن)

ایک دن بھید کھل گیا۔ عدالت میں باز پرس ہوئی تو اس نے جواب دیا کہ ڈاکٹر تو مجھے گھر والے پیار سے کہا کرتے تھے۔ اس لئے بچپن سے یہ لفظ نام کے ساتھ شامل ہے۔

"اور یہ A. J. K. (London) کیا ہے؟"

"آرزو جانے کی لندن"۔ اس نے جواب دیا۔

لبو پر کوئی اثر نہ ہوا وہ بدستور لندن کے گن گاتا رہا چلتے وقت اس نے مجھے اپنے عزیزوں کا پتہ دیا جو مقدونیہ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔

بلگراڈ سے روانہ ہوا تو ایک دلچسپ ہمسفر ملا۔ حسام الدین — وہ شام کا رہنے والا تھا۔ سرخ و سفید رنگ، بحث مباحثے کا شوقین۔ فرانس سے واپس دمشق جا رہا تھا عرب ممالک کا ذکر چھڑتے ہی اس نے بکریوں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا "بکری ایک ایسی لعنت ہے جو ہم سب کو لے کر بیٹھ گئی۔ رومن شمالی افریقہ میں زیتون اور نارنگیاں اگاتے تھے۔ بحیرۂ روم کا ساحل ہرا بھرا تھا۔ جہاں عرب گئے بکری ساتھ گئی۔ بھیڑ صرف کونپلیں کھاتی

ہے لیکن بکری جڑوں تک کو نہیں چھوڑتی۔ جب پودے اور درخت ختم ہوئے تو یہ علاقے اجاڑ ہو کر صحرا بن گئے۔ بکری کے دودھ سے لمبا بخار بھی چڑھتا ہے پھر ہم میں یہ عیب ہے کہ ہم فالتو بحث بہت کرتے ہیں۔ جب ہلاکو خاں بغداد کو تباہ کرنے آ رہا تھا تو دارالخلافے میں بادام جو خبریں پہنچ رہی تھیں۔ لیکن بغداد کے علماء ایک اہم مباحثے میں مشغول تھے۔ بحث کا موضوع تھا کہ اُلّو حلال ہے یا حرام۔"

"زوال کی اور بھی تو کئی وجوہات ہیں۔" میں نے کہا

"مغرب ہمارے زوال کی وجہ ہمارا مذہب اور سست کر دینے والی آب و ہوا بتاتا ہے لیکن جب ہم نے ملک پر ملک فتح کیے تب بھی یہی مذہب تھا اور یہی آب و ہوا۔ دراصل مغرب نے ہمیں صلیبی جنگیں جیتنے پر اب تک معاف نہیں کیا۔ لیکن لطف تو یہ ہے کہ ہم سے لڑنے وہ لوگ آئے جن کا مذہب سکھاتا ہے کہ کوئی ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا بھی سامنے کر دو جب رچرڈ لڑنے آیا تو آتے ہی فرمائشوں کی بارش کر دی — ذرا انگور تو بھجوائیے۔ گرمی ہے کچھ برف اور شربت ارسال فرمائیے۔ طبیعت ناساز ہے کسی حکیم سے کہیئے کہ دیکھ جائے۔ آج طبیعت اچھی ہے، مرغ کھانے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کی موسیقی کی تعریف سنی تھی، کبھی سنوائیے۔ صلاح الدین نے سب فرمائشیں پوری کیں۔ ایک مرتبہ بھی نہ کہا کہ میاں لڑنے آئے ہو یا ناز برداریاں کرانے۔ ہم نے یورپ کو شنو لری سکھائی۔ عورتوں کی عزت، معاہدوں کا احترام ۔"

"مگر صلاح الدین تو مغرب کے ہیرو ہیں ۔"

"ہم کہاں کہاں پہنچ چکے تھے۔ پیرس سے تین منزل ادھر ہم نے جنگ لڑی۔ وی آنا

کا بار بار محاصرہ کیا۔ یونان اور بلقان کی ریاستوں پر چار سو سال حکومت کی۔ ہسپانیہ میں سات سو برس رہے۔ ہم نے اٹلی پہ چھاپے مارے۔ روم کی دیواریں گرائیں۔ سوئٹزرلینڈ میں ہماری نشانیاں اب تک موجود ہیں۔ لیکن اب ہم سے سب کچھ چھن چکا ہے۔ شام اور افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں ہمارے شہروں کے کھنڈر ہڈیوں کی طرح چمکتے ہیں —"

میں نے اسے بتایا کہ دنیا کی تقریباً ہر قوم کو یہی شکایت ہے کہ وہ تنزّل پر ہیں سب اپنی پرانی تاریخ کو یاد کر کے آنسو بہاتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ بین الاقوامی بیزاری کیوں ہے۔

ہم مقدونیہ میں داخل ہوئے۔ سکندرِ اعظم کا وطن۔ سرسبز پہاڑیاں۔ چشمے اور خودرو پھول جب میں لیبو کے کنبے سے ملنے چھوٹے سے سٹیشن پر اترا تو وہاں اذان ہو رہی تھی۔ یہ بیحد پُرخلوص اور سیدھے سادے لوگ تھے۔ انھوں نے بڑی خاطر کی۔ مجھے ان کی زبان بالکل نہیں آتی تھی پھر بھی ہم دوست بن گئے۔ دن بھر میں نے ان کے ساتھ کھیتوں میں کام کیا۔ چھوٹے سے باغ میں پودوں کو تراشنے میں مدد دی۔ شام کو تاروں بھرے آسمان تلے اُن کی موسیقی سُنی۔

خلوص کی کوئی خاص زبان نہیں ہوتی۔ یہ دل میں محسوس ہوتا ہے اور آنکھوں سے جھلکتا ہے مقدونیہ کا ایک منظر ہمیشہ میری آنکھوں میں پھرتا رہتا ہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں اداس تھا اور اس یاد نے مجھے مسرور کر دیا۔ کئی مرتبہ یوں محسوس ہوا جیسے یہ نظارہ میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ نرا واہمہ ہے۔

صبح صبح سورج کی شعاعیں پہاڑیوں سے پھوٹ رہی ہیں۔ آسمان کے مشرقی حصّے

ہیں چند بدلیاں ہیں جو بالکل سُرخ ہیں اور تاحدِ نگاہ پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ہوا کے جھونکوں سے گلابی پھُول جھوم رہے ہیں ـــ ہزاروں لاکھوں کروڑوں پھُول۔ اتنے پھول میں نے کبھی نہیں دیکھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دُنیا ابھی تخلیق ہوئی ہے اور ہر جگہ پھُول ہی پھُول ہیں۔ دنیا میں ہر طرف سچائی ہے مسرت ہے شادمانی ہے۔

یونان کی سرحد عبور کی اور سلونیکا ٹھہرا۔ لیکن مجھے ماؤنٹ اولمپس دیکھنے کی جلدی تھی۔ جب یہ پہاڑ نظر آیا تو دیر تک دیوتاؤں کے اس مسکن کے سامنے میں خاموش کھڑا رہا۔ چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ آسمان صاف تھا لیکن پہاڑ کی چوٹیاں بادل اور دُھند سے چھپی ہوئی تھیں۔ ان چوٹیوں پر یا دُھند رہتی ہے یا بادل ممکن ہے کہ یہاں اب بھی دیوتا رہتے ہوں۔ بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج میں ضیافتیں ہوتی ہوں۔

ایتھنز جاتے وقت جو علاقہ آتا ہے وہ بالکل جہلم اور راولپنڈی کے علاقے جیسا ہے شاید اسی لئے یونانی ٹیکسلا میں آباد ہو گئے تھے۔ یونان سے خیبر تک جانی پہچانی پہاڑیاں نظر آتی رہیں وہ خوش رہے مگر جب ہندوستان کے میدان دیکھے تو گھریاد آیا اور واپس لوٹ گئے۔

ایتھنز پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ ابھی دوڑ کر ایکروپلس دیکھ لوں۔ ہوٹل میں سامان رکھتے ہی بھاگا۔ شہر کے پرانے حصّے سے گذرتا ہوا اس پہاڑی کے نیچے پہنچا جس پر ایکروپلس ڈھائی ہزار سال پہلے بنایا گیا تھا۔ بل کھاتی ہوئی سڑک آئی پھر چڑھائی۔ پھر چاندنی میں جھلکتی ہوئی وہ عمارت، جسے دیکھ کر سب کچھ فراموش ہو جاتا ہے۔ بیتی ہوئی صدیاں، وقت کے تباہ کن حملے، حیات و ممات کا لامتناہی سلسلہ ـــ کچھ بھی تو یاد نہیں رہتا۔

حیرت ہوتی ہے کہ اس اداس دنیا میں ایسی شگفتہ چیزیں بھی موجود ہیں جن پر خزاں نہیں آتی، جو غیر فانی ہیں جنھیں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ابھی سب کچھ تباہ نہیں ہوا۔ ابھی امید کی کرن باقی ہے۔ یہ منروا کا مندر ہے۔ یہ ہرکولیز کا معبد ہے۔ یہ قدیم دنیا کا عجوبہ پارتھینون جسے فن کار فڈیاس نے تعمیر کیا۔ یہ اس زمانے کی یادگار ہے جب ایتھنز ساری مہذب دنیا کا قلب تھا۔

آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا میں اس صنم کدے میں داخل ہوا جہاں کبھی نہایت عظیم انسانوں کی آوازیں گونجی ہونگی۔ افلاطون، سقراط، القبیادیس، ڈیموستھینز، فیثاغورث، ہیروڈوٹس، پیری کلیز۔

علی الصبح میں نے ایکروپلس سے طلوعِ آفتاب دیکھا۔ نیچے اولمپیا کے دیوتا زیوس کا مندر ہے۔ سامنے پہاڑی پر قید خانے کی کوٹھڑیاں ہیں جہاں سقراط کو زہر دیا گیا۔ ایک طرف ڈیونسس کا تھیٹر جہاں سکائلس، یوری پڈیز اور سفوکلیز کے ڈرامے کھیلے گئے۔ اس کے ساتھ موسیقی کا مندر۔ اوڈین اور دور نیلا سمندر۔

نیلا آسمان۔ نیلا سمندر۔ رنگین پھول۔ حسین ستون، متناسب، نفیس، تعلیق جیسے کسی دلکش نظم کے اشعار۔

بتلائے ہوئے پتے پر فون کیا۔ ملتوس ہارا لامبیر ملنے آیا۔ اکٹھے کھانا کھایا۔ پلاؤ، دہی کباب، کوفتے اور حلوہ۔ ریڈیو پر ریکارڈ بج رہے تھے غالباً فوجی بھائیوں کا پروگرام ہو رہا تھا دھنیں مشرقی تھیں۔ اس نے بتایا کہ حکیم فیثاغورث کو موسیقی کا بھی شوق تھا اسی سلسلے میں وہ ہندوستان گیا تو یونانی موسیقی کو بیس نئے ٹھاٹھ ملے جو صدیوں تک رائج رہے۔

بل ادا کر کے میں نے بیرے کو دو سو درہم کا نوٹ دیا۔ وہ اس قدر خفا ہوئے کہ دیر تک

بڑبڑاتا رہا۔ حساب لگانے پر معلوم ہوا کہ صرف دو سو درہم دے کر نہ صرف میں نے اس کی توہین کی تھی بلکہ اس کا کیریر تباہ کر دیا تھا۔

یونان میں کرنسی کی قیمت ابھی ابھی گری تھی، پہلے پاؤنڈ کے عوض بیالیس ہزار درہم ملتے تھے، اب چوراسی ہزار درہم ہو گئے جیسے پنسلین کے معمولی سے ٹیکے میں کئی لاکھ یونٹ ہوتے ہیں دس پاؤنڈ کا سفری چیک دیا تو آٹھ لاکھ چالیس ہزار درہم ملے جنھیں اٹھانا مشکل ہو گیا زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ لکھ پتی بننے کا موقعہ نصیب ہوا۔

یونان میں موسمِ بہار تھا۔ ساحل کے ساتھ ساتھ بے شمار خودرو پھول کھلے ہوئے تھے۔ سمندر، آسمان اور جزیرے — ان سب میں ایسی ہم آہنگی ہے کہ یہ رنگ آپس میں مدغم ہو کر رہ جاتے ہیں۔

سنگِ مرمر کے حسین ستون، رنگین پھول، نیلے سمندر میں خوشنما جزیرے — یہ سب یونان ہی میں یکجا ملتے ہیں۔

"موسمِ بہار میں یونانی تنہا نکلنا گناہ سمجھتے ہیں۔" ملنوس ہارالا مبیز بولا

"بھئی تمہارا نام بہت لمبا ہے — یاد نہیں رہتا۔"

"مجھے ٹونی کہا کرو۔"

رات کو ہمارے ساتھ ٹونی کی منگیتر تھی اور اس کی دو سہیلیاں۔ ایک تو بالکل سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ جیسے ایک ایک عضو پر خالق نے وقت صرف کیا ہو آنکھوں کی ساخت، ہونٹوں کی بناوٹ، پیشانی، گردن — ہر چیز تراشیدہ معلوم ہوتی تھی۔ یہ مجسمہ کسی بُت تراش کا خواب تھا۔

"کون ہے یہ ؟" میں نے پوچھا۔

"ڈیفنی ۔"

"نہیں ۔ یہ دیوی ایتھینا ہے۔"

"تم لندن وندن چھوڑو اور آج ہی سے بُت تراشی شروع کر دو۔ یونان کا موسم بہار بڑا انسپائرنگ ہوتا ہے۔"

"تمہارے ہاں ہر چیز میں حُسن ہے ۔۔۔ پانی، مٹی، پتھر، انسان سب حسین ہیں۔ تبھی یونانیوں نے شعر کہے، نغمے گائے اور بُت تراشے ۔۔۔"

"وہ قدیم یونانی تھے ۔ اب ہم نکمے ہیں قلاش ہیں۔"

"لیکن تم بہت سے ملکوں سے اچھے ہو۔ جو مفلس بھی ہیں اور حُسن سے بھی محروم ہیں۔۔۔"

ڈیفنی ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

"تم اسے گھر چھوڑ آنا ۔"

"میں راستہ بھول جاؤں گا۔"

"یہ بتا دے گی۔ یہ انگریزی جانتی ہے اور اس نے ہماری باتیں سمجھ لی ہیں۔۔۔"

محفل ختم ہوئی۔ ٹونی کار چھوڑ گیا۔ ڈیفنی کو میں ایکروپلس لے گیا۔ ستونوں سے چاندنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ یہ حسین کھنڈر ایک شکستہ رباب معلوم ہو رہا تھا۔

میں نے اسے اس جگہ کھڑا کر دیا جہاں کبھی ایتھینا کا سونے اور ہاتھی دانت کا بنا ہوا مجسمہ تھا۔

"مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟"

"فڈیاس نے اپنی ساری صناعی صرف کر کے ایتھینا کا بُت بنایا۔ صدیاں گذریں۔ یہ مجسمہ کھو یا گیا! اتنے دنوں کے بعد آج تلاش میں ایتھنز والوں کو بتانے جا رہا ہوں کہ تمھاری دیوی واپس لوٹ آئی ہے ۔۔"

وہ مسکرانے لگی ۔"تمھیں ہمارے ملک کے ماضی کی ساری باتیں معلوم ہیں۔"

"لیکن ایتھینا! یونان تمھارا ہی نہیں میرا بھی ہے ۔ مجھے بھی حسین چیزوں سے الفت ہے۔"

اگلا دن ہم دونوں نے کورنتھ میں گذارا ۔ سمندر میں نہا رہے تھے ۔ بہت سی نگاہیں ہم پر تھیں

"یہ سب تمھیں دیکھ رہے ہیں ۔" وہ بولی

"نہیں ۔۔ یونانیوں کو وہ نظارہ یاد آ رہا ہے جب سمندر کی لہروں سے ایک بہت بڑی سیپی کھُلی اور وینس شرماتی لجاتی باہر نکل آئی ۔۔"

"میں پہلے ہی مغرور ہوں ۔ تم مجھے اور بگاڑ دو گے ۔"

"زیوس کے بیٹے اپولو اور ڈلفینی کی کہانی مجھے یاد ہے ۔ دیویاں تو ہمیشہ مغرور ہوا کرتی ہیں ۔"

"مگر میں تو آرٹ کی ایک معمولی سی طالب علم ہوں ۔۔"

"آرٹ کے مجسموں کو آرٹ پڑھنا نہیں پڑھانا چاہیئے ۔۔"

لیکن اگلے دن میں ٹونی سے کہہ رہا تھا ۔۔ "دوست میرے پاس صرف چار دن اور ہیں اور ابھی سارا یونان دیکھنا ہے ۔۔"

"ڈلفینی سارا یونان ہے ۔۔" وہ بولا

"نہیں — میں کچھ دیر کے لئے بھول گیا تھا کہ میں سیاح ہوں"۔

ہم مراتھون گئے۔ وہ میدان دیکھا جہاں ایک زبردست جنگ ہوئی تھی۔ مشرق اور مغرب کا پہلا مقابلہ — اس شکست کے بعد مشرق ہمیشہ دبا دبا سا رہا۔ یونانیوں نے ایرانیوں کو شکست فاش دی۔ خوشخبری لے کر ایک سپاہی پورے بائیس میل بھاگا آیا۔ اہلِ ایتھنز کو یہ خبر سناتے ہی مر گیا۔ اس کی یادگار میں مراتھون دوڑ ہوتی ہے۔

ٹونی کہنے لگا "پتہ نہیں چار میل کا اضافہ کس سلسلے میں کیا گیا ہے۔ اب لوگ چھبیس میل دوڑتے ہیں۔ کوئی خوشخبری نہیں لاتے اور زندہ رہتے ہیں"۔

ٹونی یا تو بیحد ذہین تھا اور یا بالکل نیم انٹلکچوئل — لیکن اس کی باتیں بہت دلچسپ تھیں۔

"سکندر تمہارے ملک میں گیا تھا۔ کچھ عرصہ یونانی بھی وہاں رہے ہیں"۔ ٹونی بولا۔

"ہاں — اب بھی ہمارے ہاں سکندر خاں، سکندر علی اور سکندر بخت ہوتے ہیں۔ یونانی دواخانے اس ملک میں نہ ہوں لیکن ہمارے ہر قصبے میں موجود ہیں۔ حکیم جالینوس کو ہم نہیں جانتے لیکن نمک جالینوس اور جوارش جالینوس ہر روز کے استعمال کی چیزیں ہیں۔ ہر شہر میں اوڈین تھیٹر ہوتا ہے جہاں ہر قسم کی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے اکثر یہ کہتے ہیں کہ وہم کی دوا تو لقمان کے پاس بھی نہیں تھی"۔

ٹونی یہ سن کر بہت خوش ہوا۔

"لیکن سکندر ہمارا ہم وطن نہ تھا۔ وہ مقدونیہ کا باشندہ تھا لیکن وہ اپنے آپ کو انسان نہیں سمجھتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ کسی قسم کا دیوتا ہے۔ مصری دیوتا بننے کے لئے اس نے

مصر کا طویل سفر طے کیا۔ مصریوں نے ڈر کر فوراً اسے مان لیا۔ لوگ بڑے آدمیوں کی ہر بات بات کا یقین کر لیتے ہیں۔ جنگ میں پہلی مرتبہ زخم لگا تو اسے تعجب ہُوا کہ معمولی آدمیوں کی طرح خون کیوں بہہ رہا ہے۔"

"مگر وہ جینئیس تھا" میں نے سکندرِ اعظم کی طرفداری کرتے ہوئے کہا۔

"یہ جینئیس بھی خوب ہوتے ہیں۔ ہمارے دیوجانس کلبی کو فطرت کے ہر اپنے تلے قانون سے نفرت تھی۔ اس نے بغاوت کی، یہ کیا ضروری ہے کہ زندہ رہنے کے لئے انسان سانس لے اس نے سانس لینے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دیوجانس اللہ کو پیارا ہُوا۔ آخری دنوں میں دیوجانس نے ٹب میں رہنا شروع کر دیا تھا۔ جب سکندر اس سے ملنے گیا تو پوچھا "میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟" دیوجانس نے جمائی لی اور کہا۔ "ذرا دھوپ چھوڑ کر کھڑے ہو جائیے" ایک جینئیس کی بات دوسرا جینئیس ہی سمجھ سکتا ہے۔ سکندر اس جواب سے اس قدر خوش ہُوا کہ بولا۔ اگر میں سکندر نہ ہوتا تو دیوجانس بننا پسند کرتا۔

غسل کرتے کرتے ارشمیدس کو ایک مسئلے کا حل سوجھ گیا اسی حالت میں یوریکا یوریکا چلاتا باہر بازار میں نکل گیا۔ بھلا آدمی کم از کم تولیہ ہی باندھ جاتا۔ پھر لائی کرگس کو سپارٹا والوں نے اصلاحات رائج کرنے کے لئے بلایا تو اس نے آتے ہی یہ قانون نافذ کیا کہ کوئی شخص اپنے گھر میں کھانا نہ کھائے۔ اس طرح فضول خرچی ہوتی ہے۔ چنانچہ سپارٹا بھر میں لوگ سڑکوں پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ کچھ دیر تو ایسا ہُوا پھر سب ایک دوسرے کو بار بار دیکھ کر تنگ آنے لگے۔ فسادات شروع ہو گئے اور لائی کرگس کو بھاگنا پڑا۔ اور صرف پیری کلیز کے دنوں میں

یونانی اپنے جینیئس حضرات سے کچھ عرصہ خوش رہے۔ اس کے مرتے ہی انھوں نے غریب انکساغورا کو سمندر پار بھجوا دیا، فڈیاس کو قید کر کے ہلاک کر دیا۔ سقراط کو زہر دے دیا۔ افلاطون بچ گئے۔ کچھ اور لوگوں نے کچھ اور لوگوں کو مارا۔ چنانچہ یونانیوں نے دو تین صدیوں کے اندر اندر اپنے سارے جینیئس ٹھکانے لگا دیئے۔"

"مگر تمھارا عہدِ زرّیں خوب تھا۔ بقراط اب تک بابائے طب تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی طبی قسم اب بھی ڈاکٹر اٹھاتے ہیں۔ سقراط کے شاگرد افلاطون نے استاد کی شہرت کو چار چاند لگائے۔ افلاطون کا شاگرد ارسطو بھی کم نہ تھا۔ ارسطو کا شاگرد سکندرِ اعظم۔"

"کیا تو وہ دن تھے کہ کسی اچھے استاد کے سامنے بیٹھ کر سبق یاد کر لیا اور بیڑا پار ہے۔ اب بیچارے استاد ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں لیکن طالب علم کورے کے کورے رہتے ہیں۔"

"ہر جگہ یہی شکایت ہے۔"

اولمپیا گئے۔ پرانا سٹیڈیم دیکھا جہاں سب سے پہلے اولمپک کھیل ہوئے تھے۔ پھر مائیسینیا سپارٹا۔ پطرس۔ وہی نیلے جزیرے، خود رو پھول، متناسب ستون اور حسین مجسمے۔

"نصف سے زیادہ یونان تو برٹش میوزیم میں بند ہے۔ لارڈ ایلگن بہت کچھ لے گئے تھے اب تو جگہ جگہ یہ لکھا ہے۔ یہاں فلاں بُت نصب تھا۔ یہاں فلاں چیز ہوا کرتی تھی۔ اس جگہ دیوی ہائیجیا کا بت تھا جس کے نام پر ہائیجین ہے — بقیہ یونان تم لندن پہنچ کر دیکھنا۔"

رات کو رقص پر ٹوٹی کی منگیتر اور ڈیفنی سے ملاقات ہوئی۔ مجھے کچھ سوچتا دیکھ کر ٹوٹی نے قہقہہ لگایا "تم پر سفوکلیز کا اثر ہو گیا ہے۔ اس نے ہمیشہ دنیا کو تج دینے اور بھج نام ہری کا رے گانے کی تلقین کی۔"

قیام ختم ہوا۔ میں سمندری راستے سے استنبول جا رہا تھا۔ ٹونی بندرگاہ پر چھوڑنے آیا۔
"تم کچھ ڈھونڈ رہے ہو۔ اگر برساتی کی تلاش ہے تو وہ تمہارے کیبن میں رکھی ہے ––– یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہاں ہر روز دھوپ نکلتی تھی لیکن برساتی ہر وقت تمہارے ساتھ رہتی تھی –––"
"اس سے کچھ دوستی سی ہو گئی –"
"جب برساتیاں رفیق بننے لگیں تو ایک خطرناک ذہنی دور شروع ہوتا ہے۔ اچھا اب اگلی مرتبہ آؤ تو ارسٹو فینز کی طربیہ تحریریں پڑھ کر آنا –"

ایجو نین سمندر میں جزیرے نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ جگہ جگہ یونانی مندروں کے کھنڈر دکھائی دیتے ہیں۔ یہیں کہیں حضرات ہیلن کو لے اڑے تھے۔

سمندر کا رنگ بدلتا جا رہا ہے۔ سیاہی مائل ہو گیا ہے۔ جہاز اطالوی کمپنی کا ہے اس لیے لذیذ غذا ملتی ہے، دن بھر موسیقی کا پروگرام ہوتا ہے اور رات کو محفلِ رقص و سرود گرم ہوتی ہے جس میں جرمن حصہ نہیں لیتے۔ جرمن ہمیشہ الگ تھلگ رہتے ہیں۔ نطشے کا فوق الانسان انھیں اب تک نہیں بھولا۔

کچھ امریکن لڑکیاں بھی ہیں جو زینتِ محفل بنتی ہیں۔ ایک سنہرے بالوں، چنچل آنکھوں والی لمبی لڑکی سب کی نگاہوں کا مرکز ہے۔ اس کا نام مارگرٹ ہے لیکن اس کی سہیلیاں اسے سینڈی SANDY کہتی ہیں۔ جہاز کا کپتان CAPITANO پچاس برس کا ہے۔ پستہ قد ہے، گنجا ہے، لیکن صبح سے سینڈی کے گرد طواف کر رہا ہے۔ جہاز کوئی اور صاحب چلا رہے ہیں۔

ڈیک ٹینس میں کیپی تانو اور ایک لڑکی کو میں اور سینڈی بڑی آسانی سے ہرا دیتے ہیں کیونکہ وہ ٹکٹکی باندھے اس شوخ و شنگ حسینہ کو دیکھ رہا ہے۔

شام کو وہ کہتی ہے "کیپی تانو ہم سے جہاز چلوائے گا۔ آج رات ہم چار لڑکیوں کو اوپر بلایا ہے۔"

"مبارک ہو"

"مگر یہ آدمی مشتبہ سا ہے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ تم ہمارے ساتھ چلو۔"

"اور بیچارہ کیپی تانو؟"

"نہیں، تم ہمارے ساتھ ضرور چلو گے۔"

رات کے دس بجے چار لڑکیاں اور میں ۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے۔ کیپی تانو کا چہرہ دمک رہا تھا مجھے دیکھ کر اوس سی پڑ گئی۔ کچھ سوچ کر اس نے ملازم کو بتایا "شراب کی بوتلیں اٹھا لو اور چائے لاؤ۔" دو لڑکیوں کو نقشے پر بٹھا دیا گیا۔ تیسری کو ان کی مدد کرنے کے لئے۔ مجھے وہ مشین دی گئی جس سے جہاز کا رُخ بدلتے ہیں "اوپر چلو دُوربین سے ستارے دیکھیں گے"۔ اس نے سینڈی سے کہا۔ چلتے ہوئے وہ ایک لڑکی کو ساتھ لے گئی چنانچہ فوراً یہ تینوں واپس آ گئے۔ لڑکیوں کی ڈیوٹی بدل گئی اور مختلف جگہوں پر انھیں بٹھا دیا گیا۔

"چلو اوپر دیکھتے ہیں۔"

سینڈی پھر ایک لڑکی کو ہمراہ لے گئی۔

آخر تینوں لڑکیوں کو اوپر بھیج دیا گیا سینڈی اور وہ کیبن میں تھے۔ میں جہاز کا رُخ دیکھ رہا تھا۔ یکایک سینڈی نے مجھے آواز دی اور میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اندر چلا گیا۔ کیپی تانو ہڑبڑا کر باہر نکلا اور وہ مشین تھام لی۔ آدھ گھنٹے تک یہ آنکھ مچولی ہوئی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

کیپی تانو لگاتار مجھے گھورتا رہا تھا، وہ بیحد خفا تھا۔

نیچے آئے تو تینوں لڑکیاں شب بخیر کہہ کر سونے چلی گئیں۔ سینڈی اور میں اکیلے رہ گئے۔ اس نے بتایا کہ وہ کالج میں پڑھتی ہے سہیلیوں کے ساتھ یورپ کی سیر کو آئی ہے۔ اس کے والد کروڑپتی ہیں۔ ان کے ہاں خدا کا دیا سب کچھ ہے۔

"لیکن میں بیحد اداس ہوں۔ اپنی روح کی تنہائی سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔"

"ہم سب اداس ہیں — اور تنہا ہیں —"

"مگر کیوں؟"

"اس کا جواب تو بڑے بڑے مفکر نہ دے سکے —"

"لیکن تم تو خوش رہتے ہو۔"

"میں خوش ہوں — اس لئے کہ میں غمگین ہوں۔"

"یہ کیسے؟"

"میں مفکر ہوتا تو شاید بتا سکتا۔"

"ہائے کتنی دلچسپ گفتگو ہو رہی ہے۔"

"ہائے یہ لہریں کتنی پیاری ہیں۔ آؤ انھیں گنیں — ایک - دو - تین - چار —"

صبح کیپٹی تانو نہایت بیچین تھا جیسے تپتی ہوئی اینٹوں پر بلی۔ ملاحوں کو ڈانٹتا۔ ملازمین کو برا بھلا کہتا۔ سر پہ جو آٹھ دس بال تھے وہ پریشان تھے۔ انھیں وہ بار بار نوچنے کی کوشش کرتا اس نے مجھ سے آنکھیں نہیں ملائیں۔

جہاز پر اطالوی جھنڈے کے ساتھ ترکی کا سرخ جھنڈا لہرا رہا تھا — ہلال اور تارہ — میں سینڈی کو بتا رہا تھا کہ چاند تارے کا نشان پہلے بازنطینیوں کا تھا۔ ایک جنگ جیت کر عربوں نے

پہنچ گیا۔ اب یہ ہمارا ہے۔"

"سب کچھ جیت کر لینا چاہیئے۔" اس نے جواب دیا۔

ہم درۂ دانیال سے گذر رہے تھے۔ سمندر یہاں دریا معلوم ہوتا ہے۔ ایک طرف یورپ ہے دوسری طرف ایشیا۔ یہ پرانا ہیلیز پونٹ ہے۔ یہاں قدیم ٹرائے آباد تھا۔ سکندر اسے عبور کر کے ایشیا گیا۔ ایرانی بادشاہ زرکسیز نے یورپ پر حملہ کرتے وقت یہاں کشتیوں کا پل بنوایا یہ پل جسے ٹھیکیداروں نے بنایا تھا تیز ہوا سے تباہ ہو گیا۔ بادشاہ نے فوج کے سامنے ان حضرات کا انتقال کروایا اور والنٹیر مانگے۔ اس مرتبہ ایسا مضبوط پل بنا جسے غالباً بادشاہ نے یورپ سے بھاگتے وقت بھی استعمال کیا۔

یہاں سمندر کو بائرن نے بھی تیر کر عبور کیا تھا لیکن محض تفریحاً۔ بائرن ایسی حرکتیں اکثر کیا کرتا تھا۔ آخر دور مسجدوں کے گنبد اور مینار دکھائی دیئے۔ یہ استنبول تھا۔

سینٹ صوفیہ — سینٹ صوفیہ —

سب دوربینوں سے ڈیڑھ ہزار سال پرانے گرجے کو دیکھ رہے تھے جو اب مسجد ہے۔ جہاز آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ یکایک ساتھ کھڑی ہوئی دو لڑکیوں نے بھوں بھوں کر کے رونا شروع کر دیا۔ سامنے ساحل پر کچھ خواتین بھی اسی سٹائل میں رو رہی تھیں۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید ان کی غیر حاضری میں کوئی عزیز چل بسا ہو گا۔

"مجھے بہت افسوس ہے۔ کیا عمر تھی مرحوم کی؟"

انھوں نے بتایا کہ وہ فرطِ انبساط سے رو رہی ہیں۔ ان کے ہاں رواج ہے۔ اگر فرائڈ آج زندہ ہوتا تو اس کی وجہ بتاتا۔ یہ سب شاید اس لئے رو رہی ہیں کہ اب پھر اکٹھے رہنا پڑے گا غالباً

جدا ہوتے وقت یہ ہنستے ہوں گے۔ یہ لڑکیاں ہنگری کی تھیں۔ اچھا ہوا میں ہنگری ہی نہیں گیا۔

"اگر یہاں ملاقات نہ ہو سکی تو پھر میں لندن میں ملوں گی۔" بیبنڈی نے چلتے وقت کہا۔

ترک خوبصورت ہیں۔ تندرست و توانا۔ ہنس مکھ۔ گورے چٹے۔ مغربی لباس۔ السلام علیکم کی جگہ مرحبا کہتے ہیں اور وعلیکم السلام کی جگہ بھی مرحبا۔ کرنسی دیکھ کر گھر یاد آگیا۔ روپے پر چاند تارا بنا ہوا ہے اور پیسوں میں سوراخ ہے۔ مگر ماشاء اللہ، سبحان اللہ، زراعت، تجارت، تقسیم، مرکز، جمہوریت کے علاوہ اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

خطوط پر ٹکٹ لگانے ڈاکخانے گیا۔ کلرک نے ملک کا نام پڑھ کر وہیں سے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا اور مجھے پوسٹ ماسٹر کے کمرے میں لے گیا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ انگریزی میں باتیں ہونے لگیں "آپ کے ملک سے ہمیں بیحد دلچسپی ہے مگر وہاں سے بہت کم لوگ یہاں آتے ہیں"

"آپ بھی تو ہماری طرف نہیں آتے۔" میں نے شکایت کی۔

ان کے گھر شام کو ایک نہایت نفیس بوڑھے سے ملاقات ہوئی۔ قاسم بے۔ طویل قامت پانچ زبانوں کا ماہر۔ کمال اتاترک کے دوش بدوش لڑ چکا تھا۔

"برخوردار میں تمہیں استنبول دکھاؤں گا۔"

ہم دونوں غلاتا پل پر کھڑے تھے۔ گولڈن ہارن کا دلکش نظارہ۔ دور تک پانی میں روشنیاں چمک رہی تھیں۔ جیسے لاتعداد جگنو چمک رہے ہوں۔ مسجدوں کے گنبد اور مینار سبز روشنی سے بقعۂ نور بنے ہوئے تھے۔ اسے دنیا کے بہترین نظاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

یہ بازنطینیوں کا قسطنطنیہ ہے جسے روم کی طرح سات پہاڑیوں پر بسایا گیا —— عثمانیوں کا استنبول۔ آج سے پورے پانچ سو سال پہلے سلطان محمد فاتح نے اس پر حملہ کیا۔

بازنطینیوں نے سمندر میں لوہے کی زنجیریں ڈال دیں۔ سلطان نے پہاڑی کے ایک حصّے کو ہموار کرایا، تختے بچھوائے، انھیں چکنا کیا اور راتوں رات اپنے بہتّر جہاز خشکی سے گذار کر دوسری طرف پانی میں اتار دیئے۔ تب سے اب تک یہ شہر ترکوں کے قبضے میں ہے۔ سلطان کا یہ کارنامہ ہر عسکری تاریخ میں لکھا جاتا ہے۔

صبح صبح قاسم بے مجھے ساتھ لے گیا۔

یہ سراغلیو کے قدیم محلات ہیں۔ یہ مقام اس وسیع سلطنت کا مرکز تھا جو سلیمان کے وقت میں وی آنا تک پہنچ چکی تھی۔ بحیرۂ روم کے تقریباً سب ملک ترکوں کے قبضے میں تھے اور یہ وسیع سمندر ترکوں کی جھیل بنا ہوا تھا۔ یہ حرم ہے جس میں جگہ جگہ ڈیٹنگ روم سے بنے ہوئے ہیں۔ یہ میوزیم کی سب سے قیمتی چیز ہے — سکندر کا تابوت۔ جس میں سکندر نہیں ہے۔ سنگِ مرمر کا بنا ہوا آرٹ کا نادر نمونہ جسے برٹش میوزیم والے بہت بڑی قیمت پر خریدنا چاہتے ہیں۔ پرانے زمانے میں رواج تھا کہ فن کار مشہور ہستیوں کے تابوت ان کی زندگی میں بنا دیتے تھے تاکہ بعد میں دقّت نہ ہو۔ بڑے آدمی خوش ہو کر سند دیا کرتے کہ "میں اس عزّت افزائی کے لئے بیحد مشکور ہوں۔ اس تابوت کی ساخت، کوالٹی اور سائز سے میں مطمئن ہوں۔ امید ہے کہ اس کے استعمال کا موقعہ مجھے عنقریب ملے گا" یہ وہ منبر ہے جس سے حضرت صالح وعظ کیا کرتے تھے۔ یہ اپولو اور زیوس کے بُت ہیں — یہ کسی ممی کا صندوق ہے۔ اس پر لکھی ہوئی عبارت کا مطلب ہے "بھائیو میرے پاس کچھ نہیں ہے مجھے تنگ مت کرو" مصر میں ممی کے ساتھ زادِ راہ کے طور پر دولت بھی دفن کی جاتی تھی جسے لوٹنے کے لئے چور بڑی بے صبری سے انتظار کیا کرتے۔ اس شخص کو بھی یہی ڈر ہوگا۔ چنانچہ اس نے اپنی کم مائیگی کا اعتراف کر لیا لیکن چور غالباً ان پڑھ تھے

— صرف خالی صندوق مل سکا۔ ممی نہیں ملی۔ نہ جانے کیوں مصری قبر کے اوپر اتنے بڑے بڑے اہرام کھڑے کر دیتے تھے کہ جنھیں بیس میل سے دیکھ کر کسی ریٹائرڈ چور کا جی للچا اُٹھے۔

یہ اُس رحمدل اور خدا ترس خاتون فلارنس نائٹنگیل کا ہسپتال ہے۔ یہ ہپوڈروم کا چوک ہے جہاں سے باز نطینی شہنشاہ کھیل کود ملاحظہ کیا کرتا — سمندر کا یہ حصّہ باسفورس کہلاتا ہے۔ ہم یورپ میں کھڑے ہیں ایشیا دوسرے کنارے پر ہے۔ ایشیا اور یورپ میں صرف چند سو گز کا فاصلہ ہے۔ لیکن مشرق اور مغرب کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ ہے۔

ہم دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں۔ لسّی مفت ملتی ہے۔ کھانے میں کئی قسم کے کباب ہیں کوفتے۔ نان۔ دہی اور سوّیاں۔

اتنے دنوں کے بعد سوّیاں چکھ کر میں بہت خوش ہوتا ہوں اور قاسم بے کو بتاتا ہوں کہ سوّیاں ہمارے ہاں بھی ہوتی ہیں۔

"لیکن ہمارے ہاں صرف خاص موقعوں پر استعمال ہوتی ہیں جیسے اب رمضان کا مہینہ ہے"

ہم نہایت خوشنما مسجدیں دیکھتے ہیں۔ سنگِ سُرخ، سنگ خارا سنگِ مرمر کی بنی ہوئی۔ باہر پھول کھلے ہوئے ہیں اندر بجلی کی روشنی ہے۔ بڑی رونق ہے۔ یہ مسجدیں سانس لیتی ہوئی لگتی ہیں۔ یہاں عبادت گاہیں زندہ ہیں۔

"برخوردار ہمارے ملک میں سب سے اہم چیز کام ہے۔ ہمیں زیادہ فرصت نہیں ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ ہم نماز بہت جلد پڑھتے ہیں۔ بہت سے لوگ تو صرف عید کی نماز پڑھتے ہیں۔ لیکن جب تک باشندے ان فرائض سے کوتاہی نہیں کرتے جو ان پر ملک اور سوسائٹی نے عائد کئے ہیں، وہ سب سماج کے مفید ہیں اور ان کے مذہبی عقیدوں اور ذاتی زندگی کے

متعلق کوئی باز پُرس نہیں کرتا۔ لیکن اگر وہ بیکار رہنے لگیں یا قانون کی خلاف ورزی کرنے لگیں تو خواہ دن رات عبادت کیا کریں سوسائٹی انھیں معاف نہیں کرتی، ملک کے لیے اُن کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ کوئی قابلِ اعتراض حرکت نہیں کرتا۔ روزی کمانے کے لئے محنت کرتا ہوں۔ لیکن میرے حقوق بھی تو ہیں۔"

ہم ٹرکش کافی پیتے ہیں چھوٹی سی پیالی میں میٹھی اور گاڑھی چیز۔۔۔ دو گھونٹ پی کر چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔

"یہاں تو کی ٹوپی نظر نہیں آتی۔"

"سکاٹ لینڈ میں سکاچ وہسکی کہاں ملتی ہے؟" قاسم بے پوچھتا ہے۔

گرینڈ بازار بازنطینوں نے سطحِ زمین کے نیچے بنایا تھا۔ یہاں ہر وقت بھیڑ لگی رہتی ہے جوہری کی دکان پر قاسم بے نے ہیٹ اتار کر دو عورتوں کو سلام کیا۔ وہ مسکرائیں۔ ایک دوسرے کی خیریت پوچھی۔ میرا تعارف ہوا

معمر خاتون قاسم بے کے دوست کی بیوی تھیں۔ اُن کے ساتھ اُن کی لڑکی تھی۔ شکیلہ ۔۔۔ جو سچ مچ شکیلہ تھی۔ مسکراتی تو گالوں میں دو ننھے ننھے گڑھے پڑ جاتے۔ سہ پہر تک ہم ساتھ رہے۔ قاسم بے کو دفتر پہنچنا تھا چنانچہ میں ان دونوں کو چھوڑنے گیا۔ انھوں نے مجھے رات کے کھانے کے لئے ٹھہرا لیا۔

شکیلہ لگاتار سوال پوچھ رہی تھی "تمہارے ہاں لڑکیوں کی سماجی حیثیت کیا ہے؟ معاشی حالت کیسی ہے؟ کتنی لڑکیاں شادی کرتی ہیں اور کتنی ذرا ٹھہر کے شادی کرتی ہیں؟ شادی کس طرح ہوتی ہے؟"

"آپ یونیورسٹی میں پڑھتی ہونگی؟"

میرا اندازہ صحیح نکلا۔

"میں اس سلسلے میں آپ کو زیادہ نہیں بتا سکتا۔ لیکن محبت، شادی اور بچے ـــ ان کی سماجی، معاشی، ذہنی اور سیاسی حالت وہی ہے جو صدیوں سے چلی آئی ہے۔ لڑکے لڑکیاں پہلے شادی کو برا بھلا کہتے ہیں پھر شادی کر لیتے ہیں اور اپنے بچوں کو دنیا بھر کے بچوں سے حسین عقلمند اور انوکھا سمجھتے ہیں۔ یہ بچے بڑے ہو کر والدین کو بیوقوف تصور کرتے ہیں لیکن شادی کر لیتے ہیں۔ ان کے بچے بڑے ہو کر سب خبطی سمجھتے ہیں، اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔"

وہ ہنسی اور گالوں میں پھر ننھے ننھے گڑھے پڑ گئے۔

"ہاں، ایک بات میں بھول گیا ـــ جب لڑکے لڑکیوں کو آپس میں محبت ہوتی ہے تو انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ ایسی محبت نہ کسی نے آج تک کی ہے نہ کوئی آئندہ کر سکتا ہے۔ یہ لیلے مجنوں، رومیو جولیٹ، شیریں فرہاد محض اپنا وقت ضائع کرتے رہے ہیں لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ یہ دوہا پڑھنے لگتے ہیں ـــ

ڈھیاں جنوائی لے گئے اور بہوواں لے گئے پوت
کہہ منوہر جانگلی تم رہے اُوت کے اُوت

(اس کا ترجمہ سلیس انگریزی میں کر کے سنایا)

"آپ نے فلسفہ پڑھا ہوگا۔"

"نہیں۔ میں فلسفیوں کا مطالعہ کیا کرتا ہوں۔"

"میں خبردار رہوں گی، میں نے فلسفہ لے رکھا ہے۔"

## برساتی

اگلے دن میں اور شکیلہ باسفورس عبور کر کے حیدر پاشا پہنچے۔ استنبول اور اس کے مضافات باغوں سے پٹے پڑے ہیں۔ سبزہ، سرو کے درخت، پھول اور نفیس و نازک مینار۔

ہم بنچ پر بیٹھے تھے۔ میں کارڈوں پر دوستوں کے پتے لکھ رہا تھا۔

"تم نے ابھی آہ بھری تھی؟ خیریت ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ آہ نہ تھی۔ سانس لیا تھا۔ لمبے سانس لینا صحت کے لئے مفید ہے۔ ویسے آہ بھرے تقریباً آٹھ برس گذر چکے ہیں۔"

"تمھیں اپنے عزیز یاد آرہے ہوں گے؟"

"یہ میرا برِّاعظم ہے۔ میں صبح یورپ میں تھا۔ اب اپنے وطن میں ہوں۔"

اگن بوٹ کی سیٹی سن کر ہم دونوں بھاگے۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر مجھے اپنا ہیٹ یاد آیا جو حیدر پاشا میں رہ گیا تھا۔

"چلو ابھی جا کر لے آتے ہیں۔" وہ بولی

"برساتی کھوئی جاتی تو ضرور تلاش کرتے۔ لیکن ایک ہیٹ کے لئے یورپ سے ایشیا کا سفر کرنا زیادتی ہے۔ غالباً یہ ہیٹ میری برساتی کو پسند نہ تھا اس لئے خود تو چلی آئی اسے وہیں چھوڑ آئی۔"

بوندا باندی ہونے لگی میں نے اسے برساتی اڑھا دی۔ ہم ایک درخت کے نیچے کھڑے تھے۔

"تھک گئی ہوگی۔ بنچ پر بیٹھ جاؤ۔"

"اس کا روغن گیلا ہے۔" وہ ایک دم اٹھی۔ برساتی پر رنگ کا نشان پڑ گیا۔

گھر جاتے وقت برساتی لوٹانا اُسے یاد نہ رہا۔

ہم نے مرترہ کے جزیرے دیکھے۔ رومیلی حصار گئے۔ ایک جگہ چند لمحوں کے لئے سینڈی سے ملاقات ہوئی

"اس لڑکی کا اندازِ گفتگو مجھے پسند نہیں آیا۔ یہ تمھیں اس طرح کیوں دیکھ رہی تھی؟" شکیلہ کچھ خفا ہو گئی۔

"مغربی لڑکیاں اسی طرح دیکھا کرتی ہیں۔"

"بالکل نہیں ۔۔۔ ہم لوگ تو ۔۔۔"

"تم مشرقی ہو ۔ مغربی آداب، لباس اور طرزِ معاشرت کے باوجود تمھاری ایک ایک بات مشرقی ہے۔ یہ بتاؤ تمھیں گھر کب پہنچنا ہے؟"

"مغرب سے پہلے؟"

جاتے وقت وہ پھر برساتی لے گئی۔

ہم کشتی میں بحیرۂ اسود کی طرف جا رہے تھے۔

"تم نے آندرے موروا کی وہ کہانی پڑھی ہے ۔۔۔ برساتی؟"

"نہیں۔"

شکیلہ نے مجھے کتاب دی۔ "اس میں ہے لیکن جب میں گھر چلی جاؤں تب پڑھنا۔"

رات کو میں نے کہانی پڑھی۔ ایک آرٹسٹ اپنے دوست کو بتا رہا ہے کہ کس طرح ایک معمولی سی بھورے رنگ کی برساتی سے اس کی زندگی میں اتنی تبدیلیاں آ گئیں۔ مختلف موقعوں پر اس نے برساتی مختلف لوگوں کو دی لیکن ہر مرتبہ نتائج مختلف نکلے۔ ایک دوست خواہ مخواہ دشمن بن گیا۔ ایک روٹھے ہوئے سے صلح ہو گئی۔ ایک دو کو غلط فہمیاں ہو گئیں۔ اگرچہ ان واقعات سے برساتی کا

براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا لیکن ایک پُراسرار وابستگی ضرور تھی۔ ایک شام کو اس کی محبوبہ ملنے آئی جو بڑی سنگدل اور مغرور تھی اور شاید خدا حافظ کہنے آئی تھی۔ چلتے وقت بارش ہونے لگی، اس کا جی چاہا کہ اُسے برساتی پہنا دے۔ ایسی حقیر چیز دیتے ہوئے آرٹسٹ کو جھجک محسوس ہوئی کیونکہ وہ غریب تھا۔ آخر اس نے برساتی پہنا دی۔

"پھر کیا ہوا؟" سُننے والا پوچھتا ہے۔ اتنے میں ایک خوبصورت عورت کمرے میں داخل ہوتی ہے۔

"ان سے ملئے ــــ یہ میری بیوی ہیں" آرٹسٹ کہتا ہے۔

سننے والے نے دیکھا کہ عورت نے وہی بھورے رنگ کی برساتی پہن رکھی تھی۔

میں نے شکیلہ کو کتاب واپس دی تو وہ خاموش سی تھی۔ دن بھر اس نے بہت کم باتیں کیں۔ اگلے روز مجھے ازمیر جانا تھا۔

"تم پھر آؤ گے؟"

"ہاں کسی دن ضرور آؤں گا۔"

"لیکن جب تم آؤ گے تو مدبّر اور سنجیدہ بن چکے ہو گے۔ تب تم میں یہ بچپنا ہو گا نہ یہ شوخی۔ میری شادی ہو چکی ہو گی۔ تب دھوپ میں تمازت ہو گی نہ چاندنی میں ملاحت ــــ یہ آسمان اور سمندر بھی بوڑھے ہو چکے ہوں گے۔"

ازمیر میں دو دن رہا۔ اب واپسی تھی۔ جہاز کا کپتان مجھے بتا رہا تھا۔ یہ ہومر اور اپولو کا وطن ہے۔ ہرکولیز آس پاس ہی کہیں لڑا تھا۔ وہ جزیرہ دور نہیں جہاں بقراط طب پڑھاتا تھا یہاں ڈائینا کا مندر تھا دُنیا کے سات قدیم عجائبات میں سے ایک۔ یہاں سکندر آیا۔

ہینی بال، بروٹس، انطنی۔ سب باری باری آئے۔ اسی جگہ کمال اتاترک نے یونانیوں کو سمندر میں دھکیلا تھا۔ آئیونین سمندر۔ ایجئین سمندر۔ ایڈریاٹک۔ اٹلی۔ فرانس۔ رودبارِ انگلستان۔ لیکچر۔ کتابیں اور۔ امتحان۔

کار سے عجیب سی آواز آنے لگی۔ رفتار مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اور جیرلڈ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور موٹر روک لی۔ باہر نکلے تو تیز بارش ہو رہی تھی۔

"یہ برساتی اوڑھ لو" میں نے اُسے کہا

"اور تم جو بھیگ رہے ہو"

"نہیں، میں اسے اوڑھنا نہیں چاہتا"

موٹر کو ایک درخت کے نیچے لے گئے۔ انجن کھولا پہیئے دیکھے سب کچھ ٹھیک تھا۔ آخر کافی دیر کی جستجو کے بعد جیرلڈ نے موٹر کے نیچے سے ایک بڑی ساری ٹہنی کھینچی جو پھنسی ہوئی تھی۔ اب کار خوب تیز چل رہی تھی۔ ہم باتیں کرنے لگے۔ اس نے بتایا کہ اُسے سیر و سیاحت کا خبط ہے۔

"اگر میں کینیڈا میں رہنے لگوں تو وہ چند کھیت گذارے کے لئے کافی ہیں لیکن میرے پاؤں میں چکر ہے۔ ایک دو سال ملازمت کرتا ہوں پھر اپنا صندوق پکڑ کر نکل جاتا ہوں۔ بعض اوقات تو بیحد معمولی کام کرنے پڑتے ہیں۔ پچھلے سال میں بیس بیس گھنٹے فائلوں پر مغز مارا کرتا تھا۔ اس سے پہلے ایک چھوٹی سی دکان میں خزانچی تھا۔ سیر سپاٹا میرے خون میں ہے مجھے کوئی چار دیواری میں بند نہیں کر سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شوق مجھے

بھی ہے۔"

میں نے اسے اپنی سیروں کے قصے سنائے۔ بچپن کی سیریں۔ لوٹکین کی سیاحتیں جنگ کے دنوں کے سفر۔ ذرا سی دیر میں ہم دوست بن گئے۔

"جہاں بھی گیا ہر جگہ مہربان اور پرشفقت لوگ ملے۔ میں کسی کے لئے کچھ نہ کر سکا لیکن دوسروں سے مجھے ہمیشہ ہمدردی ملی۔ خلوص ملا۔ ہر جگہ میں نے وہ عظیم انسانی برادری دیکھی جس کی وسعت کا کوئی ٹھکانہ نہیں جو جغرافیائی حدود سے بالاتر ہے۔"

میں اس کے صندوق کو بار بار دیکھ رہا تھا۔

"یہ تمھیں اپنی برساتی سے نفرت کیوں ہو گئی؟"

"پرسوں تک یہ اچھی بھلی تھی۔ پھر کسی نے بغیر پوچھے اسے دھلوا دیا۔ اب یہ بالکل نئی اور اجنبی معلوم ہوتی ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔" وہ ہنسنے لگا۔ "میرے صندوق اکثر کھوئے جاتے ہیں۔ نیا خریدتے ہوئے مجھے بھی بڑا افسوس ہوتا ہے لیکن صندوقوں اور برساتیوں سے سیاحت کا کیا تعلق؟ یہ جذبہ یہاں ہوتا ہے۔" اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

بڑی تیز بارش ہو رہی تھی۔ دھند چھا گئی۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔

ایک موڑ پر بادل پھٹ گئے۔ سورج نکل آیا۔ تیز شعاعوں سے سب کچھ جگمگانے لگا فضا نتھری ہوئی تھی۔ ایسے خوشنما نظارے آئے کہ موٹر چلانا مشکل ہو گیا۔

کچھ اور آگے جا کر دھند سی چھانے لگی۔ بادل سمٹ آئے اندھیرا چھا گیا۔ اتنی تیزی سے بارش ہونے لگی کہ معلوم ہوتا تھا لندن تک ہوتی رہے گی۔

جیرلڈ بولا ”سیاح اکثر تنہا رہتے ہیں۔ بہت کم لوگ انھیں سمجھتے ہیں۔ لیکن سیاحوں کو ایسے ایسے تجربے ہوتے ہیں جو دوسروں کے ذہن تک میں نہیں آسکتے۔ ایسے لمحے آتے ہیں جب یہ ساری دُنیا ان کی ہوتی ہے — یہ پُراسرار رنگین دُنیا جو اتنی دلفریب ہے جو سدا جوان رہتی ہے۔ پھر سفر ختم ہو جاتا ہے اور ایسا وقفہ آتا ہے جس میں تاریکیاں عود کر آتی ہیں سب کچھ ساکن ہو جاتا ہے۔ ایک دلدوز تنہائی روح میں اترتی چلی جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تمام کو جھل ہو چکے ہیں اور تمام راستے بند ہیں — لیکن ایک سہانی صبح کو کرنیں پھوٹتی ہیں اور دل ایک جانی پہچانی مسرت سے آشنا ہوتا ہے — ایک نیا سفر شروع ہوتا ہے اور وہ جمود دیا تک نہیں رہتا۔ یہ جگمگاتی شعاعیں اور یہ تاریک گھٹا جہاں ایک دوسرے کا تعاقب کرتی ہیں وہاں ایک دوسرے کو نمایاں بھی کر دیتی ہیں۔“

دفعتہً بادل چھنٹ گئے۔ سورج نکلا۔ بل کھاتی ہوئی سڑک یوں چمکنے لگی کہ نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ آسمان پر ایک رنگین قوسِ قزح چھا گئی۔

وہ کہہ رہا تھا ”ہم جہاں گردوں کو کوئی چار دیواری میں بند نہیں کرسکتا۔ نا آشنا راہیں ہماری منتظر ہیں۔ موقعہ پاتے ہی ہم پھر چل کھڑے ہوں گے۔ میرے دوست تمھاری پیشانی پر نئے نئے نشان ہوں گے جن سے نئی یادیں وابستہ ہوں گی — دلآویز اور سہانی یادیں یہ ایک تاریک اور جامد وقفہ ہے لیکن یہ عارضی ہے۔“

---



محمد اقبال عباسی خوش نویس لاہور



ڈاکٹر کرنل شفیق الرحمان ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے، ۱۹۴۲ء میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے تعلیم مکمل کی - پھر آئی - ایم - ایس میں شامل ہوئے، تب سے فوج میں ڈاکٹر ہیں - مزید طبی تعلیم اڈنبرا یونیورسٹی اور لندن یونیورسٹی سے حاصل کی -

۴۲ء میں پہلی کتاب 'کرنیں' چھپی - اس کے بعد شگوفے، لہریں، مد و جزر، پرواز، حماقتیں، پچھتاوے اور مزید حماقتیں شائع ہوئیں - ولیم سرویان کے ایک ناول کا ترجمہ آردو میں کیا - ان کی دو کہانیاں آسٹریا میں چھپنے والے بین الاقوامی مجموعوں — 'دنیا کی بہترین مزاحیہ کہانیاں' اور 'دنیا کی بہترین پراسرار کہانیاں' — میں چھپ چکی ہیں -

---



**ناشر :** بشیر احمد چودھری، اگست ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے، ۱۹۳۵ء سے اشاعت و فروخت میں مشغول ہیں، چونکہ معیاری و مفید کتب چھاپنا شعار حیات ہے - اس لئے برصغیر میں اپنے پیشہ میں خاص مقام رکھتے ہیں -

۱۹۶۲ء میں ادارہ 'میری لائبریری' قائم کیا، اس وقت تک ایک سو کتابیں میری لائبریری کے سلسلہ میں چھپ چکی ہیں، اکثر کتابوں کے مجلد ایڈیشن بھی شائع ہوئے ہیں - ادب، افسانہ، تاریخ، نفسیات، شاعری، مذہب، شکار اور دوسرے علوم پر کتابوں کی اشاعت ملک کے بہترین لکھنے والوں کے تعاون اور مشورہ سے جاری ہے -